ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
کہانی اسپیشل
اپریل ۱۹۸۹ء
اس شمارے کے ساتھ خوبصورت کتاب
"کہنا بڑوں کا مانو" مفت حاصل کیجیے

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو نا!
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS.
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

جلد ۳ شمارہ ۱۰ اپریل ۱۹۸۹ء / شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

مُدیرِ اعلیٰ: ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول: تجمل حسین چشتی

مُشاورت: مُشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی: طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت: شاہ نواز فاروقی، سید خورشید عالم

خطّاطی: عارف سعید

ABC آڈٹ بیورو سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

قیمت ۱۲ روپے

۸ درہم
۸ ریال

زرِ سالانہ کیلئے خصوصی بچت کا صفحہ دیکھیں

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

حسنِ ترتیب

۶ تاریخ کے حوالے سے

۷ اداریہ

۹ ڈاکیہ ڈاک لایا

۱۲ اپریل کے اہم واقعات

۱۴ سب سے بڑا عالم
قرآنی کہانی

۲۱ نادیہ کی کہانی
طاہر مسعود

۲۸ بیکری والے کا پڑوسی
ش۔ف

۳۳ پہلا روزہ
غزالی

۴۱ بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں
حسینہ معین

۴۷ رات، چور اور جمشید
نثار احمد زبیری

۵۰ ننھے منوں کا مشاعرہ (نظم)
احمد حاطب صدیقی

۵۲ دھوپ کا راستہ نہ روکو
فراز سلیم

۵۴ اپریل فول
قرۃ العین حیدر

۵۹ بید کی کہانی
ڈاکٹر جمیل جالبی

۶۷ وعدہ
کلیم چغتائی

۷۱ مینڈک
خواجہ حسن نظامی

۷۳ مرغی اور بلی
شوکت تھانوی

۷۷ سفید چھڑی
سیدہ احسان

۸۲ چاند کا داغ
سید عبدالودود شاہ

۸۷ میرا کیا قصور عزیز نیسن
ترجمہ: کرنل مسعود اختر شیخ

۹۳ مستقبل
عامر یونس

۹۷ حق اسکواڈ
اخلاق احمد

۱۰۵ جادو کا پانی
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۰۷ میں لڑکی ہوں نظم
شاہنواز فاروقی

۱۰۸ نظر کی فریب کاریاں

۱۱۱ ننھا کانت
راجندر سنگھ بیدی

۱۱۵ بادشاہ کا نیا لباس
ثانی ایوب

۱۲۱ پھول نظم
عنایت علی خان

۱۲۲ ڈاکا
نعیم بلوچ

۱۲۹ کھٹے میٹھے
منتخب لطائف

۱۳۵ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے
سراج نظامی

۱۳۷
دادا ابّا کی شرارت
شاھد علی سحر

۱۳۹
موت سے جنگ
سیّد خورشید عالم

۱۴۵
دو عظیم مصوّر
حنا شہزاد

۱۴۷
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
محمّد جاوید خالد

۱۵۵
ہاکی کا فیصلہ
طاھر مسعود

۱۶۳
دوستی دشمنی
محمّد سلیم مغل

۱۶۸
صبح کی نشریات
ثمینہ اختر سیمی

۱۷۲
دنیا کی مختصر ترین کہانی
ایڈگر ایلن پو

۱۷۳
بے ہوش
ایاز محمود

۱۷۶
گفتگو
سلمٰی سلیم

۱۸۰
سائن بورڈ
حجاب امتیاز علی

۱۸۳
عکس قسط نمبر ۶
شاھنواز فاروقی

۱۹۱
چیونٹی اور جھینگر نظم
شکیل فاروقی

۱۹۲
بے درد مسیحا
ابو جہاد ثانی

۱۹۶
امتحان
صبا سلیم

۱۹۹
نئی زندگی
عمر نازل ھنگو رو

۲۰۴
زندگی کے میلے

۲۰۷
کھلاڑی کا دِل
اسما ہارون

۲۰۹
انجامِ کار
شاھد علی سحر

۲۱۱
دنیا کا طاقتور ترین آدمی
حارث شمیم

۲۱۴
چراغِ علم نظم
محمّد امان خان دلؔ

۲۱۵
تاجر کی آنکھ
شکیل فاروقی

۲۱۸
احمد ایسا کیوں بنا؟
سیف الاسلام

۲۲۱
انعام
پروین جہاں

۲۲۴
چند روز کی بادشاہت
مہوش شکیل

۲۲۷
جستجو شرط ہے
اسامہ بن سلیم

۲۳۱
رحمٰن بابا
علی مرتضےٰ

۲۳۶
نیم پلیٹ
عمران مشتاق

۲۳۹
وہ ایک صندوق
ترجمہ، ساجد سعید

۲۴۸
سالگرہ کے ساتھی
قلمی دوستی

۲۴۳
قربانی
فیروزہ عبدالستار

۲۵۰
امّی ابّو کا صفحہ
اُم رمیصاؔ

تاریخ کے دریچے سے

ایک اعرابی بصرہ میں آیا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ اس شہر کا سردار کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ خواجہ حسن بصریؒ۔ اس نے پوچھا وہ کیسے سردار بن گئے۔ لوگوں نے کہا مال و اسباب کی جو دولت لوگوں کے پاس تھی اُس سے انہوں نے بے نیازی اختیار کی اور علم کی جو دولت اُن کے پاس تھی اُس میں لوگ ان کے محتاج ہو گئے۔

ماہِ رواں کی پہلی بات

کہانی اسپیشل پیشِ خدمت ہے۔

پچاس کہانیوں پر مشتمل یہ شمارہ آپ کے لیے بے حد دلچسپ اور پُرلطف ثابت ہوگا۔ اور کیوں نہ ہو۔ کہانیاں کسے دلچسپ نہیں لگتیں! کہانی کا سحر عمر کی ہر منزل میں انسان کو اپنا گرویدہ بناتا رہا ہے۔ اس زمانے میں بھی جب نہ تعلیم عام ہوئی تھی اور نہ تمدّن کی روشنی پھیلی تھی۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگ رات کو الاؤ جلا کر بیٹھتے تھے اور پھر ان میں سے ایک داستان گو داستان چھیڑتا تھا قصے سناتا تھا اور باقی سب کے سب تجسس اور مسرت سے ان قصوں میں کھو جاتے تھے۔ انسان نے بہت ترقی کی اور بے شمار پُراسرار چیزوں کی حقیقت کھول کر رکھ دی لیکن قصے کہانی کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں بھی بچے رات کو سونے سے پہلے کہانیاں ضرور سُنتے ہیں۔ اور بڑے کتابوں اور رسالوں میں چھپے ہوئے افسانے پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ ٹیلی وژن اور وی سی آر پر جو ڈرامے اور فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ان میں بھی ہماری اصل دلچسپی کہانی سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو قصے کہانی کو بے کاری کا شغل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کہانی پڑھنے سے نہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہم کچھ سیکھ پاتے ہیں۔ اسی لیے بعض گھرانوں میں بچّوں کو کہانیاں پڑھنے پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کہانیاں ہماری معلومات میں اس طرح کا اضافہ نہیں کرتیں۔ جیساکہ ٹھوس علمی اور سائنسی مضامین کے مطالعے سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن کہانی ہمیں انسانوں کے کردار اور اعمال، ان کی شخصیت اور مزاج کے متعلق جتنا کچھ بتاتی ہے اور جو کچھ سکھاتی ہے۔ شاید کوئی اور علم یہ سب کچھ نہ ہمیں بتا سکتا ہے نہ سکھا سکتا ہے۔ کہانیوں کے کردار اگر وہ اچھے اور نیک ہوں تو نہایت غیر محسوس طریقے سے ہماری شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر وہ بُرے اور ظالم ہوں تو ہمارے دل میں بدی اور ظلم کے خلاف نفرت اور ردِّ عمل کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح کہانیاں خاموشی سے ہمارے مزاج کی تربیت اور ہمارے جذبات کی تہذیب کرتی رہتی ہیں۔ وہ ہمیں زندگی کی اعلیٰ اقدار سے وابستہ کردیتی ہیں۔ اور ہمیں ایک اچھا انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ کہانی پڑھنا وقت ضائع کرنا ہے کسی طرح بھی درست نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسی کہانیاں جو نہایت سنسنی خیز ہوں اور صرف پڑھنے والے کے جذبات کو بھڑکاتی ہوں اور ان میں ہلچل پیدا کرتی ہوں ان کا مطالعہ کسی طرح بھی مفید نہیں۔ کہانی اسپیشل میں ہم نے آپ کے لیے دیس بدیس کی ایسی خوبصورت، نازک اور رنگ برنگی کہانیوں کا انتخاب کیا ہے جو آپ کے لیے پُرلطف بھی ہوگا اور مفید بھی۔ کہانی اسپیشل پر آپ کی رائے کا ہمیں انتظار رہے گا۔

آپکا دوست
ظفر محمود شیخ

ایک بار کی زحمت

سال بھر کا آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

صرف ایک بار زحمت کیجیے اور ۱۲ ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیئے۔

آنکھ مچولی کے (۱۲) شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ (۱۳۲) روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف (۹۰) روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بیک وقت آپ دو فائدے اٹھا سکتے ہیں:

(۱) **۴۲** / روپے کی خصوصی بچت۔

(۲) گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ

رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو **۹۰** روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

(۱) خریدار کا نام (۲) مکمل پتہ (۳) رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے (۴) فون نمبر (اگر ہو) (۵) دستخط

"خصوصی بچت اسکیم" ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ڈی-۱۱۲- نورس روڈ سائٹ کراچی ۱۶

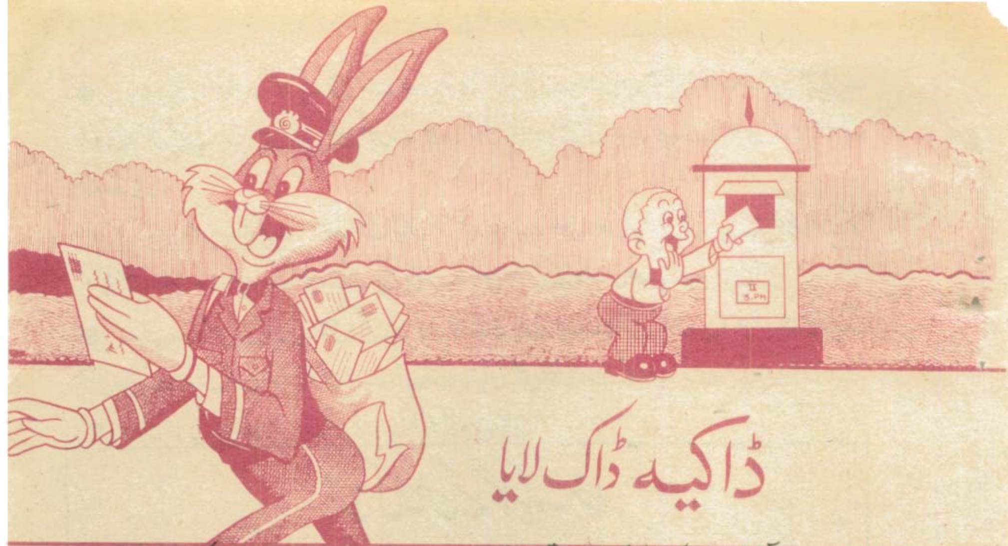

ڈاکیہ ڈاک لایا

عبدالواحد، سعود آباد، کراچی: آنکھ مچولی کے لیے چند تجاویز کے ساتھ حاضر ہوں۔ (الف) آپ رسالے میں ایک ناقابل اشاعت تحریر شائع کیجیے اور نئے لکھنے والوں کو اس کی اصلاح کی دعوت دیجیے۔

(ب) مصوّر سلسلہ شروع کیجیے۔ نوجوان مصوروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

(ج) میں آنکھ مچولی میں ایک ترجمہ شدہ ناول بھیجنا چاہتا ہوں جو پانچ چھ قسطوں پر مشتمل ہوگا۔ کیا بھیج دوں؟

● تجاویز بھیجنے کا شکریہ۔ ان پر ہم سنجیدگی سے غور کریں گے۔ آپ ترجمہ شدہ ناول کی نقل ہمیں بھیج دیجیے۔ اسے پڑھ کر ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پسند آیا تو ضرور چھپے گا۔ ہمیں تو اچھی تحریروں کی تلاش رہتی ہے۔

شوکت جاوید کیماڑی، کراچی: میں کراچی کی سیر کے عنوان سے ایک سفر نامہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ جس میں ہاکس بے، کلفٹن، منوڑا سفاری پارک وغیرہ کی سیر کرائی جائے گی۔ اگر آپ کہیں تو بھیج دوں ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کرکے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دوں۔

● بھئی آخری کام تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے ہمیں سفر نامہ تو بھیجیے، لیکن شرط یہ ہے کہ بہت دلچسپ مزیدار اور معلوماتی ہونا چاہیے۔

اطہر محمود، جھیورانوالی: "عکس" اور "حق اسکواڈ" قیمتی صفحات کا بیڑا غرق کر رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر انہیں ختم کریں یا انہیں دلچسپ بنائیں۔

● اوہو، آپ تو ان دونوں سلسلوں سے سخت خفا ہیں۔ بھئی ان کے پسند کرنے والے بھی بہت ہیں۔ پھر بھی آپ کا پیغام ان کے مصنفین تک پہنچا دیا جائے گا۔

زبیر مختار بلوچ، پسنی، مکران: آنکھ مچولی پڑھ کر مجھے شاعری کا شوق ہو گیا ہے۔ میرے شہر پسنی میں کوئی اچھا شاعر نہیں ہے جس سے میں نظموں کی اصلاح کراؤں۔ لہٰذا میری نظم "خوشامد" کی ـــــ ترمیم و اصلاح کر کے شائع کر دیجیے۔

● زبیر میاں! شاعری کے لیے بڑی محنت اور ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ ابھی آپ شاعری کا مطالعہ کیجیے۔ اس فن سے آگاہی حاصل کیجیے۔ جب اچھی نظمیں لکھنے لگیں گے پھر وہ شائع بھی ہو جائیں گی۔ ویسے آپ میں شاعری کے جراثیم تو پائے جاتے ہیں۔

انور کلیم بلوچ، شہداد کوٹ:۔ سلسلہ وار کہانیاں اکثر مشہور یا بڑے لکھنے والوں کی ہوتی ہیں۔ کیا نئے لکھنے والوں کو موقع نہیں دیا جا سکتا۔ آپ نے اکثر میری کہانیاں چھوٹے لکھنے والوں کے کالم میں چھاپا ہے۔ کیوں؟

● یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ بھئی! اگر نئے لکھنے والے ہمیں کوئی اچھا سا ناولٹ لکھ کر دیں تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ لیکن ظاہر ہے ناولٹ لکھنا آسان تو نہیں ہے۔ آپ کی کہانیاں 'ننھی نگارشات' کے معیار پر ہی اُترتی ہیں۔ اس لیے انہیں وہیں شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔

آج کی ہیلن کیلر کا ایک خط

میں اپنے انٹرویو کی اشاعت پر آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ میں نے اسے بے حد دلچسپ پایا اور مجھے امید ہے کہ قارئین بھی میری طرح اس سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمام پڑھنے والے نوجوان اور بوڑھے دونوں کو اس کے مطالعے سے بیش بہا معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

سمیرا شکیل، نیوجرسی، امریکہ

سید یوسف نصراللہ، کراچی:۔ ذرا جلدی سے بتا دیں کہ 'جوشیلے' کا مطلب کیا ہے؟ میرے دوست اکثر مجھے جوشیلا کہتے ہیں۔ ذرا یہ بھی بتا دیں (اگر ناراض نہ ہوں تو) کہ آپ آئندہ قہقہہ نمبر کب نکالیں گے؟

● کیا آپ بہت جذباتی ہیں؟ بات بات پر آپ کو جوش آ جاتا ہے؟ کیا آپ عقل کا استعمال ذرا احتیاط سے کرتے ہیں؟ اگر ان سب کا جواب ہاں میں ہے تو اسی لیے آپ کے دوست آپ کو جوشیلا کہتے ہیں۔ قہقہہ نمبر، ہم دوبارہ شائع کریں گے۔ کب؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا۔

مصطفےٰ حبیب رضوی، دالبن پور:۔ آپ کے رسالے میں قرآنی اور دینی کہانیاں کچھ کم ہوتی ہیں۔ برائے مہربانی ہماری دینی معلومات کے لیے دینی کہانیاں اور مضامین چھاپا کریں تاکہ ہم ان سے استفادہ کر سکیں۔

● ہم اس بات کا خود ہی خیال رکھتے ہیں، پتا نہیں آپ کو یہ تاثر کیسے ملا: قرآنی کہانی کے عنوان سے ایک کہانی ہر ماہ چھپتی ہے۔ پھر بھی آپ کی نشاندہی پر ہم اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں گے۔

محسن علی جعفری، فیصل آباد:۔ پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اسپورٹس کے متعلق کسی شخصیت کا انٹرویو ہر ماہ شائع کیا کریں مگر آپ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ حق اسکواڈ کا معیار دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔

● آپ کی یہ فرمائش بہت کڑی ہے۔ اسپورٹس کی شخصیات کے انٹرویو تو ہم چھاپتے رہتے ہیں۔ باکسر حسین شاہ کا انٹرویو پچھلے مہینوں آپ نے پڑھا ہوگا۔ البتہ ہر مہینے یہ ممکن نہیں جب اور جیسا موقع ملا آپ کی فرمائش پوری ہوتی رہے گی۔

وقار رضوی، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ،۔ پچھلے سال میں ہندوستان گیا تھا وہاں سے تصویریں بھی لایا ہوں۔ اگر میں اپنے سفر نامے کے ساتھ بھیجوں تو چھپنے کے بعد تصاویر واپس کر دیں گے۔

● لیجیے آپ نے ابھی سفر نامہ بھیجا نہیں اور تصویروں کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ اگر سفر نامہ اچھا ہوا تو تصویریں مع شکریے اور معاوضے کے واپس کی جائیں گی۔ اب آپ مطمئن ہیں؟

جمشید فاروقی۔ مظفر گڑھ ،۔ انکل آپ عمران خان، ڈاکٹر عبدالسلام اور مہاتما بدھ پر کوئی تحریر یا انٹرویو شائع کیوں نہیں کرتے۔ کیا یہ اچھے انسان نہیں؟

● بھئی آپ کو ہم داد دیتے ہیں۔ تینوں شخصیات آپ نے ایسی چُنی ہیں، جن کی دلچسپیوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ اب آپ انتظار فرمائیے!

شازیہ عزیز، شاہ فیصل کالونی، کراچی ،۔ مجھے یہ شکایت ہے کہ آپ نے رسالے میں جھاگ بنانے کا طریقہ بتایا تھا۔ اس طریقے پر جب میں نے عمل کیا تو جھاگ بنا ہی نہیں۔

● آپ کا خط پڑھنے کے بعد جب ہم نے اس طریقے پر جھاگ بنایا تو خوب ڈھیر سارا جھاگ بن گیا۔ شاید آپ نے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے میں کوئی غلطی کر دی ہے۔ دوبارہ کوشش کیجیے۔ شکایت دور ہو جائے گی۔

عائشہ خان عاشی، لیاقت پور ،۔ آپ نے فروری کے شمارے میں لکھا تھا کہ آپ کی تحریریں ۳۱ ؍فروری تک مل جانی چاہئیں۔ ہم نے تو کبھی بھی فروری کی اکتیس نہ پڑھی نہ سُنی۔

● جی ہاں اس غلطی کی جانب بہت سے ساتھیوں نے توجہ دلائی ہے۔ اصل میں ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آپ لوگ رسالہ غور سے پڑھتے ہیں یا نہیں۔ آپ لوگ جیتے ہم ہارے۔

شفاقت علی عاجز، لیاقت علی، اولکھ بھائیکے ضلع گجرانوالہ ،۔ فروری کے شمارے میں میرے خط کا جواب شائع نہیں ہوا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں چکرا کر وہیں بُک اسٹال پر گر گیا۔ اگر اس مرتبہ بھی میرا خط شائع نہیں ہوا اور مجھے کچھ ہو گیا تو مجرم آپ ہوں گے، جی ہاں سچ مچ...

● ہمیں افسوس ہے، بے حد... چکرا کر گرنے سے آپ کو کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ اپنی غذا کا خیال رکھا کریں۔ نصیبِ دشمناں۔ آپ کو کچھ کیوں ہونے لگا۔

معذرت

قارئین کی جانب سے 'خوفناک نمبر' کے لیے مبارک باد کے ساتھ ساتھ فرمائشی خطوط بھی آ رہے ہیں۔ 'خوفناک نمبر' کو ساتھیوں نے بے پناہ پسند کیا اور مارکیٹ میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس کی کاپیاں ہمارے اپنے پاس بھی نہیں ہیں۔ اس لیے ہم اُن ساتھیوں سے معذرت خواہ ہیں جو کسی وجہ سے 'خوفناک نمبر' نہیں خرید سکے۔ امید ہے ہماری مجبوری کو سمجھتے ہوئے وہ ہماری معذرت کو قبول کریں گے۔ —— ادارہ

ماہ اپریل کے اہم واقعات

عبدالمجید، عدیل بھٹی کنری

یکم اپریل ۱۵۷۸ء کو انسان میں خون کی گردش کا نظریہ دریافت کرنے والے ولیم ہاروے کی پیدائش ہوئی
۲ اپریل ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ کو ختم کرنے کا اعلان کیا گیا۔
۳ اپریل ۱۹۵۳ء کو ملک فیروز خان نون پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بنے۔
۴ اپریل ۱۸۶۵ء کو امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن کو قتل کیا گیا۔
۵ اپریل ۱۹۵۰ء کو برطانیہ کے وزیرِ اعظم چرچل نے چند ناگزیر وجوہات پر استعفیٰ دیا تھا۔
۶ اپریل ۱۹۰۹ء کو کمانڈر پیئر قطب شمالی پہنچا۔
۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو اٹلی نے البانیہ پر قبضہ کرلیا۔
۸ اپریل ۱۹۵۶ء کو تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ کو وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا۔
۹ اپریل ۱۹۵۷ء کو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین کا انتقال ہوا۔
۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر پاکستان کا آئین منظور کیا۔
۱۱ اپریل ۱۸۱۴ء کو نپولین دستبردار ہوا۔
۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو پاکستان کے نئے آئین پر دستخط کئے گئے۔
۱۳ اپریل ۱۹۶۰ء کو پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ میں پہلا تجارتی معاہدہ ہوا۔
۱۴ اپریل ۱۹۵۹ء کو ہنگری کو آزادی ملی۔
۱۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں زبردست طوفان آیا جس سے سینکڑوں افراد مر گئے۔
۱۶ اپریل ۱۸۶۷ء کو ولبرائٹ پیدا ہوئے۔
۱۷ اپریل ۱۷۹۰ء کو فلاڈلفیا کے پہلے شہری بنجمن فرینکلن کا انتقال ہوا۔
۱۸ اپریل کو آئین اسٹائن کا انتقال ہوا۔
۱۹ اپریل ۱۲۳۶ء کو التمش کی وفات ہوئی۔
۲۰ اپریل ۱۹۲۴ء کو ترکی میں آئین نافذ کیا گیا۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔

۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء کو سیمبرسک کے مقام پر لینن پیدا ہوا۔

۲۳ اپریل ۱۹۶۴ء کو ٹانگانیکا اور زنجبار کا باہمی اتحاد عمل آیا اور نیا نام تنزانیہ رکھا گیا۔

۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء کو میاں ارشد حسن پاکستان کے وزیر خارجہ بنے۔

۲۶ اپریل ۱۹۵۰ء کو بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو پاکستان آئے۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء کو روس کا طیارہ گر کر تباہ اور ۱۰۸ افراد ہلاک ہوئے۔ اور اسی تاریخ کو پان امریکن طیارہ بھی گرا ۱۰۷ افراد ہلاک ہوئے۔

۲۸ اپریل ۱۹۵۹ء کو کے، ایچ خورشید آزاد کشمیر کے صدر بنے تھے۔

۲۹ اپریل ۱۹۰۱ء میں آسٹریلیا کے پہلے گورنر جنرل نے دولت مشترکہ کی پہلی پارلیمان سے خطاب کیا۔

۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء میں محمود غزنوی کی وفات ہوئی۔

گریجویٹ

"اللہ کے واسطے میری مدد کیجئے بابوجی!"

"اتنے بڑے کٹے ہو کر تمھیں بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"شرم تو آتی ہے مگر کیا کریں بابوجی!" "کوئی چھابڑی لگا لو۔"

"چھابڑی لگائی تھی بابوجی لیکن ایک دن کارپوریشن والے میری چھابڑی اٹھا کر لے گئے۔"

"تو پھر بازاروں میں ریڑھی لگا کر کچھ بیچا کرو۔"

"بابوجی! آج کل ریڑھی کا لائسنس بھی تو نہیں دیا جاتا۔ چھابڑی سے پہلے ریڑھی لگائی تھی۔ دو مرتبہ چالان ہوا اور ساری رقم جرمانے میں چلی گئی۔" "تو کوئی دکان کھول لو۔"

"بابوجی اس سے پہلے میری ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ مالکِ دکان نے مجھے نکال کر ایک اور شخص کو چوگنے کرائے پر دے دی۔" "تو کوئی نوکری تلاش کر لو۔"

"بابوجی ایک سال ملازمت بھی کی تھی لیکن بجٹ میں خسارے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔"

"ان پڑھ بدھو ہو۔ تمھیں کوئی ملازم رکھے کیسے تعلیم حاصل کی ہوتی تو اس طرح ذلیل و خوار کیوں ہوتے۔" "بابوجی! میں گریجویٹ ہوں!" مرسلہ - ملک جاوید اقبال - راولپنڈی

سب سے بڑا عالم

بچّو !

ایک بستی میں بہت سے لوگ جمع تھے ۔ ایک شخص درمیان میں کھڑا تقریر کر رہا تھا اور سب غور سے سُن رہے تھے ۔ اچھی اچھی باتیں بتا رہا تھا ۔ مجمع میں ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا اس زمانے میں سب سے بڑا عالمِ دین کون ہے ۔ اس شخص نے جواب دیا مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم عطا کیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کو یہ جواب پسند نہ آیا اور اس شخص سے کہا کہ تمہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ " اللہ بہتر جانتا ہے " تمہیں نہیں معلوم کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں وہاں ایک شخص موجود ہے وہ ہمارا بندہ تم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہے ۔ بس بچّو اس شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ کے اس بندے کو دیکھا جائے جو اتنا بڑا عالم ہے چنانچہ خدا سے دُعا کی کہ اُس عالم سے ملنے

کا طریقہ بتا دے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اپنے ناشتہ دان میں مچھلی رکھ کر چلو جہاں یہ مچھلی غائب ہو جائے وہیں وہ شخص مل جائے گا۔

اس شخص نے ایک مچھلی لی۔ اُسے تلا اور ناشتہ دان میں اپنا کھانا باندھا اور اپنے ایک دوست یوشع کو ساتھ لے کر اس عالم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کئی گھنٹے چلنے کے بعد یہ لوگ سمندر کے کنارے پہنچے۔ دونوں بہت تھک چکے تھے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ ان صاحب کی آنکھ لگ گئی لیکن ان کا دوست یوشع جاگتا رہا۔ اُس نے اچانک دیکھا کہ ناشتہ دان سے مچھلی نکلی اور سمندر میں کود گئی۔ وہ جہاں تک سمندر میں گئی وہاں ایک لکیر بنتی گئی اور یہ لکیر، برف بن کر جم گئی۔ یہ واقعہ دیکھنے کے بعد یوشع کی آنکھ بھی لگ گئی۔ جب دونوں بیدار ہوئے تو دونوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ رات بھر چلتے چلتے بہت دُور نکل گئے۔ جب بہت تھک گئے تو اس شخص نے کہا کہ لاؤ مچھلی نکالو بھوک بہت لگی ہے کچھ کھا پی لیں۔ اچانک یوشع کو یاد آیا اور اُس نے کہا کہ ہم نے جس چٹان کے پاس آرام کیا تھا مچھلی وہیں ناشتہ دان سے نکل کر پانی میں کود گئی تھی۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا۔ اس شخص نے کہا، ہم جس مقام کی تلاش میں چلے ہیں وہ وہی مقام ہے۔ چلو جلدی سے واپس اس جگہ چلیں۔ چنانچہ واپس لوٹے اور طویل مسافت طے کر کے اُسی چٹان کے پاس پہنچے۔ وہاں گئے تو کیا دیکھا کہ ایک شخص بہت عمدہ لباس پہنے بیٹھا ہے۔ اس شخص نے اُسے سلام کیا اور کہا میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے تمہیں دیا ہے لیکن اُس بزرگ نے کہا کہ تم میرے ساتھ رہ کر ان معاملات پر صبر نہ کر سکو گے۔ خدا نے مجھے بہت سے رازوں کا علم عطا کیا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا لیکن اس شخص نے ضد کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کے ارشاد کی قطعی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ ان بزرگ نے شرط لگا دی کہ میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرنا اور نہ مجھ سے کوئی سوال کرنا۔ اس شخص نے ہر شرط مان لی۔ یہ تینوں روانہ ہو گئے۔

ان بزرگ نے سامنے کھڑی ہوئی کشتی کے مالک سے پوچھا کہ ہم اس پار جانا چاہتے ہیں کتنے پیسے لو گے۔ سب بزرگ کو جانتے تھے۔ سب نے پیسے لینے سے منع کر دیا اور کشتی میں بٹھا کر اُس پار لے گئے۔ ان بزرگ نے راستے میں کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا۔ اس شخص نے دیکھا تو بول اُٹھے، حضرت یہ ظلم ہے۔ مالک نے ہم پر احسان کیا پیسے نہیں لیے آپ نے اس کی کشتی توڑ دی وہ ڈوب جائے گی۔ بزرگ نے کہا میں نے تمہیں کہا تھا سوال مت کرنا۔ وہ شخص بالکل خاموش ہو گیا۔

تینوں کشتی سے اُترے اور بستی کی طرف چل دیے۔ کیا دیکھا کہ کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ ان میں ایک خوبصورت بچہ بھی ہے۔ بزرگ نے اس خوبصورت بچے کو قتل کر دیا اور چل دیے۔ اس شخص سے پھر صبر نہ ہو سکا کہا حضرت یہ بڑا ظلم ہے آپ نے معصوم بچے کو قتل کر دیا۔ بزرگ نے کہا تم پھر بول رہے ہو حالانکہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ قطعی مداخلت نہیں کرو گے۔ وہ شخص مجبوراً پھر خاموش ہو گیا اور معذرت کر لی۔ بزرگ نے کہا کہ اگر اب تم بولے تو تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ اُس نے وعدہ کر لیا اور پھر چل دیے اور ایک بستی میں پہنچے۔ وہاں کے لوگ خوشحال نظر آتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم مسافر ہیں کچھ کھانا کھلا دو' ایک رات مہمان بنا لو۔ لیکن سب نے منع کر دیا۔ یہ تینوں آگے چل دیے ان کا گزر ایک ایسے مکان کی طرف سے ہوا جس کی دیوار ٹیڑھی تھی۔ بزرگ نے ہاتھ کا اشارہ دے کر دیوار سیدھی کر دی۔ اب تو اُس سے بالکل نہ رہا گیا کہنے لگا اس بستی والوں نے نہ کھانا کھلایا۔ نہ ایک رات رکنے کی اجازت دی اور آپ نے بغیر اُجرت دیوار درست کر دی۔ ایسا کرنا تھا تو کچھ اُجرت لے لیتے تاکہ کھانا تو کھا لیا جاتا۔ بزرگ نے کہا اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ تم خاموش نہیں رہ سکتے اور سنو میں تمہیں بتا دوں میں نے جو بھی کیا وہ اللہ کے حکم پر کیا۔ جس کشتی پر ہم نے سواری کی وہ بہت غریب آدمی کی تھی اور دوسرے کنارے کا بادشاہ نئی کشتی دیکھ کر چھین لیا کرتا تھا۔ میں نے اُس کی کشتی میں عیب ڈال دیا تاکہ اس کی کشتی بچ جائے اور وہ غریب اپنی روزی کماتا رہے۔ جس بستی میں ہم نے بچہ قتل کیا تھا۔ دراصل میں نے اس کی پیشانی پر کافر لکھا ہُوا دیکھ لیا تھا۔ اور خدشہ تھا کہ یہ اپنے والدین کو سرکشی اور کفر کر کے اذیت پہنچائے گا۔ میں نے اُسے قتل کر کے اس کے والدین کا ایمان بچا لیا۔ اور جو دیوار میں نے سیدھی کی یہ یتیم بچوں کا مکان تھا۔ اس دیوار کی جڑ میں اُس کے والد نے خزانہ چھپا دیا تھا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو سب لوگ مل کر خزانہ لوٹ لیتے۔ میں نے دیوار سیدھی کر دی تاکہ خزانہ محفوظ رہے۔ جب یہ بچے بڑے ہو جائیں گے تو اپنا خزانہ نکال لیں گے۔

بچو! وہ بزرگ جنہوں نے یہ کام کیے تھے حضرت خضر تھے اور وہ اللہ کے نبی حضرت موسیٰؑ تھے۔ جنہوں نے حضرت خضر سے آکر ملاقات کی تھی یہ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے حضرت موسیٰؑ کو اتنا سفر کرانے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ بتا دے کہ ان سے بڑھ کر جاننے والے بھی دُنیا میں ہیں۔ اس لیے اُنہیں ایسے سوال کے جواب میں یُوں کہنا چاہیے تھا کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

فرق بتائیے

ان تصاویر میں فرق تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مشکل کام تو یہ ہے کہ آپ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فرق تلاش کریں۔ اگر آپ نے ایک منٹ میں سارے فرق ڈھونڈ نکالے تو پھر آپ یقین رکھیے کہ آپ کی ذہانت قابلِ رشک ہے۔

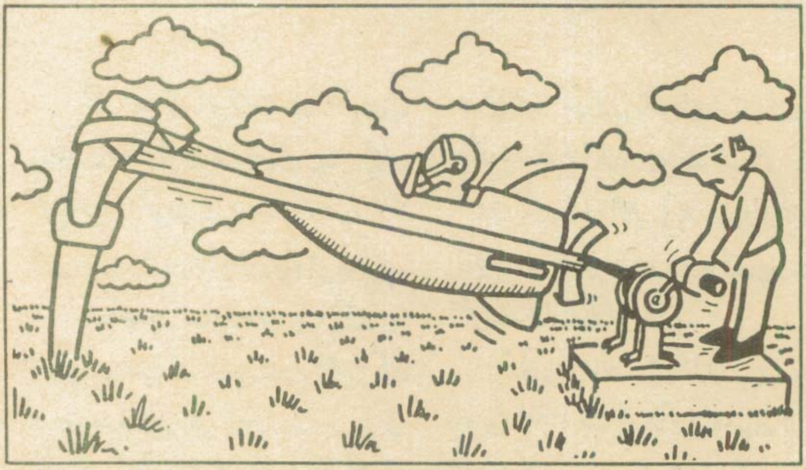

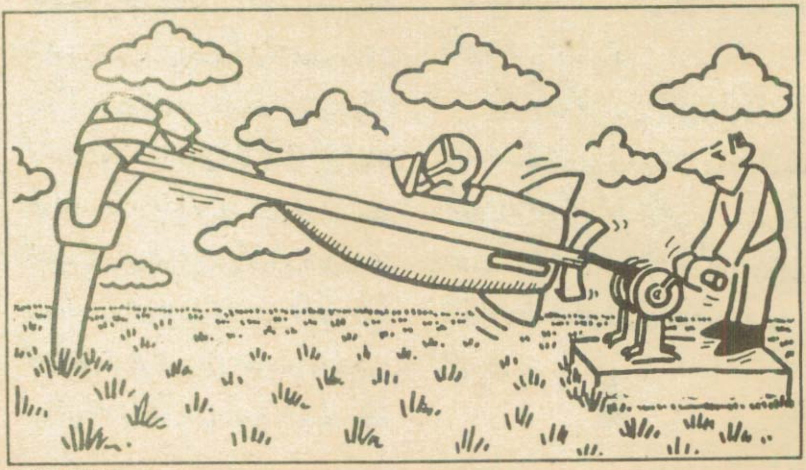

کہیں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو

یاسر بن عبدالغفار

ہم اب تک یہ سمجھتے تھے کہ شہروں میں رہنے کے مسائل صرف انسانوں کے لیے ہوتے ہیں مگر پتا یہ چلا کہ شہروں میں یہ مسائل تو انسانوں سے کہیں زیادہ پرندوں اور جانوروں کو بھی درپیش ہیں۔

اب آپ ان تصاویر کو غور سے دیکھیے اور سوچیے کہ یہ سب کے سب پرندے جنگل میں گھنے اور سایہ دار درختوں میں کس مزے سے رہتے ہوں گے۔ تلاشِ رزق میں شہروں کا رُخ کرنے والے یہ پرندے اس وقت کس تکلیف دِہ حالات سے گزر رہے ہیں... بٹیر نے کب یہ سوچا ہوگا کہ اُسے ایک دن کسی کی ٹوٹی پھوٹی ٹوپی میں امان ملے گی... ایک چڑیا کو کھمبے میں لگے ہوئے لیمپ میں بسیرا کرنا پڑے گا۔ اسی طرح دوسرے پرندوں نے بھی عجیب و غریب جگہوں پر اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ ان معصوم اور بھولے پرندوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے یہ آشیانے کتنے عارضی ہیں، کب کوئی پتھر دل انسان اُن کے ننھے سے گھر کو اُٹھا کر پھینک دے گا۔ ایسی جگہوں پر کب کوئی غلیل یا چھرّے والی گن ان کی جان لے لے گی ... پرندے بے چارے شہر کے خطرات کو کیا جانیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں اکثر لوگ پرندوں کے لیے خوبصورت گھر بنا کر لٹکا دیتے ہیں۔ تاکہ بے گھر پرندے اس میں بسیرا کریں اور اُنہیں سکون میسر آئے۔

اچھے لوگ گھروں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دانہ ڈالتے ہیں، پانی دیتے ہیں۔ اور اُن کے آشیانوں کو خواہ مخواہ گراتے نہیں... یہ رنگ برنگے پرندے ہماری کائنات کا حُسن اور قیمتی سرمایہ ہیں ان کی اور ان کے بسیروں کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔

پرندے اور ناجائز تجاوزات

Robin چڑیا کو شہر میں اماں ملی بھی تو سائن بورڈ میں

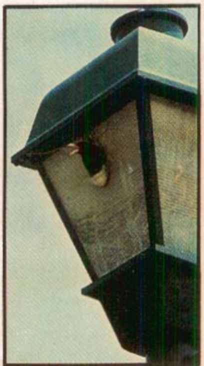

اسٹریٹ لائٹ میں Startling کا آشیانہ
دن کو بھی روشن رات کو بھی

جو وہاں نہیں تو یہیں سہی ... ایک پرانی ٹوپی میں انڈوں پر بیٹھی ہوئی بٹیر

جس مرتبان کو بیکار سمجھ کر پھینکا گیا وہی چڑیا Vewic کا مسکن ٹھہرا

کھڑکی کے پیچھے کے ساتھ رکھی ہوئی برتن
دھونے کی مشین پر فاختہ کا بسیرا

میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتّھر کے صنم

اچانک ڈیوڈ اور میتھیو نے اپنے آپ کو خوفناک قسم کے دیوقامت مجسموں کے درمیان پایا۔ چاروں طرف گھنا پُراسرار جنگل تھا جس میں کہیں کوئی اژدہا شیر سے لڑ رہا تھا اور کہیں کوئی مست ہاتھی سُونڈ اُٹھائے کھڑا تھا۔ ایک بہت بڑا پتھروں سے بنا ہوا انسانی چہرہ قہقہے لگا رہا

تھا اور کئی اونچے انسانی مجسمے آنکھیں بند کیے گیان دھیان میں مصروف تھے۔ پورا ماحول آسیب زدہ لگ رہا تھا کوئی اور ہوتا تو مارے ڈر کے گھگھی بندھ جاتی لیکن ڈیوڈ اور میتھیو بہادر بچّے تھے۔ اُنھیں پتا تھا کہ یہ پتھر کے بے جان مجسّمے ہیں اور ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو خوش تھے کہ اُنھوں نے کیسی زبردست جگہ دریافت کی۔ اصل میں یہ باغ، اٹلی کے ایک شہزادے ویسینو اورسینی نے سولھویں صدی میں تیار کرایا تھا۔ یہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مجسمے کس نے بنائے تھے لیکن مقامی لوگوں میں یہ کہانی عرصے سے مشہور ہے کہ اس علاقے میں کسی زمانے میں زلزلہ آیا تھا جس کے بعد یہاں چھوٹی بڑی بہت سی پہاڑیاں زمین کے سینے پر اُبھر آئی تھیں انہی پہاڑیوں پر یہ مجسّمے بنا دیے گئے تھے۔

یہ باغ اتنا گھنا ہے کہ سورج کی روشنی بھی زمین تک مشکل ہی سے پہنچ پاتی ہے جس سے پورا ماحول آسیبی محسوس ہوتا ہے۔

تیرہ سالہ ڈیوڈ اور میتھیو مجسموں کے قریب گئے اور بعض کے وہ جسم پر چڑھ گئے۔ آپ تصویر میں میتھیو کو مجسّمے کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ اُنہیں بالکل بھی ڈر نہیں لگا اور بھلا کیوں لگتا وہ تو صرف ایک چیز سے ڈرتے تھے بُزدلی سے، بھلا آپ کس چیز سے ڈرتے ہیں؟

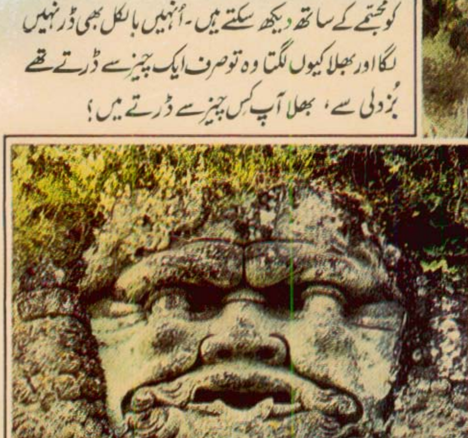

نادیہ کی کہانی

طاہر مسعود

نادیہ اور شازیہ دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی عمروں میں ایک سال کا فرق تھا۔ نادیہ بڑی تھی، سنجیدہ طبیعت کی چُپ چاپ رہنے والی لڑکی۔ شازیہ شوخ اور چنچل۔ ایسے بچّے ماں باپ کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اُن کی بھولی بھالی میٹھی میٹھی باتیں من کو بھاتی ہیں۔ جنہیں سُن کر اُن کی ساری تھکن اُتر جاتی ہے۔

شازیہ جب تک جاگتی رہتی، کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی۔ کبھی امی کے گلے میں بانہیں حمائل کر رہی ہے۔ کبھی دادی کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی ہے تو کبھی ابو سے کہانی سُننے کی ضد کر رہی ہے۔ غرضیکہ نچلا بیٹھنا تو اُسے آتا ہی نہ تھا۔ اس کی شرارتوں پر اکثر اُسے ڈانٹ بھی پڑ جاتی تھی۔ لیکن وہ ایسی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر دیر تک قبول نہیں کرتی تھی۔ بس تھوڑی دیر کے لیے منہ بسورا اور پھر ٹھیک ہوگئی، بالکل ویسی ہی جیسی ڈانٹ پڑنے سے پہلے تھی۔ پھر سارا گھر اس کی کھنکتی ہوئی معصوم ہنسی سے گونجنے لگتا تھا۔ جس روز شازیہ گھر میں نہ ہوتی یا کمرے میں گہری نیند سو رہی

نادیہ اور شازیہ دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی عمروں میں ایک سال کا فرق تھا۔ نادیہ بڑی تھی، سنجیدہ طبیعت کی چُپ چاپ رہنے والی لڑکی۔ شازیہ شوخ اور چنچل۔ ایسے بچے ماں باپ کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اُن کی بھولی بھالی میٹھی میٹھی باتیں من کو بھاتی ہیں جنہیں سُن کر ان کی ساری تھکن اُتر جاتی ہے۔

شازیہ جب تک جاگتی رہتی کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی۔ کبھی امّی کے گلے میں باہیں حمائل کر رہی ہے، کبھی دادی کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی ہے تو کبھی ابّو سے کہانی سننے کی ضد کر رہی ہے۔ غرضیکہ نچلا بیٹھنا تو اُسے آتا ہی نہ تھا۔ اس کی شرارتوں پر اکثر اُسے ڈانٹ بھی پڑ جاتی تھی لیکن وہ ایسی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر دیر تک قبول نہیں کرتی تھی۔ بس تھوڑی دیر کے لیے منہ بسورا اور پھر ٹھیک ہو گئی بالکل ویسی ہی جیسی ڈانٹ پڑنے سے پہلے تھی۔ پھر سارا گھر اس کی کھنکتی ہوئی معصوم ہنسی سے گونجنے لگتا تھا۔ جس روز شازیہ گھر میں نہ ہوتی یا کمرے میں گہری نیند سو رہی ہوتی تو ماحول سُونا سُونا سا لگنے لگتا۔ ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ اور سبھی محسوس کر لیتے کہ آج شازیہ نہیں ہے۔ اسی گھر میں نادیہ بھی تو تھی لیکن کوئی اس کے وجود کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتی خاموش رہتی۔ ضرورت کے وقت بھی وہ مختصر انداز میں اپنے مطلب کی بات کرتی اور اپنے کام میں لگ جاتی، ایسا نہیں تھا کہ وہ جان بوجھ کر چُپ رہتی تھی... نہیں اُس کی طبیعت ہی ایسی تھی۔ دیکھنے میں شاید وہ الگ تھلگ اور بے نیاز سی نظر آتی ہو لیکن حقیقتاً وہ بہت حسّاس اور نرم دل لڑکی تھی۔ معمولی سے معمولی بات کا بھی اس پر گہرا اثر ہوتا تھا، لیکن وہ اپنے جذبات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ کمرے میں چلی جاتی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر سامنے کی دیوار کو گھورنے لگتی۔ ایسا وہ کیوں کرتی تھی؟ جس واقعے کا اس پر اثر ہوتا غالباً وہ اسے اپنے ذہن میں دہرار ہی ہوتی تھی۔ وہ سمجھنے کی کوشش کرتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟

امّی، ابّو، دادی اور دوسرے لوگوں نے نادیہ کو اسی طرح قبول کر لیا تھا جیسی وہ تھی۔ وہ اُسے خاطر خواہ اہمیت تو نہ دیتے تھے البتہ جب شازیہ کی شرارتوں سے تنگ آجاتے تھے تب وہ مثال کے طور پر نادیہ کو پیش کرتے تھے کہ "دیکھو شازیہ... آخر نادیہ بھی تو لڑکی ہے، کتنے اچھے سے رہتی ہے۔" گویا انہیں نادیہ میں اچھائی اُس وقت نظر آتی تھی۔ جب شازیہ سے انھیں تکلیف پہنچتی تھی۔ ورنہ عام حالات میں نادیہ کا ذکر گھر والوں کی زبان پر مشکل ہی سے آتا تھا۔ نادیہ سے سبھی لوگ خوش

تھے ... نہیں، نہیں یہ کہنا درست نہیں ہوگا۔ ہاں یہ ہے کہ وہ نادیہ سے ناراض نہیں تھے، کبھی بھی نہیں۔ اور اتنی سی بات تو خود نادیہ بھی جانتی تھی کہ اُس کے والدین اس پر کبھی غصّہ نہیں ہوتے وہ کبھی اُسے ڈانٹتے بھی نہیں تھے اور وہ غصّے کیوں ہوتے ... نادیہ سے کبھی ایسی کوئی حرکت بھی تو سرزد ہوتی۔ وہ ذمّے دار تھی، لکھنے پڑھنے میں دل لگاتی تھی۔ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔ اس میں سبھی خوبیاں تو تھیں، لیکن اس کے باوجود ... رفتہ رفتہ ... ایک احساس نادیہ کے دل میں جڑ پکڑتا گیا۔ وہ عجیب سا احساس۔ اس سے کوئی محبّت نہیں کرتا۔

کیا واقعی ایسا تھا؟ کیا نادیہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھی؟ کون کہہ سکتا ہے کہ نادیہ کو جن لوگوں سے یہ شکایت تھی ان کے دل میں کیا تھا؟

زندگی کے تمام معاملات میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا تھا۔ دونوں ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ دونوں کی میزیں الگ الگ تھیں۔ ان کے کپڑے ساتھ ساتھ سلتے تھے۔ ان کے کھیلنے کودنے کی چیزیں ان کی پسند سے خریدی جاتی تھیں۔ ابّو ان کی فرمائشیں پوچھتے تھے۔ امّی اُن کے کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، سونے، جاگنے غرضیکہ ہر بات کا خیال رکھتی تھیں، کسی معاملے میں بھی تو کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ تو پھر نادیہ کو ایسا کیوں محسوس ہوتا تھا؟ اگر کوئی یہ نادیہ سے پوچھ لیتا تو شاید وہ نہ بتا پاتی۔ اُسے لگتا تھا کہ شازیہ کو دیکھ کر ان کے والدین کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے۔

شازیہ سے ان کی محبت میں ایک حرارت اور تازگی ہے۔ جس سے نادیہ محروم ہے۔ یہ بہت نازک سا فرق تھا۔ کوئی اور اُسے کبھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ حتّٰی کہ ان کے والدین نے بھی اس پر کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔ لیکن یہ نادیہ کا حسّاس دل تھا جس نے نہ معلوم کس لمحے میں اس احساس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شازیہ اگر اس کی جگہ ہوتی اور اُسے ایسا محسوس ہوتا تو وہ بھاگ کر ابّو سے چمٹ جاتی اور ان کے چہرے کو اپنے ننھّے منّے ہاتھوں میں تھام کر کہتی۔

"ابّو، کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگتی۔ کیا نادیہ آپ کو زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

لیکن نادیہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنے دل کی بات زبان پر لانا نہیں آتا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے بھی اس کے ذہن کی کیفیت عجیب سی ہو جاتی تھی۔ کوئی اندرونی جھجھک اور شرم اُسے روک دیتی تھی۔ وہ اپنا سر جھکا لیتی اور اپنی سوچوں میں ڈوب جاتی۔

یہ دنیا عجیب و غریب جگہ ہے۔ یہاں وہی لوگ خوش اور مطمئن رہتے ہیں جو اپنی ذات کو اہمیت دیتے ہیں۔ جو اپنی تکلیف، اپنی ناراضگی اور اپنے غصّے کو بلند آواز سے بیان کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو ہر زیادتی کو چُپ چاپ سہہ لیتے ہوں اور کسی سے کچھ نہ کہتے ہوں۔ انہیں اکثر تکلیف میں رہنا پڑتا ہے اور بعض اوقات ان کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔

نادیہ کی حالت خدانخواستہ قابلِ رحم تو نہ تھی لیکن دُکھ کا ایک احساس تھا جو اس کے دل پر غبار کی طرح چھایا رہتا تھا۔ جیسے آپ کے جسم کا کوئی حصّہ یکایک ہلکا سا دُکھنے لگتا ہے اور یاد نہیں آتا کہ چوٹ کب اور کیسے لگی تھی۔ نادیہ کی خاموشی میں حزن و ملال کی آویزش نے اس کی طبیعت کو سُست کر دیا تھا۔ مگر اس تبدیلی کو کسی نے بھی نوٹ نہیں کیا۔ وہ اب زیادہ وقت اپنے کمرے ہی میں گزارنے لگی تھی۔ اسکول سے واپسی پر کھانا وغیرہ کھا کر اپنی میز پر بیٹھ جاتی اور تصویریں بنانے لگتی۔ ڈرائنگ اُس کی شروع ہی سے اچھی تھی۔ اس نے پہلی تصویر پہلی جماعت میں بنائی تھی۔ پہاڑوں کا سلسلہ، ان کے پیچھے ناریل کے جھکے ہوئے درخت اور طلوع ہوتا ہوا سورج... پتہ نہیں سورج طلوع ہو رہا تھا یا غروب۔

اس تصویر پر مس نے "ویری گڈ اور کیپ اِٹ اپ" کے ریمارکس دیے۔ اُسے ان ریمارکس کی خوشی تو ہوئی تھی لیکن سب سے زیادہ مسرت تو اُسے تصویر بنانے کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے اُس نے اپنے دل کی بات کسی کے کانوں میں چپکے سے کہہ دی ہو۔ اُسے بڑا سہارا ملا تھا۔ چُپ چُپ رہنے سے اس کی طبیعت میں جو گھٹن سی پیدا ہو چکی تھی۔ تصویر بناتے ہی کم ہو گئی جیسے بارش کے بعد فضا دھلی دھلائی صاف ہو جاتی ہے۔ پھر وہ تصویریں بنانے لگی۔ طرح طرح کی۔ ابو نے یہ شوق دیکھا تو اُسے رنگین پینسلوں کے خوب سارے ڈبّے لا دیے۔ اور پھر دو تین برسوں کے بعد تو اُس نے واٹر کلر سے تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ شازیہ کو تو اس کی تصویروں سے عشق تھا۔ جب بھی وہ میز پر جُھکی تصویر بنا رہی ہوتی، شازیہ دُور ہی سے پُوچھتی۔

"آپی آج کون سی تصویر بنا رہی ہو؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔" وہ مختصر سا جواب دے کر ٹال جاتی۔

"میری تصویر بناؤ نا آپی... ایسے ہی ہنستے ہوئے۔"

"اچھا بنا دوں گی..."

پھر ایک دن سچ مچ اُس نے سوچا کہ شازیہ کی تصویر بنائی جائے۔ جب اُس نے سوچنا شروع کیا تو ذہن میں تصویر کے بے شمار خاکے آئے۔ شازیہ کرُسی پر بیٹھی ہے اور امّی جھُک کے اُسے پیار کر رہی ہیں ---- یا شازیہ نے پیچھے سے ابو کی گردن میں بازو حمائل کیا ہوا ہے اور دونوں خوب زور سے ہنس رہے ہیں۔ یا سب لوگ گول دائرے کی شکل میں شازیہ کے گرد بیٹھے ہیں اور کسی بات پر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ شازیہ کی تصویر کا جو خاکہ بھی اُس کے ذہن میں آیا اس میں شازیہ اکیلی نہیں تھی۔ اور یہ خاکے مشکل تھے۔ ابھی اُسے تصویر بنانے کے فن پر اتنا عبور حاصل نہیں ہوا تھا۔ جو ان خاکوں کو وہ رنگوں اور لکیروں کی زبان دیتی۔ وہ شازیہ کی تصویر ضرور بنائے گی، لیکن ابھی نہیں۔ اُس نے سوچا۔ اور اُسے یک گونہ اطمینان ہو گیا اور وہ اس بات کو بھُول گئی۔

ان دنوں گھر میں عارف بھائی کے آجانے سے چہل پہل سی ہو گئی تھی۔ وہ لندن سے بار ایٹ لا کر کے لوٹے تھے اور تایا کے اکلوتے لڑکے تھے۔ اور لاہور جاتے ہوئے ایک ہفتے کے لیے ٹھہرے تھے۔ روزانہ ہی ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا۔ نادیہ ان پروگراموں میں شریک نہیں تھی۔ ہاکس بے جانے کا طے ہوا۔ کھانے کی میز پر تفصیلات زیرِ بحث تھیں۔ نادیہ اپنے کمرے میں حسبِ معمول میز پر کام کر رہی تھی۔ امّی نے کہا "گھر پر نادیہ اور ساس اماں رہ جائیں گی۔"

وہ نادیہ کی دادی کو ساس اماں کہتی تھیں۔

"کیوں نادیہ کیوں نہیں جائے گی؟" عارف بھائی نے پوچھا۔

"وہ جاتی ہی کہاں ہے۔ گھر میں بھی بس وہ ہوتی ہے اور اس کا کمرہ۔"

"ارے واہ۔ یہ کیا بات ہوئی۔" عارف بھائی اُٹھے اور تیر کی طرح سیدھے اس کے کمرے میں پہنچے۔ "ارے گڑیا... تم یہاں چھپُی کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی وہ اسی تمکنت سے بیٹھی رہی جیسے بہت بڑی ہو گئی ہو۔

"تصویریں!" عارف بھائی نے تصویر میز پر بکھری دیکھیں تو تقریباً چیخ اُٹھے۔

"ارے ہماری گڑیا تو آرٹسٹ ہو گئی ہے۔ بھئی واہ یہ تو بڑی شاندار تصویریں ہیں۔"

وہ ایک ایک تصویر کو باری باری دیکھنے لگے۔ وہ ہر تصویر کو دیکھتے جاتے اور اس کی خوبصورتی اور خوبیوں کے قصیدے پڑھتے جاتے۔ نادیہ کے لیے یہ ردِ عمل انوکھا تھا۔ اس طرح تو اُس کی تصویروں کو کبھی بھی نہیں سراہا گیا تھا۔ ابو نے ہاں کبھی کبھار حوصلہ افزائی کے چند الفاظ

کہہ دیے تھے اور امی کے نزدیک تو یہ کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔ تعریف کرتے کرتے عارف بھائی رُکے۔

"گڑیا... یہ کیا ہے؟" انہوں نے ایک تصویر کو اُٹھا کر نادیہ کی طرف دیکھا۔

"ارے نادیہ...؟" وہ پریشان سے ہوگئے۔ نادیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"تم رو رہی ہو۔ مگر کیوں؟" انہوں نے اُسے کندھے سے پکڑا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

"بھئی میں مذاق تھوڑے ہی اُڑا رہا تھا۔ یہ واقعی بہت اچھی تصویریں ہیں۔"

انہوں نے مضبوطی سے کہا۔ نادیہ نے آنسو پونچھ ڈالے اور اپنی تصویریں سمیٹنے لگی۔

پھر عارف بھائی چلے گئے اور نادیہ نے اُن کے جانے کو بہت محسوس کیا۔ زندگی پھر سُست پڑ گئی۔ امی، ابو، شازیہ اور دادی جان... ان سب کے درمیان وہ اکیلی تھی۔ وہ، اس کا کمرہ، اُس کی تصویریں اور وہ، اور وہ اور وہ۔

محبت اور توجہ کی کمی کا احساس پھر سے بڑھنے لگا تھا۔ اس احساس پر قابو پانے کے لیے اُس نے دو نئی تصویروں پر کام شروع کیا۔ یہ خاصا محنت طلب کام تھا۔ یہ دونوں تصویریں ایسی تھیں جن کے لیے مشق اور پختگی کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ کام کرتی رہی۔ وہ جیسے جیسے تصویر مکمل کرتی گئی اُسے محسوس ہوا کہ وہ تبدیل ہو رہی ہے۔ ایک مسرّت بخش اطمینان کے ساتھ تبدیلی کا احساس جس کی وہ صرف تمنّا ہی کر سکتی تھی۔

اس رات ابو اور امی کے درمیان نادیہ ہی موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ عارف بھائی نے لاہور پہنچ کر خط لکھا تھا... انہوں نے لکھا تھا: "نادیہ انتہائی حسّاس لڑکی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ لوگ اس پر توجہ نہیں کرتے۔"

"مگر، ہم نے توجہ میں کیا کمی کی ہے؟" امی نے خط پڑھ کر کہا۔

"ہاں پتا نہیں عارف کو ایسا کیوں محسوس ہوا؟" ابو نے بھی سوچتے ہوئے کہا۔

"ہر بچّے کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ نادیہ ہے ہی ایسی۔"

"لیکن پھر بھی... ہمیں اس پر توجہ کرنی چاہیے۔"

"پتا نہیں اور توجہ کس طرح کی جاتی ہے۔"

ابو خاموش رہے۔ اُنہیں پتا تھا کہ اس طرح بحث اور اُلجھ جائے گی۔

اگلی شام گھر پر نادیہ اور دادی اماں ہی تھیں۔ امی شازیہ کے ساتھ مسز کمال کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ ابو دفتر سے لوٹے تو انہوں نے گھر میں سناٹا پایا۔ نادیہ کے کمرے میں لائٹ جل رہی تھی۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا نادیہ میز پر سر رکھے سو رہی ہے۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے قریب پہنچے۔ دو تصویریں رکھی تھیں۔ انہوں نے تصویروں کو اٹھایا۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ ان کی بیٹی کی بنائی ہوئی تصویریں حسین تھیں اور ان میں کسی حد تک فنی پختگی بھی تھی۔ ان تصویروں کو وہ پہچان گئے۔ ایک تصویر شازیہ کی تھی۔ اور دوسری خود نادیہ کی۔

تصویر میں شازیہ رو رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ جبکہ دوسری تصویر میں نادیہ کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں بڑی شوخ چمک۔ ایسی مسکراہٹ اور چمک جو انہوں نے کبھی نادیہ کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

وہ لمحے بھر سوچتے رہے پھر انہوں نے شازیہ والی تصویر پھاڑ دی اور جھک کر نادیہ کا ماتھا چوم لیا۔

آپ نے حادثے تو بہت دیکھے ہوں گے مگر ایسا حادثہ شاید نہ دیکھا ہو۔

FRANK HANIUS
ش۔ف

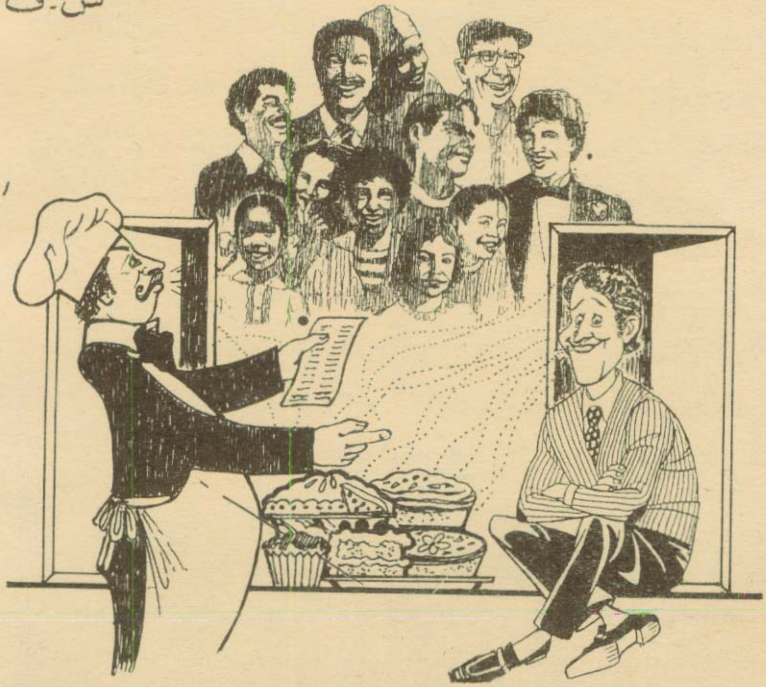

"پیرو" کی کہانی جس کا بنیادی موضوع انصاف ہے

بیکری والے کا پڑوسی

آج سے کوئی سو برس پہلے پیرو کے شہر لیما میں ایک بیکری والا رہا کرتا تھا۔ وہ بہت محنتی انسان تھا۔ وہ ہر روز آٹے کو گوندھ کر اس میں خمیر اُٹھاتا اور پھر اُس خمیری آٹے سے کیک اور پیسٹریاں تیار کرتا۔ وہ ہر روز صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اپنی دکان کھول لیتا۔ بیکری والے کو اگر دنیا میں کوئی چیز پسند تھی تو بس ایک یعنی روپیہ پیسہ۔ بیکری والے کے برعکس اُس کا پڑوسی بالکل ہی مختلف قسم کا انسان تھا۔ وہ کام کاج سے زیادہ

دھوپ میں بیٹھ کر چڑیوں کی چہکار سُننا پسند کرتا تھا۔ بیکری والے کے برخلاف اُسے روپے پیسے سے رتی برابر بھی رغبت نہ تھی۔

گویا بیکری والے کا پڑوسی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنا کر صحیح معنوں میں زندگی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ بیکری والے کا یہ پڑوسی ہر صبح بیکری والے کے یہاں تیار ہونے والی تازہ تازہ پیسٹریوں اور کیکوں کی دل لُبھانے والی مہک سے بھی خوب لطف اندوز ہوتا، جو ہر صبح ہَوا کے دوش پر سفر کرتی اُس کے گھر میں داخل ہوتی تھی۔

رات کی محنت کے بعد بیکری والا سورج نکلتے ہی اپنے گھر کے پچھواڑے میں کُھلی جگہ پر جا بیٹھتا اور پھر اپنا بٹوہ نکال کر میز پر رکھ دیتا اور بٹوے سے روپے نکال کر گزشتہ دن کی آمدنی گننے لگتا۔ وہ ہر سکّے کو غور سے دیکھتا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ اپنی آمدنی کا حساب کرتا رہتا۔ بیکری والا ہر صبح جیسے ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر گھر کے پچھواڑے آتا اُس کا پڑوسی دروازہ کُھلنے کی آواز پر فوراً نیند سے بیدار ہو جاتا۔ بیکری والے کے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ ایک طرح سے پڑوسی کے لیے ایک اشارہ تھی کہ وہ اپنے گھر کی کھڑکی سے منہ نکال کر مزیدار پیسٹریوں اور کیکوں کی بھینی بھینی خوشبو سے استفادہ کر سکتا ہے۔

بیکری والے کو معلوم تھا کہ اُس کا پڑوسی اُس کی بیکری سے کم ہی کوئی چیز خریدتا ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کا پڑوسی ہر صبح اُس کی بیکری کی پیسٹریوں اور کیکوں سے اُٹھنے والی مہک سُونگھتا ہے۔ لالچی بیکری والا جب بھی اس بارے میں سوچتا اُسے بہت غصّہ آتا۔

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ محنت تو میں کروں اور میری پیسٹریوں اور کیکوں کی خوشبو میرا پڑوسی سُونگھے ... اور وہ بھی بلا معاوضہ۔" بیکری والا اکثر بڑبڑاتا۔

لیکن ایک دن بیکری والے نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اپنے پڑوسی کو پیسٹریوں اور کیکوں کی مہک سے بلامعاوضہ فائدہ نہیں اُٹھانے دے گا۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے پڑوسی کے گھر جا پہنچا اور پڑوسی سے مطالبہ کیا کہ اُس نے اب تک پیسٹریوں اور کیکوں کی جتنی مہک سُونگھی ہے اُس کا معاوضہ ادا کرے۔ بیکری والے نے پچھلے کئی برسوں کا ایک لمبا چوڑا بِل پڑوسی کے سامنے پیش کر دیا۔ پڑوسی کے پہلے تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب اُسے معاملے کی نوعیت کا احساس ہُوا تو اُس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پڑوسی کا قہقہہ اتنا زوردار تھا کہ اُس کی آواز سُن کر محلّے کے دوسرے افراد بھی اُن دونوں کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ جب اُن میں سے ایک نے بیکری والے کے پڑوسی سے پوچھا کہ تم نے اتنے زور کا قہقہہ کیوں لگایا ہے تو اُس

نے اُنہیں بیکری والے کے بل کے بارے میں بتایا۔ یہ بات سُنتے ہی وہاں موجود تمام لوگ بھی زور سے ہنس پڑے خاص طور پر خواتین تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر بیکری والے کا غصّہ اور بڑھ گیا۔ معاوضہ ملنا تو درکنار اُس کا تو اُلٹا اور مذاق بن گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد بیکری والا جب بھی اپنی دکان سے باہر نکلتا گلی کے نٹ کھٹ بچّے اُسے گھیر لیتے۔ اُن میں سے کچھ اس کے لباس کو سونگھتے اور پھر اُس کے آگے کھڑے ہو کر پوچھتے۔

"انکل بیکری والے! بتاؤ تمہارے کپڑوں کو سونگھنے کی ہم تمہیں کیا قیمت ادا کریں؟" یوں گویا بیکری والے کی جان عذاب میں آگئی۔ لوگوں اور بچّوں کے چڑانے سے تنگ آکر بیکری والے نے ایک دن مقامی عدالت میں اپنے پڑوسی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔

بیکری والے نے جس عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کیا تھا اُس کا جج بیکری والے اور اُس کے پڑوسی کے جھگڑے اور اُس کی نوعیت سے مقدمہ دائر ہونے سے پہلے ہی واقف تھا۔ بہرحال پیروکے قانون کے مطابق جج نے بیکری والے کو عدالت میں آکر اپنا مدّعا بیان کرنے کو کہا۔ جج نے جو زبردست حسِ مزاح کا مالک تھا۔ بیکری والے کی باتیں غور سے سُنیں اور اعلان کیا کہ وہ جلد ہی اس مقدمے کا فیصلہ کر دے گا۔ اپنے وعدے کے مطابق اگلے ہی ہفتے جج نے بیکری والے اور اُس کے پڑوسی کو ایک ساتھ عدالت میں حاضر ہونے کا حُکم دیا۔ بیکری والے کے پڑوسی کو جج نے یہ حکم بھی دیا کہ وہ عدالت میں حاضر ہو تو اپنے ساتھ سونے کی ایک سو اشرفیاں بھی لے کر آئے۔ جج کے اس حُکم کی خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سو اشرفیاں لانے کا حُکم سُن کر بیکری والے کا پڑوسی پریشانی میں پڑ گیا۔

"لگتا ہے مجھے پیسٹریوں اور کیکوں کی خوشبوؤں کی قیمت چُکانی ہی پڑے گی۔" بیکری والے کے پڑوسی نے سوچا۔

دوسری طرف بیکری والا جج کے اس حُکم پر انتہائی خوش تھا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر سونے کی سو اشرفیوں کو تصوّر میں بار بار گنتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اشرفیاں اُس کی جیب میں ہیں۔

بالآخر ایک ہفتے بعد بیکری والا اور اُس کا پڑوسی دونوں عدالت میں حاضر ہوئے۔ اس دلچسپ مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے لیما اور دوسرے شہروں سے بہت سے لوگ کمرۂ عدالت میں صبح ہی سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ہر شخص اس بات پر افسوس کر رہا تھا کہ بے چارے پڑوسی کو خواہ مخواہ سو اشرفیاں دینی پڑ رہی ہیں۔

بالآخر جج صاحب کمرۂ عدالت میں تشریف لائے اور مقدمے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوگئی۔ پہلے دونوں نے مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کی قسم کھائی۔ پھر جج نے بیکری والے سے کہا کہ وہ اپنی کہانی کو ایک بار پھر سُنائے۔

بیکری والا سوچ کر آیا تھا کہ وہ جج کے سامنے ثابت کر دے گا کہ اُس کے پڑوسی نے پچھلے برسوں میں اُس کی پیسٹریوں اور کیکوں کی جتنی مہک سونگھی ہے، اُس کی مالیت سونے کی سو اشرفیوں سے ہرگز کم نہیں۔ بیکری والے نے اپنے منصوبے کے مطابق اپنی کہانی ایک مرتبہ پھر کمرۂ عدالت میں دُہرائی۔ جج نے نہایت غور سے بیکری والے کی کہانی سُنی۔

جب بیکری والا اپنی کہانی سُنا چُکا تو جج نے بیکری والے کے پڑوسی کو کٹہرے میں بُلا کر پوچھا کہ کیا واقعی وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ بیکری والے کی پیسٹریوں اور کیکوں کی خوشبوؤں سے مستفید ہوتا رہا ہے؟ پڑوسی نے جب دُکھے دل کے ساتھ اس کا اعتراف کر لیا تو جج نے اُس سے دوسرا سوال پوچھا۔ جج نے پُوچھا کہ پیسٹریوں اور کیکوں کی مہک خوشگوار ہوتی تھی یا ناخوشگوار؟ ظاہر ہے کہ پڑوسی نے سچ بولا اور کہا کہ اُن کی مہک انتہائی خوشگوار ہوتی تھی، اتنا سُننا تھا کہ جج نے اُسے حُکم دیا کہ وہ سونے کی سو اشرفیوں کی تھیلی فوراً بیکری والے کے حوالے کر دے۔

جج کا حُکم سُنتے ہی بیکری والا اپنے کٹہرے سے آدھا باہر لٹک گیا تاکہ جلدی سے اشرفیوں کی تھیلی پکڑ سکے۔ جب اُس نے اشرفیوں کی تھیلی لے کر سینے سے لگا لی اور گھر جانے لگا تو جج نے اُسے حُکم دیا کہ وہ سامنے پڑی ہوئی میز پر سونے کی اشرفیوں کو گِنے۔

بیکری والے نے سوچا کہ یہ تو جج کی اور بھی مہربانی ہے۔ اس طرح وہ سب کے سامنے اشرفیوں کو گِن کر اطمینان کرے گا کہ آیا وہ واقعی پوری ہیں یا نہیں۔

چنانچہ اُس نے سامنے پڑی ہوئی ایک صاف سُتھری میز پر اشرفیوں کی تھیلی اُلٹ دی۔ بیکری والے نے اشرفیوں کو میز پر اُلٹا تو اُن سے نہایت کھنکھناتی ہوئی آوازیں نکلیں۔ اشرفیاں سورج کی روشنی میں چم چم چمک رہی تھیں۔ بیکری والا ایک ایک کر کے اشرفیاں گننے لگا۔ کمرۂ عدالت میں موجود ہر شخص دیکھ رہا تھا کہ بیکری والا خوشی سے پھُولا نہیں سما رہا ہے۔ سب دیکھ رہے تھے اشرفیوں کی کھنکھناہٹ اُن کی چمک دمک اور اُن کو چھُونے کا احساس بیکری والے کے دِل میں ہلچل مچائے ہوئے ہے۔ بیکری والے نے تھوڑی ہی دیر میں اشرفیوں کو گِن کر دوبارہ تھیلی میں ڈال دیا۔ اُس نے جج کو بتایا کہ اشرفیاں پوری ہیں۔ اور

اُن میں کوئی کھوٹ نہیں، یہ کہتے ہی وہ دوبارہ گواہوں کے کٹہرے میں جاکر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے جج کی منصف مزاجی کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر تبھی جج نے اُسے حُکم دیا کہ اشرفیوں کی تھیلی اپنے پڑوسی کو واپس کردے۔ جج کا یہ حُکم سُنتے ہی کمرۂ عدالت میں حیرت بھری ہلکی ہلکی چیخیں گونج گئیں۔

یہ حُکم دیتے ہی جج اپنی کُرسی سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی باقی لوگ بھی کھڑے ہوگئے۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ سب جج کے فیصلے کے منتظر تھے۔ پھر کمرۂ عدالت میں جج کی آواز بُلند ہوئی۔ اُس نے اعلان کیا۔

"عدالت نے پڑوسی کے خلاف بیکری والے کی شکایت اور پڑوسی کا یہ اعتراف نہایت غور سے سُنا۔ کہ اُس نے بیکری والے کی لذیذ پیسٹریوں اور کیکوں کی مہک سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ فریقین کے بیانات کی روشنی میں اس مقدمے کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ بیکری والے (بیکری والے کی طرف اشارہ کرکے) تمہارے پڑوسی نے تمہاری پیسٹریوں اور کیکوں کی خوشبو سونگھی اور تم نے اُس کی اشرفیوں کو دیکھا اور اُنہیں چھُوا۔"

جج کا یہ فیصلہ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا لیکن جب لوگوں کو فیصلے کی حقیقت کا احساس ہُوا تو کمرۂ عدالت قہقہوں اور ہاؤ ہُو سے گونجنے لگا۔ بیکری والے کا پڑوسی ابھی تک مُرجھایا ہُوا سا اپنے کٹہرے میں کھڑا تھا، لیکن جیسے ہی بیکری والے نے اشرفیوں کی تھیلی اُس کی جانب بڑھائی، اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ سب لوگ پڑوسی کو اشرفیوں کی واپسی پر مبارک باد دے رہے تھے۔ کمرۂ عدالت میں بیکری والے کے سوا سب خوش تھے۔

بیکری والے نے تھیلی اپنے پڑوسی کو تھمائی اور کمرۂ عدالت سے کھسک گیا۔ لوگوں نے پڑوسی کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا اور نعرے لگاتے، چیختے چلّاتے پڑوسی کے گھر کی طرف چل دیے۔

بیکری والے نے جب دیکھا کہ لوگوں کا جلوس اُس کی گلی میں داخل ہو رہا ہے تو وہ فوراً دروازے کے پیچھے چھُپ گیا۔ اُس دن کے بعد سے بیکری والے نے اپنے گھر کے پچھواڑے جاکر اپنی آمدنی کی رقم گننا بند کردی۔ وہ یہ کام اب گھر کے اندر بیٹھ کر کرتا تھا۔

مقدّمے کے فیصلے کے بعد بیکری والے کے پڑوسی کے علاوہ محلّے بھر کے تمام شیطان بچّے کھلنڈرے نوجوان صبح کے وقت بیکری والے کے گھر کے آگے آکر اُس کی پیسٹریوں اور کیکوں کی مہک سونگھنے لگے۔ بیچارہ بیکری والا یہ سب دیکھتا رہتا۔ بیکری والے کا پڑوسی بھی اب پہلے سے زیادہ پیسٹریوں اور کیکوں کی مہک سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

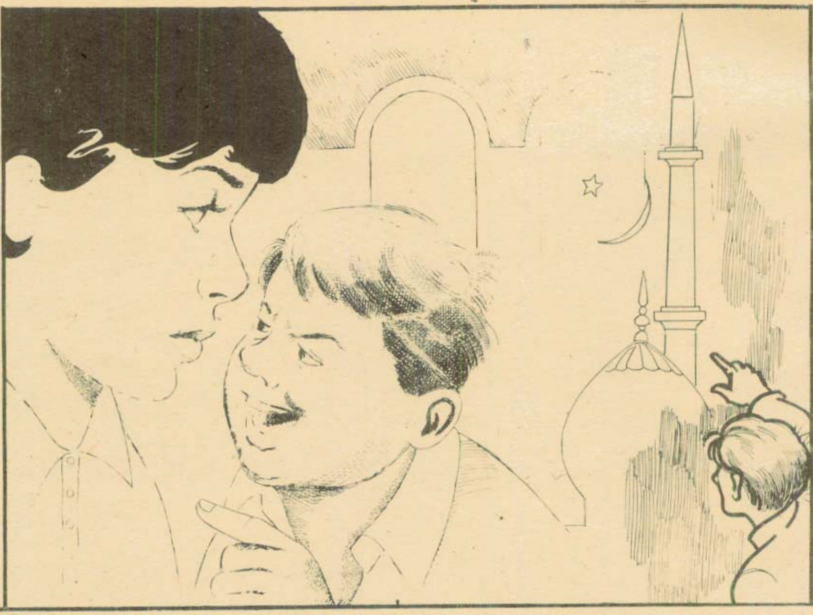

نیکی کی کہانی

اس نے پہلا روزہ رکھا اور وہ بدل گیا

غزالی

"امی کل میں روزہ رکھوں گا" علی نے اسکول سے واپس آتے ہی اعلان کیا۔ علی چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اور بہت شریر تھا۔ پچھلے سال سارے گھر والوں کے کہنے کے باوجود وہ روزہ رکھنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے آج امی حیران ہوگئیں اور بڑے پیار سے بولیں "اچھا مگر یہ روزہ رکھنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟"

"امی کل میرے تینوں دوست روزہ رکھ رہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ روزہ رکھنے سے اللہ میاں خوش ہوتے ہیں اور دعائیں بھی قبول کرتے ہیں، اس لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ کل میں بھی روزہ رکھوں گا"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر کیا تمہیں معلوم ہے کہ روزے میں کیا کرتے ہیں" امی نے پوچھا۔۔۔

"جی بالکل روزے میں صبح سے شام تک نہ کچھ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں" علی نے جھٹ

جواب دیا۔

"بس؟" امی نے سوال کیا۔

"تو کیا کچھ اور بھی کرتے ہیں؟" علی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹے روزے میں نہ صرف کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ بُری باتوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہیں بولتے، کسی کو تنگ نہیں کرتے، لڑتے نہیں، گالی نہیں دیتے اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔"

"اوہو یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔" علی دل میں سوچنے لگا "مگر میں روزہ رکھوں گا ضرور کیوں کہ مجھے اللہ میاں کو خوش بھی تو کرنا ہے اور جب اللہ میاں مجھ سے خوش ہو جائیں گے تو پھر میں اُن سے اپنی پسند کی چیز مانگوں گا۔" علی کو وہ بڑی سی لال رنگ کی کار یاد آگئی جو وہ دکان کے شوکیس میں پڑی دیکھتا تھا۔

دوسرے دن علی سحری کے وقت اُٹھ گیا۔ اُس نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب اُسے شام تک بھوک لگے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ابّو کے ساتھ نماز پڑھنے چلا گیا۔ اور نماز سے واپس آکر اسکول جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ علی اسکول سے واپس آیا تو اُسے بڑی نیند آرہی تھی۔ کیوں کہ اس سے پہلے وہ کبھی اتنے سویرے نہیں اُٹھا تھا۔ چنانچہ وہ فوراً ہی سو گیا۔ عصر کی نماز کے وقت اُسے باجی نے آکر اُٹھایا، وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اچانک اُس کی نظر سامنے رکھی کتابوں پر پڑی تو اُسے یاد آیا کہ ابّو نے کہا تھا کہ اسکول سے آکر وہ اپنا اسکول کا کام ختم کرلے۔ پھر عصر سے مغرب تک اُسے پارک میں کھیلنے کی اجازت ہوگی۔ مگر وہ آتے ہی سو گیا تھا اور ہوم ورک نہیں کر سکا تھا۔ "جب ابّو کو پتا چلے گا کہ میں نے ہوم ورک نہیں کیا تو وہ یقیناً ناراض ہوں گے اور ڈانٹیں گے۔" علی نے سوچا۔ "ابّو کونسا بستہ کھول کر دیکھیں گے، میں کہہ دوں گا کہ میں نے ہوم ورک کر لیا ہے۔" مگر پھر اُسے امی کی بات یاد آگئی۔ "اگر میں نے جھوٹ بولا تو میرا روزہ ٹوٹ جائے گا۔" وہ شش و پنج میں پڑ گیا مگر اُس نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسی وقت علی کے ابّو کمرے میں داخل ہوئے۔ "بیٹا جلدی کرو نماز کا وقت ہو رہا ہے اور ہاں وہ تم نے اپنا ہوم ورک کر لیا؟"

"نہیں ابّو میں بہت تھکا ہُوا تھا اس لیے آتے ہی سو گیا۔" علی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اُسے یہ

دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ ابو اُسے ڈانٹنے کے بجائے ۔ بڑے پیار سے بولے :" کوئی بات نہیں بیٹے ! ابھی تم نے آرام کر لیا ہے تو ہوم ورک رات کو کر لینا اور اب جلدی سے وضو کرکے آجاؤ "۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے ۔ علی بھی اُن کے پیچھے چل دیا ۔ نماز سے فارغ ہو کر ابّو تو گھر آگئے اور علی مسجد کے پارک میں کھیلنے کے لیے آگیا ۔ یہاں پر اُس کے دوست پہلے سے ہی موجود تھے ۔ اُن ہی میں زاہد بھی تھا ۔ زاہد اُس کا پڑوسی تھا ۔ مگر دونوں میں بنتی نہیں تھی ۔ آج بھی کھیل کے دوران کسی بات پر لڑائی ہوگئی اور زاہد نے غصّے میں علی کو گالی دے دی ۔ گالی سُن کر علی کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا اور اگر کبھی لڑنے کی نوبت آجاتی تو وہ پیچھے نہیں ہٹتا تھا ، مگر آج وہ برداشت کر گیا ۔ کیونکہ وہ روزے میں لڑنا نہیں چاہتا تھا ۔" دیکھو زاہد میں تم سے ڈرتا نہیں مگر آج میرا روزہ ہے ' اس لیے تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا "۔ علی کی یہ بات سُن کر زاہد نے زوردار قہقہہ مارا اور بولا ۔

" او ہو تم تو بڑے نیک ہو گئے ہو "

علی کو غصّہ تو بہت آیا مگر پی گیا ۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھا کچن میں گیا ۔ جہاں اُس کی امّی اور باجی افطار کے لیے چیزیں تیار کر رہی تھیں ۔ آج خاص اہتمام کیا جا رہا تھا ' کیونکہ علی کا آج پہلا روزہ تھا ۔

جب روزہ کھُلا تو دسترخوان پر بہت سی چیزیں موجود تھیں ۔ امّی نے اپنے ہاتھ سے علی کا روزہ کھلوایا اور سب نے اُسے خوب پیار کیا ۔ علی بہت خوشی محسوس کر رہا تھا ۔ کھانے کے دوران اچانک جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ۔

" امّی روزہ کھولنے کے بعد کیا ہر چیز کھائی جا سکتی ہے ؟" علی نے پوچھا ۔

" ہاں بیٹے ! اب آپ جو چاہیں کھا پی سکتے ہیں "۔ امّی نے جواب دیا ۔

" تو اس کا مطلب ہے کہ اب میں زاہد سے اپنا بدلہ بھی لے سکتا ہوں "۔ علی نے سوچا ۔

" امی میں زاہد سے مل آؤں صرف پانچ منٹ کے لیے "۔ علی نے بڑی لجاجت سے پوچھا ۔

" ہاں ہاں بیٹا جاؤ "۔ اس کے ابو نے جواب دیا ۔ وہ علی سے کچھ زیادہ ہی خوش تھے ۔ اجازت ملتے ہی علی گھر سے نکل آیا ' زاہد کا گھر اُس کے گھر کے ساتھ ہی تھا ۔ علی نے دیکھا وہ گھر کے سامنے کھڑا تھا ۔

علی نے آگے بڑھ کر اُس کا گریبان پکڑ لیا " اُس وقت تو میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا کیونکہ میرا روزہ تھا۔ اب میں بھی تمہیں بتاتا ہوں بچو" یہ کہہ کر علی اُسے مارنے ہی لگا تھا کہ اُسے زاہد کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے، زاہد اُس سے بولا۔

" تم بہت گندے لڑکے ہو، میں تم سے اب کبھی بات نہیں کروں گا۔ آج جب امی کو پتا چلا کہ میں نے تمہیں تنگ کیا تھا اور جواب میں تم نے مجھے کچھ نہیں کہا تو انہوں نے مجھے خوب ڈانٹا اور بولیں" دیکھو علی کتنا اچھا لڑکا ہے، اُس نے روزہ بھی رکھا اور پھر تمہارے تنگ کرنے پر بھی تمہیں کچھ نہیں کہا اور تم ہو کہ روزہ بھی نہیں رکھتے اور پھر روزہ داروں کو تنگ بھی کرتے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے، جاؤ علی سے معافی مانگ کر آؤ" یہ سُن کر مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور میں نے سوچا کہ میں ابھی تم سے معافی مانگ لوں گا اور کل روزہ بھی رکھوں گا۔ مگر اب میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا نہ ہی دوستی کروں گا کیونکہ تم روزہ رکھنے کے بعد بھی لڑتے ہو"

زاہد کی بات سُن کر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ اُس نے زاہد کا ہاتھ تھام لیا۔ جو مُڑ کر جانے والا تھا، اور بولا۔

" مجھے معاف کر دو زاہد"

زاہد نے اُس کی طرف دیکھا، اُسے علی کے چہرے پر پشیمانی کے آثار نظر آئے اُس نے آگے بڑھ کر علی کو گلے سے لگا لیا۔ آپس میں جھگڑنے والے دونوں لڑکے چند لمحوں میں گہرے دوست بن چکے تھے۔

۱۰۴ رصفحات پر مشتمل

راہنما

سچی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچّی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کرسکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

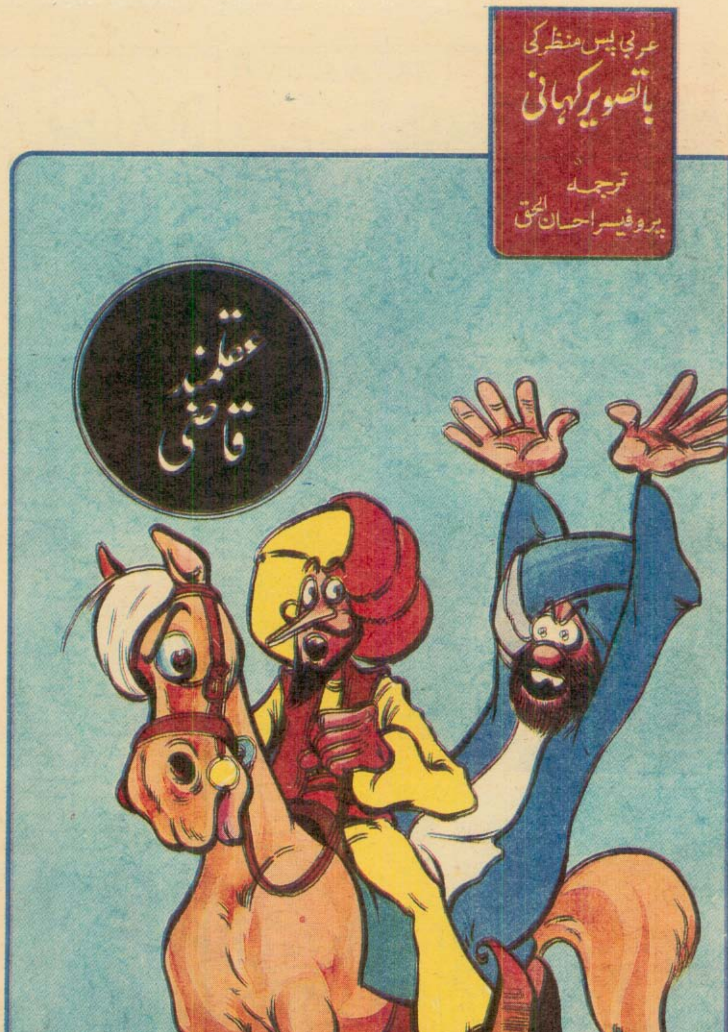
عربی پس منظر کی
باتصویر کہانی
ترجمہ
پروفیسر احسان الحق
عقلمند
قاضی

اُس جھُوٹ کی کہانی
جس نے
قاضی کے انصاف کو
آزمائش میں ڈال دیا
بادشاہ سلامت! قاضیٔ شہر کے فیصلوں سے شکایتیں بڑھ گئی ہیں
اے وزیر! اس کی مشکل یہ ہے کہ وہ نیک انسان ہے اور لوگ اُسے دھوکا دے دیتے ہیں
ہم چاہتے ہیں کہ شہر کے لیے ایک انصاف پرور قاضی کا انتخاب کریں
سب بیک آواز ہو کر! شہر تعزیب کے قاضی کا انصاف مشہور ہے۔ کیا ہم اُسے بُلا لائیں
نہیں، ہم خود بھیس بدل کر جائیں گے اور پہلے اُسے آزمائیں گے
(آواز دیتے ہوئے) اے اجنبی سوار
یہ لو اور مجھے جانے دو
مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔ براہ کرم مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر شہر تک چھوڑ دیجیے
جناب! میں آپ کا شکر گزار ہوں اتنی دُور پیدل نہیں جا سکتا تھا۔

یہ رہا بازار۔ اب آپ اُتر جائیے۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔
کیا مطلب؟ کیا تم مجھ سے میرا گھوڑا چھیننا چاہتے ہو
لوگو! مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔
اس لیٹرے کو میں نے اپنے گھوڑے پر بازار تک پہنچایا اور اب یہ اُلٹا...
یہ جھوٹا ہے۔ میں نے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر یہاں تک پہنچایا ہے
تم دونوں اپنا معاملہ قاضی کے پاس لے جاؤ۔ وہی فیصلہ کرے گا۔
تم لوگ آپس میں کیوں جھگڑ رہے ہو؟
میں نے اس شخص پر ترس کھایا اور اب یہ میرا گھوڑا چھیننا چاہتا ہے۔
یہ جھوٹ ہے گھوڑا میرا ہے
دربان! گھوڑے کو اصطبل لے جاؤ اور ہاں تم دونوں کل صبح میرے اصطبل آجانا۔ وہیں فیصلہ ہوگا۔
اگلی صبح
تم دونوں یہاں ٹھہرو۔ قاضی تمہیں باری باری بلائے گا۔

دربان ! پہلے تاجر کو بلاؤ
اے تاجر! ان گھوڑوں میں پہچانو تمہارا گھوڑا کونسا ہے؟
یہ رہا جناب !
اے شخص! بتا تیرا گھوڑا کہاں ہے؟
پیلے صاحب یہ ہے میرا گھوڑا۔
ہمارا فیصلہ ہے کہ گھوڑا تاجر کا ہے۔ سپاہی! اس جھوٹے کو جیل خانے لے جاؤ۔ ہم اسے جھوٹ کی سزا دیں گے۔
اے شخص۔ کیا تمہیں میرا فیصلہ پسند نہیں آیا
اے قاضی! میں جاننا چاہتا ہوں، آپ کو کیسے پتا چلا کہ گھوڑے کا مالک میں ہی ہوں۔
دیکھو۔ مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ تم میں سے کون گھوڑے کو پہچانتا ہے۔ میں اس پر غور کر رہا تھا کہ گھوڑا تم دونوں میں سے کسے پہچانتا ہے۔ گھوڑا تمہیں دیکھ کر آگے بڑھا جبکہ دوسرے شخص سے بدکا۔
اے قاضی! آپ بے حد عقلمند اور انصاف پرور ہیں۔ میں بادشاہ ہوں۔ اور آپ کے انصاف کو آزما رہا تھا میں آپ کو اب سارے ملک کا قاضی مقرر کرتا ہوں۔

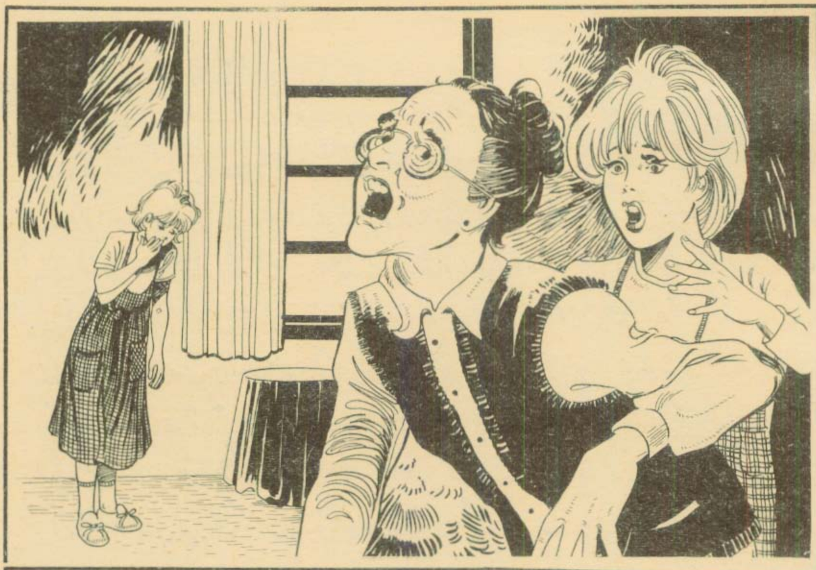

بچپن کی کہانی

حسینہ معین

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں

"بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں..."
دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا، آج جب لکھنے کو کہا گیا تو سوچا اپنی کہانی لکھ ڈالیں۔ گو کہ بچپن کی باتیں لکھنے کے لیے بہت پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا، اتنے پیچھے کہ بعض مناظر دھندلا سے گئے ہیں۔ بعض صورتیں وقت کی کہر کے پیچھے اس طرح چھپ گئی ہیں کہ پہچاننا مشکل ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی آج کی کڑی دھوپ میں کھڑے ہو کر گزرے ہوئے کل کی بات کرنا بڑا اچھا لگ رہا ہے جیسے اچانک ٹھنڈی چھاؤں میں آ گئے ہوں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ بچپن ہر ایک کا بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ نہ کوئی غم نہ فکر نہ خوف۔ ہر بچہ بڑا بہادر ہوتا ہے۔ حماقت کی حد تک بہادر، خطرناک حد تک بہادر۔ آج یہ سوچ کر حیرت ہو رہی ہے کہ پہلے ہم بھی کتنے بہادر تھے۔ نڈر، بے خوف اور انتہائی شیطان، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ

بُزدلی بڑھتی گئی (حیف افسوس)

بچپن میں سُنا ہے اماں میرے بارے میں کہتی تھیں اس لڑکی کے جسم میں بجلی بھری ہوئی ہے ایک منٹ چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کا ثبوت کچھ میری تاریخ سے ملتا ہے۔ کہ جب میں کوئی سال بھر کی تھی تو نوکر نے شام کو باغ کے بیچ میں بنے ہوئے تالاب (جس کے بیچ میں فوارہ لگا ہوا تھا) کے کنارے منڈیر پر بٹھا دیا اور خود ایک تتلی پکڑنے کو ذرا دیر کو ہٹا۔ واپسی پر مُڑ کر دیکھا تو میں غائب تھی۔ بیچارہ ہکا بکا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو اچانک تالاب کے اندر سے چیخوں کی آوازیں سُنیں، پتا چلا، میں تالاب میں تیرنا سیکھ رہی تھی۔ غڑاپ سے کپڑوں سمیت کُود گیا، نکالا گیا۔ سُنا ہے کہ صورتِ حال سنجیدہ ہوتے ہوتے بال بال بچی تھی... ورنہ آج یہ کہانی لکھنے کا موقع نہ ملتا۔ بعد میں البتہ اس نوکر کو بڑا افسوس ہوا، ہوگا کہ ناحق اس فتنے کو نکال لیا۔ کیونکہ سُنا یہ بھی گیا ہے کہ نوکر ہم سے بڑے عاجز تھے۔ تمام گڑبڑ اور شرارتیں ہم کرتے تھے اور ڈانٹ اُن کو پڑتی تھی۔ نام وہ ہمارا اس لیے نہیں لے سکتے تھے کہ بعد میں بھی اُنہیں زندہ رہنا تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس لحاظ سے میری پیدائش پر کہرام مچنا ہی چاہیئے تھا۔ کیونکہ سُنا گیا ہے کہ مجھ سے بڑی بہن کی پیدائش پر ہماری نانی جان باقاعدہ روئی تھیں۔ اور ہماری اماں کی آنکھیں کچھ پُرنم ہوگئی تھیں۔ (نتیجہ یہ ہے کہ آج تک ہماری ان بہن کو بڑی جلدی رونا آجاتا ہے۔) لیکن ہماری خوش قسمتی کہ نانی اماں کو کسی نے ڈرا دیا کہ تیسری بیٹی کے اوپر اگر بیٹا آجائے تو بڑا منحوس ہوتا ہے، گھر اُجڑ جاتا ہے۔ اس لیے جب میں آرہی تھی تو سب سہمے ہوئے تھے، نانی جان اور اماں دعائیں کر رہی تھیں کہ بس اس بار لڑکا نہ آئے۔ اس لیے جب میں آئی تو بڑا شاندار استقبال ہُوا (جیسے میں نے آکر سب کو مصیبت سے بچا لیا) خوب خوشیاں منائی گئیں اور دروغ برگردنِ راوی یہ بھی سُنا گیا ہے کہ میری پیدائش پر جمعداروں اور جمعدارنیوں نے ناچ بھی کیا تھا۔ جس کے طعنے مجھے بعد میں بھی ملتے رہے کہ ان سے ملیے ان کی پیدائش پر جمعدار، جمعدارنیاں ناچی تھیں۔ شروع میں تو میں اس بات پر بہت بُرا مانتی تھی لیکن جب عقل آگئی تو میں نے خود ہی نہایت فخر سے سب کے سامنے کہنا شروع کیا کہ ہم تو جناب وہ ہیں جس کے لیے جمعدار تک ناچے تھے (بس لفظوں کی اُلٹ پھیر ہی میں سب کچھ ہے) مجھ سے جو بڑی بہن تھیں وہ حد درجہ سیدھی اور معصوم سی

تھیں۔ انہیں گڑیا وغیرہ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ گڑیوں کے بڑے بڑے گھر بنائے جاتے تھے۔ بہت ساری گڑیاں جمع تھیں۔ شادیاں ہوتی تھیں اور مجھے گڑیاں کھیلنا سخت حماقت لگتا تھا۔ یہ بولتی تو ہیں نہیں بالکل بے کار ہیں۔ اس لیے میں ہر دوسرے تیسرے دن ان کی ایک آدھ گڑیا توڑ پھوڑ کر پھینک دیتی تھی۔ وہ بے چاری چپکے چپکے رو رو کر خاموش ہوجاتی تھیں۔ کیوں کہ دوسری صورت میں باقی گڑیوں کی بھی خیر نہیں تھی۔ دوپہر کو ہمیں سلانے کی بڑی کوشش کی جاتی، لیکن مجال ہے کہ ہم کبھی سوتے۔ جہاں نوکروں کی نظر بچی ہم کود کر باہر آجاتے، اور ساری دوپہر اُچک پھاند کرتے، شام سے پہلے آکر پھر چپ چاپ لیٹ جاتے اور سامنے سڑک پر چلنے والوں کو پتھر مارتے۔ وہ پریشان ہوتے کہ کہاں سے آیا ہے۔ مجھ سے بڑی بہن کو محلّے کے ایک پرائمری اسکول میں داخل کروایا گیا۔ کیونکہ وہ چھوٹی تھی اور دور بس میں جانے کو بالکل تیار نہیں تھی۔ ان کو داخل کیا گیا تو میں بھی مچل گئی کہ میں بھی اسکول جاؤں گی۔ امّاں نے بڑا منع کیا کہ تم ابھی چھوٹی ہو۔ اگلے سال تمہیں بھیجا جائے گا۔ لیکن میں ضد پہ آگئی اور رونا دھونا شروع کر دیا۔ ابّا نے کہا چلو ٹھیک ہے۔ بھیج دو۔ تو صبح صبح ہم بھی اسکول پہنچ گئے۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک بڑا سا بچّوں کا پارک تھا، اس کی دوسری طرف سڑک پر اسکول تھا۔ ہم بڑے خوش گلابی رنگ کی فراک اور گلابی رنگ کے ربن باندھ کر پہنچ گئے۔ اسکول کے بارے میں جو ہمارا تصور تھا وہ خاک میں مل گیا۔ مختلف کمروں میں بچے بیٹھے تھے، ٹیچرس غالباً پڑھا رہی تھیں مجھے بھی نرسری کلاس میں بٹھا دیا گیا۔ ایک سلیٹ اور رنگین چاک پکڑا دی کہ اس پر تصویر بناؤ، ابھی تصویر بنانا شروع ہی کی تھی کہ دوسری طرف بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے کوئی شرارت کی مِس نے اُسے زور سے ڈانٹا۔ میں نے دہل کر دیکھا تو بچے نے سیاہی اپنے منہ پر لگائی ہوئی تھی۔ میں نے سلیٹ اُٹھا کر بڑی زور سے بچّے کے سر پر ماری۔ شاید ایک لمحہ تو مجھے یہ سین ہضم کرنے میں لگا یا خوف کے مارے ذرا دیر کو میں جمی رہ گئی۔ پھر اچانک جیسے اسپرنگ نے اچھال دیا ہو۔ میں نے سلیٹ اور چاک دھڑ سے زمین پر پھینکا ایک چھلانگ لگائی اور تیز دوڑتی ہوئی کلاس سے نکل گئی۔ پیچھے سے مِس کی اور بچّوں کی چیخوں کی آواز آئی لیکن میں نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ ناک کی سیدھ میں چلتی چلی گئی۔ معلوم نہیں کیسے گیٹ تک پہنچی۔

چوکیدار نے روکنا چاہا لیکن میں اُس کے ہاتھوں کے نیچے سے نکل گئی۔ گیٹ سے نکل کر سڑک

پر آئی، نہ اِدھر دیکھا نہ اُدھر، بھاگتی ہوئی پارک میں گھسی ۔ اصل میں اس پارک میں کھیلنے روز شام میں آتے تھے ۔ اس لیے یہاں سے گھر تک کا راستہ یاد تھا ۔ اب یہ عالم کہ چوکیدار پیچھے پیچھے تھا اور میں آگے آگے ۔ الانگتی پھلانگتی پورا پارک طے کر گئی اور دوسرے گیٹ سے تیر کی طرح نکل گئی ۔ کافی چوڑی سڑک تھی، خدا جانے کس طرح طے کی، اور سیدھی اپنے گیٹ پر پہنچ گئی ۔ ذرا دیر بعد اماں کو پتا چلا کہ صاحبزادی بڑے طمطراق سے اسکول گئی تھیں دس منٹ بعد واپس آگئی ہیں ۔ مقدمہ ہوا ۔ سزا کے طور پر تھوڑی سی پٹائی بھی ہوئی ۔ وہ اس بات پر کہ اسکول سے اکیلی گھر کیوں آئی ۔ بہرحال، ہم نے صاف کہہ دیا کہ ہم اس اسکول میں نہیں پڑھیں گے ۔

اس کے بعد پھر اس اسکول میں مجھے نہیں بھیجا گیا بلکہ بہن کو بھی اُٹھا لیا گیا ۔ بعد میں جس اسکول میں داخل کیا گیا وہ دریا کے کنارے بہت خوبصورت جگہ پر تھا ۔ بہت بڑی عمارت ۔ لق و دق میدان، ہم بس میں بیٹھ کر جاتے تھے ۔ ہمارے ابّا بھی اس اسکول کی گورننگ باڈی میں تھے ۔ ہیڈ مسٹریس ہمیں جانتی تھیں ۔ اس لیے بس میں اکثر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیتی تھیں اور میں بڑے فخر سے اپنی ساتھیوں کو سُناتی تھی کہ آج میں صوفے پر بیٹھ کر آئی ہوں ۔

(ہیڈ مسٹریس خوب موٹی تھیں) حیرت صرف اس بات پر ہے کہ اتنی قیامت خیز شرارتیں کرنے کے باوجود میری پٹائی شاذ و نادر ہی ہوئی ۔

جب نرسری کلاس میں تھی تو ایک انگریز مس پڑھاتی تھیں، پڑھاتی اس طرح تھیں کہ ہم اُن کی گود میں بیٹھ کر پڑھتے تھے ۔ اگر اتفاق سے وہ اُتار دیتیں (بیچاری تھک بھی جاتی ہوں گی ہم موٹے بھی بہت تھے) —— تو ہم فوراً خفا ہو کے باہر باغ میں چلے جاتے ۔ درخت کے نیچے منہ پھُلا کر بیٹھ جاتے اور وہ ہمیں ڈھونڈتی ہوئی آتیں اور ہمیں پھر اُٹھا کر لے جاتیں ۔ کچھ عرصے بعد وہ چلی گئیں ۔ (پتا نہیں کیوں) ہمیں تب پتا چلا جب ایک کالی سی ٹیچر ہماری کلاس میں آئیں ۔ اس کے بعد جو فیل ہم نے مچائے ہیں وہ دیکھنے کے قابل تھے ۔ فرش پر لوٹ لوٹ کر رو رہے تھے کہ ہم اس کالی سی مس سے نہیں پڑھیں گے ۔ بعد میں پرنسپل آئیں، بہت سمجھایا بجھایا کہ تھوڑے دن بعد مس واپس آجائیں گی ۔ اس بھروسے پر چُپ ہو گئے ۔ وہ دوبارہ نہ آئیں ۔ اور ہم بھی کچھ دن بعد بہل گئے ۔ (وہ کالی والی مس بھی بری نہیں تھیں)

پہلی سنجیدہ پٹائی جو مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ کراچی آئے تو کچھ عرصے کو ایک فلیٹ میں رہے ۔

اور فلیٹ میں تو کھیلنے کودنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کبھی کبھار بھائیوں کے ساتھ نیچے جا کر کھیلنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ایک روز میں، میری بہن، میری کزن سب نیچے تماشہ دیکھ رہے تھے کہ ایک بارات گزری، لوگ دلھن کی گاڑی پر سے پیسے پھینک رہے تھے۔ ہمارا کزن بہت شیطان تھا، اس نے کہا چلو پیسے جمع کرتے ہیں۔ آئس کریم کھائیں گے۔ میں کہاں پیچھے رہنے والی تھی میں بھی بھیڑ میں گھس گئی، پتا نہیں کتنے پیسے جمع کیے پھر اُس کی آئس کریم کھاتے ہوئے اُوپر آئے۔ اماں نے پوچھا آئس کریم کہاں سے آئی تو ہم تو سمجھ رہے تھے کہ کوئی زبردست کارنامہ کیا ہے۔ ساری کہانی الف سے یے تک سُنادی توقع یہ تھی کہ اماں داد دیں گی، لیکن اماں نے پہلی بار بید اُٹھا کر سب کے ہاتھ لال کر دیے، آئس کریم پھینکوائی، توبہ کروائی کہ آئندہ کسی کے پیسے کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔ تو اس کا حشر یہ ہوا کہ آج بھی اگر سڑک پر کوئی چیز پڑی نظر آتی ہے تو گھبرا کر ہاتھ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، جن پر کچھ لال لال سے نشان اُبھرنے لگتے ہیں۔ جب آٹھویں کلاس میں تھی تو پتا چلا کہ ایک پیریڈ سلائی کا ہوگا۔ اب سلائی وغیرہ سے ہمارا میلوں دُور کا واسطہ نہیں۔ نہ کبھی سوئی پکڑی تھی، نہ اُون سلائی کو چھُوا تھا۔ مس نے کہا کل سب لڑکیاں اُون اور سلائیاں لے کر آئیں گی۔ ہم نے اماں سے ضد کر کے ایک اُون کا گولہ اور دو سلائیاں لے لیں۔ مگر جب کلاس میں پہنچے تو ایک سلائی گر چکی تھی۔ مس نے ایک سلائی کی مدد سے انگوٹھے کی مدد سے خانے ڈالنا سکھائے جو ہم نے فوراً سیکھ لیے۔ ہُوا یہ کہ پہلے دن دوسرے دن چوتھے دن اور ہم بیٹھ جاتے اور ایک سلائی پر بے شمار خانے ڈالتے۔ ایک روز مس کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے پوچھ گچھ کر لی میں نے معصومیت سے جواب دیا "اماں نے کہا ہے کہ اچھی طرح سے سیکھ لینا" "دوسری سلائی کہاں ہے؟" مس فوراً سمجھ گئیں۔ کان پکڑ کر فوراً کھڑا کیا۔ دوسرا واقعہ بھی اُسی کلاس کا ہے کہ وہی سلائی کی مس سلائی بھی کرواتیں جو ہم آرام سے گھر سے کروا کے لے آتے، لیکن ہُوا یہ کہ امتحان میں اُنھوں نے بچّے کی فراک سینے کو دے دی۔ ہمیں کیا پتا کہ بچّے کی فراک کیسے بنتی ہے۔ کاٹ کر انھوں نے دے دی۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ گھیر پر Gathering دی جاتی ہے اور GATHERING دینے کا طریقہ یہ ہے کہ دھاگہ بھر کے کھینچ لیا جاتا ہے یہ کام ہمیشہ اچھا لگا۔ ہم نے خوب دھاگہ کھینچ لیا نتیجہ یہ ہوا کہ جب فراک بن کر تیار ہوئی تو ایک سال کے بچّے کی کمر ۳ انچ کی ہو گئی۔ مس نے

ہمارا وال فراک رزلٹ والے دن پورے اسکول کو دکھایا اور باوجود اس کے کہ سیکنڈ آئے تھے خوب ڈانٹ پڑی۔

یہ چھوٹی سی کہانی ہے ان دنوں کی جب ہم بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ وقت کے ساتھ ساتھ کس وقت سدھر گئے۔ انسان غیر معمولی طور پر کچھ سے کچھ ہوتا چلا جاتا ہے، اُسے خود پتا نہیں چلتا کہ وہ بدل رہا ہے۔ جب بدل چکتا ہے تو حیران سا دیکھتا ہے۔ اپنے کو بھی زمانے کو بھی۔

دستِ شفقت کی ایسی مثال شاید آپ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو

سوانح رساں کی کہانی

نثار احمد زبیری

رات کا چور اور جمشید

امتحان سر پر آ گئے، لیکن جمشید کے روز و شب نہیں بدلے۔ اسکول امتحانات کی تیاری کے لیے بند ہوئے تو وہ ٹی وی صبح بھی پابندی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ اسکول کے لیے تو بڑی مشکل سے اُٹھتا تھا، لیکن ٹی وی کے لیے یوں اُٹھتا جیسے اُس میں چابی بھر گئی ہو۔ ٹی وی پروگرام ختم ہوتا تو وہ اخبار اُٹھا لیتا یا بچّوں کا کوئی رسالہ، اس کے بعد کوئی ناول پڑھنے لگتا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پڑ کر سو رہتا اور اُٹھتے ہی یا تو پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا۔ یا گھر سے باہر کبھی کرکٹ کبھی ہاکی، کبھی فٹ بال کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔ مغرب کے قریب واپس آ کر ٹی وی ڈرامہ دیکھتا۔ خبروں کے وقت کھانا کھاتا... اور کھانا ختم ہوتے ہی اُس کی آنکھوں میں نیند ڈیرہ جما لیتی۔

جمشید کے امی ابو سخت پریشان تھے۔ وہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ خورشید اور سیما ابھی چھوٹے تھے۔ ہر ایک والدین کی طرح اس کے امّی ابّو نے بھی بڑے خواب دیکھے تھے کہ اُن کا بیٹا بڑا ہو کر کوئی مشہور اور دولت مند آدمی بنے گا، لیکن جمشید ہر معاملے میں پھسڈی تھا۔ یہاں تک کہ وہ کسی کھیل میں بھی بہت اچھا نہیں تھا۔ ورنہ اب تو لوگ کھیل سے بھی بڑی کامیاب زندگی کا سامان کر لیتے ہیں۔ اس کے ابّو اسکول میں استاد تھے۔ لیکن جمشید کے سلسلے میں وہ

کچھ کر نہیں پار ہے تھے ۔ اُنہیں بیٹے کی طرف سے سخت پریشانی لاحق ہوگئی تھی ۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ جب بچپن میں ہی اچھی بنیاد نہیں پڑ رہی تو جمشید آگے کس طرح کوئی بڑی کامیابی حاصل کرے گا ۔

اصل میں جمشید کو سب سے زیادہ خراب جاسوسی کہانیوں نے کیا تھا ۔ وہ اپنا تقریباً سارا ہی وقت جاسوسی کہانیاں پڑھنے میں لگا دیتا تھا ۔ جب بھی اسکول کی کتاب پڑھنے کے لیے اُٹھاتا، اس کے سامنے مجرموں کے پیچھے بھاگتا ہوا کوئی جاسوس آجاتا ۔ کراٹے کے ہاتھ دکھاتا ہوا کوئی پولیس انسپکٹر یا ہیلی کاپٹر سے بھاگتا ہوا کوئی مجرم ، اسکول کی کتاب اُس کے سامنے کھلی ہوتی اور وہ صفحات کے پیچھے نہ جانے کیا کچھ دیکھ رہا ہوتا ۔ ابو اُسے کیمیکل انجینئر بنانا چاہتے تھے ۔

امی کی خواہش تھی کہ وہ بچوں کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر بنے ... وہ خود نامی گرامی جاسوس بننا چاہتا تھا، لیکن ابو یا امی سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا ۔ اُس نے کئی بار خواب میں خطرناک مجرموں کو پکڑتے یا کیفرِ کردار کو پہنچاتے دیکھا تھا خوابوں میں وہ خود کو دونوں ہاتھوں میں پستول سنبھالے موٹر سائیکل پر مجرموں کا پیچھا کرتے دیکھتا ۔ اس کی موٹر سائیکل بڑی سے بڑی رکاوٹ کے باوجود کسی بھی سڑک یا پگڈنڈی پر بغیر حادثہ کے دوڑتی چلی جاتی ... اور وہ آخرکار "مشن امپاسبل" میں پوری طرح کامیاب رہتا ۔

اُس کی بڑی تمنا تھی کہ وہ کسی بھی طرح کسی چور ڈاکو یا اسمگلر کو پکڑے ۔ وطن کے خلاف تخریب کاری کرنے والے کسی گروہ کا سراغ لگائے ۔ مشکل یہ تھی کہ وہ چھوٹا بہت تھا ۔ صرف ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا ۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ بعض باتوں پر ابھی سے ابو سے اُس کا اصولی اختلاف تھا ۔ مثلاً یہ کہ ابو جب رات کو گھر بڑی توجہ سے بند کرتے تو وہ سوچتا کہ اس کی کیا ضرورت ہے ۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی چور آجائے تو اُسے پکڑ کر اپنے جوہر دکھائے لیکن ابو اس کا موقع نہ آنے دیتے تھے ۔

اُس رات کچھ کھڑ بڑ سے اُس کی آنکھ کھُل گئی ۔ اُسے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا، لیکن یہ طے تھا کہ رات کافی گزر چکی تھی ۔ مکمل خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی ۔ جمشید نے کمرے میں آس پاس دیکھنے کی کوشش کی ۔ خورشید اور سیما قریب ہی بے خبر سو رہے تھے ۔ کمرے کے باہر کسی کے چلنے کی آواز بالکل صاف آرہی تھی ۔

کوئی اور ہوتا تو شائد ڈر جاتا، لیکن جمشید تو اندر ہی اندر کھِل اٹھا "لو بھائی جمی ... آج

کچھ کر دکھانا ہے تو دکھاؤ۔" اُس نے گویا خود سے کہا۔

وہ آہستگی کے ساتھ بستر سے نکلا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا، پھر وہ دروازے کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہوکر باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔

لاؤنج میں مکمل اندھیرا تھا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی پھر اُس نے دیکھا ایک سایہ لاؤنج میں حرکت کر رہا ہے۔ جمشید نے جاسوسی کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا کہ جب تک کامیابی کا یقین نہ ہو، چور پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ چند منٹ خاموش کھڑا سائے کو حرکت کرتا دیکھتا رہا۔ سایہ باتھ روم کی طرف کاریڈور میں غائب ہوگیا۔ اور دو تین منٹ کے بعد پھر دکھائی دیا اور لاؤنج میں سے کچھ اُٹھا کر جمشید کے برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ جس میں اُن کا بیشتر سامان وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

جمشید کو اُس لمحے اپنی اسٹک یاد آئی لیکن مشکل یہ تھی کہ اُسے کوئی چیز سنبھال کر رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اُس وقت اُسے قطعی یاد نہیں تھا کہ اسٹک کہاں رکھی ہے، لیکن اُسے بہرحال تلاش کرنی بھی تھی۔ اُس نے خاموشی سے کمرے میں آکر ادھر اُدھر ٹٹولا۔ پھر دبے پاؤں لاؤنج میں بچھی ہوئی چوکی کے نیچے ادھر اُدھر ہاتھ مارے، پھر بلی کی چال چلتا زینے کے نیچے پہنچ کر تلاش کیا۔ کمبخت اسٹک اس وقت مل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ اُسے خیال تھا کہ قیمتی وقت گزر رہا ہے۔ اسٹک کی تلاش کے دوران اُسے یہ خیال بھی آیا کہ کسی طرح ابّو امّی کو اُٹھا دے... لیکن مشکل یہ تھی کہ پھر چور پکڑنے کا لطف اُسے خود نہیں آسکتا تھا۔ پھر تو یہ ابّو کا کارنامہ شمار ہوتا۔

ایک طرف یہ اُدھیڑ بُن تھی اور دوسری طرف اسٹک، گویا روئے زمین سے کہیں پرواز کر گئی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد جب وہ اسٹور میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مار کر واپس آرہا تھا۔ تو اچانک بجلی آگئی، لاؤنج میں لگا زیرو پاور کا بلب جل اُٹھا۔ وہ جلدی سے فریج کی آڑ میں ہوگیا۔ چور شاید ابھی تک اس کے کمرے کے برابر والے کمرے میں تھا۔ کوئی آہٹ نہ پاکر وہ دبے پاؤں ماہر جاسوسوں کی طرح مختلف اشیاء کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا اور اُس کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر اندر جھانکا۔

اندر ابّو تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد، اپنے آپ سے بے خبر، اپنے چاروں طرف کے حال احوال سے بے خبر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "یا اللہ تو رب العالمین ہے، میرے علم میں اضافہ کر، میرے اہلِ خاندان کو علم سے رغبت عطا فرما۔ اس کے سوا میرا تجھ سے اور کوئی سوال نہیں"۔

جمشید کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی وہ گویا فرش میں گڑ کر رہ گیا۔

ننھے منّوں کا مشاعرہ

احمد حاطب صدیقی

کل رات اِک تقریب تھی ماموں ممانی کے یہاں
اک سُرخ سے قالین پر، منہ میں لگائے چُسنیاں
چاروں طرف سجے بے خبر، بس کیا بتاؤں کس قدر
میں شوق سے سُنتا رہا، بس یُونہی سر دُھنتا رہا
میں نے یہ سوچا، یاخُدا! آپس میں یہ کہتے ہیں کیا
آخر یہ مشکل مسئلہ اے دوستو یوں حل ہُوا

مہمان تھے گھر میں بھرے، تھیں خوب گھما گھمیاں
بیٹھے نظر آئے مجھے، دو چار مُنّے مُنّیاں
آپس میں غُوں غاں کر رہے تھے بھینچ کر وہ مُٹھیاں
لیکن سمجھ میں خاک بھی آتی نہ تھی اُن کی زباں
یُوں ہو رہی ہے دیر سے، کیا بات اُن کے درمیاں
شمّی بچاری بن گئی، اُن کی زباں کی ترجماں

کہنے لگی کونے میں جو مُنّا ہے اک رُوٹھا ہوا
یہ سُن کے اُس کے پاس کی بے بی بھی یوں بولی کہ "ہاں
گوتُو مُتو لو گول سے گڈّو نے غصّے میں کہا
"ایسا نہ ہرگز کیجیے، بس دو منٹ رو لیجیے"
"رونے کی باتیں چھوڑیے میری طرف منہ موڑیے"
"اے دوستو! ہم سب یہاں اپنے بڑوں سے ہیں الگ
"میری تو یہ تجویز ہے، ہو جائیں اپنے شعر کچھ
پپّو کی اس تجویز کی، گڈّو نے بھی تائید کی

اُس نے کہا، "کب تک بھلا بیٹھے رہیں گے ہم یہاں؟
مصروف کن باتوں میں ہیں جانے ہماری امّیاں"
جی چاہتا ہے چیخ کر سر پر اُٹھالوں آسماں!
مُنّو نے کچھ یُوں رائے دی جیسے ہو خود دادا میاں!
پپّو کہ جو چُپ چاپ تھا، اُس نے کہا یہ ناگہاں
ایسا سُنہرا پُرکشش موقع ملے گا پھر کہاں؟
کچھ دیر کو بن جائے گا سچ مچ بڑا اچھا سماں!
پھر سب کے سب بولے کہ "ہاں۔ ہو جائے۔ ہاں، ہو جائے ہاں"

پپّو یہ بولا "دوستو! کچھ شعر اپنے عرض ہیں:
یہ جو ہمارے سامنے ہر چیز کی بہتات ہے!
لیکن سُنو! اے دوستو کیسی پتے کی بات ہے
سب مل کے بولے: واہ وا! کیا بات ہے۔ کیا بات ہے"
اب حضرتِ گڈّو سے میں درخواست کرتا ہوں جناب
حضرتِ گڈّو یہ بولے: عرض کرتا ہُوں جناب!
حیران ہی رہتا ہُوں میں کس کس کو مُجھ سے پیار ہے
کس سے ملوں، کس سے بچوں، ہر شخص رشتے دار ہے

یہ کون بتلائے ہمیں کیا چیز اپنے ہات ہے
ہر چیز چکھ کر دیکھ لو، کیا ریت ہے کیا دھات ہے

"آجاؤ میری گود میں" ہر ایک کا اصرار ہے
چچّاؤں کی اک فوج ہے، خالاؤں کی بارات ہے

سب مل کے بولے: "واہ وا! کیا بات ہے۔ کیا بات ہے"
"اور اب تشریف لائیں گی یہ ــــ بے بی صاحبہ!"
"کیا منہ میں ہے؟" باجی نے یوں میری خبر فٹ فاٹ لی
ماری انہوں نے چیخ پھر، گھبرا کے اُنگلی چاٹ لی

میں نے بھی اس اک دانت سے باجی کی اُنگلی کاٹ لی
معلوم کیا اُن کو نہ تھا منہ میں مرے اک دانت ہے

سب مل کے بولے: "واہ وا! کیا بات ہے۔ کیا بات ہے"
"محترم منّو سے اب درخواست ہے:"
امّی نے یوں مجھ سے کہا: "بس تو ہی چندا ہے مرا"
غصّے میں پھر کہنے لگیں، "چندا تو گندا ہے مرا"

میں نے چھُوا جو کان تو چیخیں کہ "بُندا ہے مرا"
یُوں پیار کی بھرمار ہے، یُوں ڈانٹ کی برسات ہے

سب مل کے بولے: "واہ وا! کیا بات ہے۔ کیا بات ہے"
"یہ آنسہ مُنّی سے اب درخواست ہے:"
"عرض کرتی ہوں ــــ توجّہ کیجیے"
"فرمائیے ــــ فرمائیے ــــ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں"
اب کیا بزرگوں کو پتا، کیا ہے انگوٹھا چُوسنا
پر اُن کو جانے کیوں کھٹکتا ہے، انگوٹھا چُوسنا

ہر رنج و غم کو دُور کرتا ہے انگوٹھا چُوسنا
یہ تو ہمارے واسطے قدرت کی اک سوغات ہے!

"آخر میں اب آتے ہیں حضرت گوگگو"
"ہر صبح ابّو ہاتھ میں جھولا جھُلاتے ہیں مُجھے
دادا عجب شکلیں بنا کر گُدگُداتے ہیں مجھے

ہر شام چچّو پیٹھ کے اُوپر بٹھاتے ہیں مجھے،
کچھ اس طرح سے آج کل اپنی گزراوقات ہے

سب مل کے بولے: "واہ وا کیا بات ہے کیا بات ہے"

اور اس کے ساتھ ہی اے دوستو، آرہی ہیں اب ہماری اُمّیاں!

JAMES BALDWIN

فراز سلیم

ایک یونانی فلسفی کی کہانی

اس نے کہا تھا

دُھوپ کا راستہ نہ روکو

سکندرِ اعظم کے دورِ حکومت میں یونان میں دیوجانس کلبی نام کا ایک فلسفی رہتا تھا۔۔۔ دیوجانس کلبی یونان کی گلی گلی میں جاکر لوگوں کو بتاتا کہ اُن کی ضرورتیں کس قدر محدود ہیں اور انہیں کتنی سادگی سے زندگی گزارنی چاہیے ۔ وہ عیش وعشرت کی زندگی کو سخت ناپسند کرتا تھا ۔ زرق برق لباس اور عالیشان گھر اُس کے خیال میں غیر ضروری چیزیں تھے ۔

وہ خود گھر میں نہیں رہتا تھا ۔ اُس کی راتیں اکثر مذہبی عبادت گاہوں کے دالانوں یا گلیوں میں زمین پر سوکر گزرتی تھیں ۔ اُس کا لباس پھٹا پُرانا اور کھانا نہایت معمولی تھا ۔ اس کے باوجود وہ بہت اطمینان کی زندگی بسر کرتا تھا ۔

دیوجانس کلبی اپنی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے ہر اُس جگہ جاتا جہاں کسی کا جانا ممکن ہوسکتا تھا ۔ یونہی گھومتے پھر دیوجانس کلبی نے ایک جگہ لکڑی کا پائپ دیکھا جس کی ہیئت بالکل ایسی تھی جیسے ہمارے دور میں پانی کی لائن میں استعمال ہونے والے بڑے پائپ کی ۔ دیوجانس کلبی کئی برسوں تک اسی پائپ کو رات بسر کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ۔ دیوجانس کلبی کو جب اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے کسی دوسرے مقام پر جانا ہوتا تو وہ پائپ کو لڑھکاتا ہُوا اپنے ساتھ لے جاتا ۔ وہ اپنی دانش وارانہ باتوں کے باعث بہت جلد پورے یونان میں مشہور ہوگیا اور لوگ دُور دُور سے اُس کی تعلیمات سے فائدہ حاصل کرنے

کے لیے اُس کے پاس آنے لگے ۔ دیو جانس کلبی سے بہت سے واقعات منسوب ہیں ۔
ایک روز دیوجانس کلبی دوپہر کے وقت اپنے ہاتھ میں لالٹین لیے یونان کی گلیوں اور بازاروں میں گھوم رہا تھا ۔ وہ جگہ جگہ رُک کر اس طرح دیکھنے لگتا جیسے وہ کوئی چیز تلاش کر رہا ہو ۔ لوگوں نے دیکھا تو کسی نے اس سے پوچھا ۔
" تم دوپہر کی روشنی میں لالٹین کیوں لیے پھر رہے ہو ؟"
" میں ایک ایماندار انسان کی تلاش میں ہوں " دیوجانس کلبی نے جواب دیا ۔
جب سکندرِ اعظم نے یونان کے اُس شہر کا دورہ کیا جس میں دیوجانس کلبی نے اُن دنوں سکونت اختیار کی ہوئی تھی تو شہر کے تمام ممتاز لوگ سکندرِ اعظم کے استقبال کو پہنچے ، مگر شہر کا ممتاز ترین شخص دیوجانس کلبی ، سکندرِ اعظم کے استقبال کو نہ پہنچا ۔ سکندرِ اعظم نے استقبال کرنے والوں میں دیوجانس کلبی کی غیر موجودگی کو محسوس کیا ۔
سکندرِ اعظم کو شہر میں آئے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے ۔ مگر دیوجانس کلبی سکندرِ اعظم سے ملنے نہ گیا ۔ بالآخر سکندرِ اعظم خود دیوجانس کلبی سے ملنے کے لیے اُس کے گھر یعنی لکڑی کے پائپ پر پہنچا ۔ دیوجانس کلبی اُس وقت اپنے پائپ کے دہانے پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا ۔ سکندرِ اعظم اُس کے قریب پہنچا مگر دیوجانس کلبی نے اُس کی طرف توجہ نہ دی کیونکہ اُس وقت وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہُوا تھا ۔
سکندرِ اعظم نے یہ دیکھا تو وہ پائپ کے اتنے قریب جا کر کھڑا ہُوا کہ اُس کا سایہ دیوجانس کلبی پر پڑنے لگا ۔ سکندرِ اعظم چند لمحوں تک دیوجانس کلبی کو دیکھتا رہا ، پھر اُس نے اُس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔
" دیوجانس کلبی ، میں نے تمہاری دانش کے بارے میں بہت سُنا ہے ۔ بتاؤ ! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں ؟"
" ہاں ! برائے مہربانی پرے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ تاکہ دُھوپ مجھ تک پہنچ سکے " دیوجانس کلبی نے سکندرِ اعظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔
چونکہ دیوجانس کلبی کا جواب سکندرِ اعظم کی توقع کے خلاف تھا اس لیے اُس کو بہت تعجب ہوا ۔ لیکن اُسے غصّہ نہ آیا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ دیوجانس کلبی کا عقیدت مند ہو گیا ۔
سکندرِ اعظم واپس اپنے محل کی جانب روانہ ہوا تو اُس نے اپنے وزیروں سے کہا ۔
" تم چاہے جو کہو ... لیکن اگر میں سکندر نہ ہوتا تو میں دیوجانس کلبی ہونا پسند کرتا ۔"

تفریحی کہانی

قرۃ العین حیدر

اپریل فُول نے مغلانی امّاں کی حقیقت کھول دی

۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کی رات کو رابعہ، فاطمہ، اختر، زہرہ اور میں کھانا کھانے کے بعد صحن میں بیٹھے تجویزیں کر رہے تھے کہ کل کس کس کو کس کس طرح فُول بنائیں گے۔ فاطمہ نے کہا کہ "مُغلانی اماں کو بھی فُول بنایا جائے۔"

رابعہ کی بوڑھی انّا جنہیں ہم مُغلانی امّاں کہتے ہیں رات کو اکثر ہمیں اپنی بہادری کے قصّے سُنایا کرتی ہیں کہ جب میں فُلاں جگہ تھی تو میں نے ایک چڑیل پکڑی تھی، اور فلاں شہر میں میں نے ایک بھُوت قید کیا تھا، اور میرے دادا ابّا نے غدر کے زمانے میں کئی انگریزوں کو جو بھُوت بن گئے تھے قید کیا تھا۔ مگر ان کی ہمت ایسی ہے کہ اندھیرے میں اکیلی نہیں جا سکتیں۔ جب "برگد والے سیّد" کے مزار پر جمعرات کو ریوڑی چڑھانے جاتی ہیں تو ہمیشہ کسی کو ساتھ لے لیتی ہیں۔

اِتّفاق سے مُغلانی امّاں اُس دن اپنے بھانجے کے یہاں محلہ رکاب گنج گئی ہوئی تھیں، ہم لوگوں کو پُوری آزادی حاصل تھی، وہاں جو چاہتے کرتے۔ یکایک ہم کو ایک تدبیر سوجھی۔ ہم نے فوراً ملازم لڑکے رفاقت کو بُلا کر اُسے ایک چوَنّی دی اور کہا کہ "کسی سے کہیو مت۔ ہم جو کچھ کہیں کرتا جا۔"

باورچی خانے کے آگے ایک لمبا سا برآمدہ ہے جس کی چھت دُھوئیں سے بالکل کالی ہو گئی ہے۔ بیچ میں صحن ہے اور صحن کے دوسری طرف باورچی خانے کے سامنے مُغلانی امّاں کا کمرہ ہے۔ باورچی خانے اور مُغلانی امّاں کے کمرے کے دروازے بالکل آمنے سامنے ہیں۔

ہم نے برآمدے کی چھت کی ہر کڑی میں ایک ایک جھولا ڈلوا دیا۔ یہ چھت کافی نیچی ہے۔ پھر رفاقت سے کہا کہ "صحن کے کونے میں جو راکھ کا ڈھیر پڑا ہے اُس پر ننگے پیر خوب اچھی طرح سے ٹہل لو۔ پھر ہر جھولے پر باری باری جھولو۔ اور زور زور سے پینگیں لے کر پیر بڑھا کے چھت پر اس طرح ٹکا دو کہ پیروں کے نشان چھت پر اچھی طرح سے بَن جائیں۔"

رفاقت کو پینگیں بڑھانے اور پیڑوں پر چڑھنے کا خوب تجربہ ہے، اس نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برآمدے کی سیاہ چھت پر پیروں کے بے شمار آڑے ترچھے سفید نشان پڑ گئے۔ جیسے کوئی چھت پر اُلٹا ہو کر چلا ہو۔

ادھر ہم مزے سے شرارتیں کر رہے تھے، اُدھر گھر کے دوسرے لوگوں کو کوئی خوف نہ تھا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ ہم رات کو صحن میں بیٹھ کر امتحان کی تیاری کیا کرتے ہیں۔ مجھے ایک اور بات سوجھی، میں اور زہرہ دبے پاؤں ڈرائنگ روم میں گئے، اور وہاں سے ریڈیو سیٹ اُٹھا کر برآمدے میں لے آئے اور اُسے ایک بہت اُونچی میز پر باورچی خانے کے دروازے کے سامنے رَکھ دیا۔ مُغلانی اماں کو ریڈیو سے سخت نفرت ہے اور جب وہ بجنا شروع ہوتا ہے تو وہ فوراً چلی جاتی ہیں۔

پھر میں باورچی خانے میں سے چینی کا بڑا سا پیالہ اُٹھا لائی اور اُسے ریڈیو سیٹ پر اوندھا کر کے رَکھ دیا۔ یہ بھُوت کا سَر بن گیا۔ اس کے بعد اُسے ایک بہت بڑے سیاہ پردے سے جو سامنے کے برآمدے کے دو حصّے کرنے کے لیے لٹکا رہتا ہے۔ ڈھانپ دیا اور اُس کی سُوئی جاوا کے اسٹیشن پر لگا دی۔ جہاں سے وہاں کی زبان میں عجیب قسم کے گانے براڈ کاسٹ ہونے لگے۔ سیاہ پردے نے ریڈیو کو پیالے سے لے کر میز کے پائے تک چھُپا دیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک لمبا سا کالا بھُوت اپنی زبان میں گانے گا رہا ہے۔

اتنے میں ڈیوڑھی پر کہاروں کی آواز آئی، ہم سمجھ گئے کہ مُغلانی اماں کی ڈولی آئی ہے۔ ان کا سفید بُرقع ڈیوڑھی میں نظر آیا۔ تو ہم لوگ وہاں سے بھاگے اور جا کر گودام میں چھُپ رہے۔ جس کی کھڑکی برآمدے میں کھُلتی ہے۔ اس کھڑکی میں سے جھانکنے لگے کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ مُغلانی اماں اپنے کمرے تک پہنچ کر اس کا تالا کھول رہی تھیں۔ رفاقت غریب کو کہیں چھُپنے کی جگہ نہ ملی تو وہ ریڈیو کی میز کے نیچے گھُس گیا۔ مُغلانی اماں نے شاید اب تک گانے کی آواز نہ سُنی تھی۔ وہ ایک پیالہ لے کر باورچی خانے کی طرف چلیں۔ کیونکہ ان کی روز کی عادت ہے کہ سوتے وقت چائے

پیتی ہیں۔ان کی نظر بھوت پر پڑ گئی۔اس کے بعد کیا ہوا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔
رفاقت نے میز کے نیچے سے ہاتھ نکال کر طرح طرح کی بولیاں بولنی شروع کر دیں۔جب انہوں نے چھت کو دیکھا، تو وہاں سے بے تحاشا ڈیوڑھی کی طرف بھاگیں۔اب بارہ بج چکے تھے اور پہلی اپریل لگ گئی تھی، ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ بھاگنے میں چائے کا پیالہ ان پر آ رہا۔رفاقت نے اندر سے ریڈیو کے آواز بڑھانے والے بٹن کو پورا گھما دیا اور سُوئی جا واپر سے ہٹا دی جس سے گانے کی آواز آنی بند ہو گئی۔اور موسم کی گھڑگھڑاہٹ خوب بڑھ گئی۔
ہم دل ہی دل میں رفاقت کی عقل کی تعریف کر رہے تھے کہ مُغلانی اماں صحن سے نکل کر اس طرف پہنچیں، جہاں گھر کے دوسرے لوگوں کے پلنگ بچھے تھے۔ہم بھی اُن کے پیچھے کمروں میں سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور بالکل انجان بن کر پوچھنے لگے "کیا ہے بی اماں! ایسی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں آپ؟"
مُغلانی اماں بولیں "ہے ہے بیٹی! بھوت، بلا، چڑیل نہ جانے کیا؟"
اختر جلدی سے بولی "تو بی اماں اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، آپ تو کئی مرتبہ بھوت پکڑ چکی ہیں۔اسے بھی پکڑ لیجیے۔ہم دیکھیں گے کہ بھوت کیسا ہوا کرتا ہے۔"
یہ سُن کر مغلانی اماں ذرا ہچکچائیں، ہم سب اُن کے سَر ہو گئے کہ "اُسے قید کر لیجیے۔اُسے قید کر لیجیے۔ہم بھوت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"
مغلانی اماں بولیں "پکڑ تو لوں بیٹی! کیا مشکل کام ہے مگر وہ آیت مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہی۔جس سے بھوت بس میں ہو جاتا ہے۔میرے پاس ایک تعویز بھی تھا جو پیر جی نے مجھے دیا تھا۔اس سے بھوت قید ہو جاتا ہے، مگر وہ نہ جانے کہاں گُم ہو گیا۔"
آخر سب، کوئی ہاکی لے کر کوئی ٹارچ لے کر برآمدے میں پہنچے لیکن بھوت کے قریب جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔مُغلانی اماں بولیں "دیکھئے یہ غصّے میں چنگھاڑ رہا ہے۔"
گھڑگھڑ کی آواز سُن کر سب اصل بات سمجھ گئے اور ہنستے ہوئے واپس ہوئے۔مغلانی اماں بھلا اب کیسے سو سکتی تھیں، خیر اُنہیں بڑی مشکل سے چارپائی پر بھیجا گیا، اور ہم لوگ "اپریل فول" کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔
مگر وہ دن اور آج کا دن۔مُغلانی اماں جب اس برآمدے میں قدم رکھتی ہیں تو آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور چھت کی طرف تو انہوں نے پھر کے دیکھا ہی نہیں۔

زندگی اے زندگی

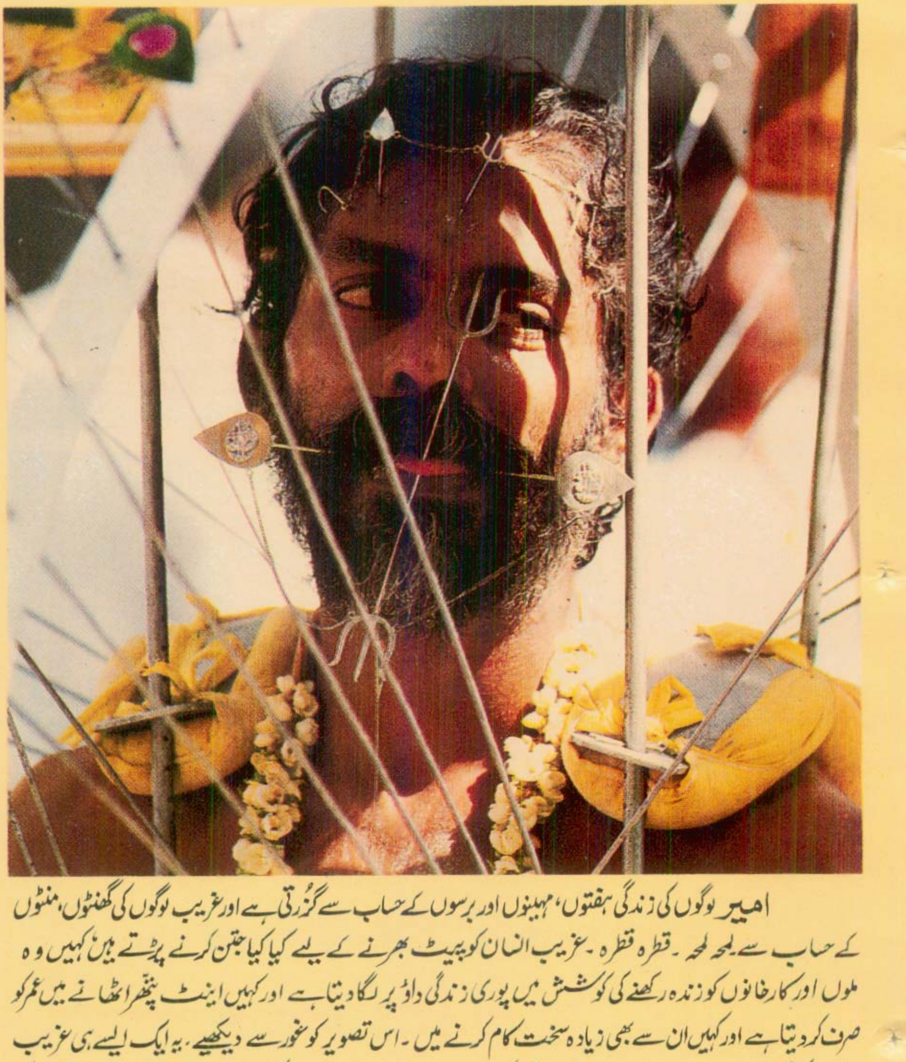

امیر لوگوں کی زندگی ہفتوں، مہینوں اور برسوں کے حساب سے گزرتی ہے اور غریب لوگوں کی گھنٹوں، منٹوں کے حساب سے۔ لمحہ لمحہ۔ قطرہ قطرہ۔ غریب انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں؛ کہیں وہ ملوں اور کارخانوں کو زندہ رکھنے کی کوشش میں پوری زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے اور کہیں اینٹ پتھر اٹھانے میں عمر کو صرف کر دیتا ہے اور کہیں ان سے بھی زیادہ سخت کام کرنے میں۔ اس تصویر کو غور سے دیکھیے۔ یہ ایک ایسے ہی غریب انسان کی تصویر ہے جسے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ہر روز کئی بار اپنی زبان، اپنے ماتھے اور جسم کے کئی حصوں کو تیروں سے چھیدنا پڑتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے اس کا عمل تماشے کا درجہ رکھتا ہے۔ دلچسپ تماشے کا۔

۲۰ ویں صدی کے اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی انسانوں کو دلچسپی کا سامان مہیا کرنے والے ایسے نظارے ہر حساس دل انسان کے لیے تکلیف کا باعث ہونے چاہئیں۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

ADARTS

Scannor AFI-2/86

خوف ناک کہانی

یہ اس بیَد کی کہانی

ہے جس نے پچیّس سال تک ڈاکٹر جمیل جالبی کا پیچھا کیا

وہ ایک تاریک برفانی اور خوفناک رات تھی ۔ شام کو گھر کر بادل آئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی اور گرج چمک کے ساتھ اولے پڑنے لگے ۔

تیز برفانی ہوائیں جسم کے پار ہو جاتی تھیں ۔ شام ہی سے سڑکیں سنسان ہوگئی تھیں ۔ دُور دُور تک نہ آدم نظر آتا تھا نہ آدم زاد ۔ تیز ہوا سے پیڑ ہل رہے تھے ، جن کی سائیں سائیں سے وحشت میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔

میں نے شام ہی سے آتشدان میں آگ جلا دی اور لحاف میں گھُس کر بیٹھ گیا "چھُن چھُن" والے واقعے کے بعد سے ہمارا بوڑھا ملازم مظہر بابا میرے ساتھ کمرے میں سونے لگا تھا ۔ بابا ابھی عشار کی نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے نیند آنے لگی ۔ میں نے کتاب بند کی ، لحاف سر تک تان لیا اور سو گیا ۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے چند گھنٹے گزرے ہوں گے کہ باہر سے کُنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سے میری آنکھ کھُل گئی ۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ کُنڈی شاید

تیز ہَوا سے ہِل رہی ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے لگا کہ جیسے باہر کوئی ہے اور زور زور سے کُنڈی بجا رہا ہے ۔ پہلے رُک رُک کر اور پھر اس کے بعد جو اُس نے زور زور سے کُنڈی بجانی شروع کی تو معلوم ہوتا تھا کہ کُنڈی چند جھٹکوں میں ہاتھ میں آجائے گی ۔ میں دَم سادھے پڑا رہا ۔ خوف کے جال نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ۔ بابا اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کھنکھارنے لگا۔ پھر آواز دی ۔

" کون ہے ؟"

بابا کی آواز کے ساتھ ہی کُنڈی کی آواز بند ہوگئی اور دروازے پر بید مارنے کی آواز آنے لگی۔ بابا اُٹھا ۔ دروازے کی طرف بڑھا ، پھر آواز دی " کون ہے ؟" اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا ۔ دروازہ کھُلتے ہی تیز ہَوا زنّاٹے کے ساتھ اندر داخل ہوئی ۔ ذرا سی دیر میں کمرہ ہَوا سے بھر گیا ۔ پھر یہ ہُوا کہ ایک چیختی چلاّتی آواز کے ساتھ ہَوا بگولے کی طرح سارے کمرے میں چکّر کاٹنے لگی اور پھر ایک دَم سے ایسے نکل گئی جیسے غبارے میں سے ہَوا نکل جاتی ہے۔ چند لمحوں کی اس ہَوا نے کمرے کی ہر چیز کو اُلٹ پَلٹ کر دیا ۔ گلدان زمین پر گر پڑا ۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر دھڑام سے زمین پر آگری ۔ ہَوا کے نِکلتے ہی مظہر بابا نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور پھر آواز دی ۔

" کون ہے ؟"

لیکن کوئی جواب نہیں آیا ۔ کچھ دیر بابا کھڑا رہا ، پھر آکر پلنگ پر لیٹ گیا ۔ مجھے آواز دی ۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ اسی طرح چُپ چاپ دَم سادھے پڑا رہا ۔ میں نے محسوس کیا کہ بابا کچھ پڑھ رہا ہے ۔ پھر اس نے تین تالیاں بجائیں اور کچھ ہی دیر بعد خرّاٹے لینے لگا ۔ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور پھر نہ معلوم کب میری آنکھ لگ گئی ۔ اس واقعے نے کئی دن تک مجھے پریشان کیے رکھا ۔ بابا نے بتایا کہ یہ بدروحیں ہوتی ہیں جو ویران راتوں میں بستی والوں کو پریشان کرنے آنکلتی ہیں ۔

اس واقعے کے کوئی تین ہفتے بعد میں رات کو ہوسٹل سے گھر آرہا تھا ۔ عشار کا وقت ہوگیا ۔ سلیم احمد پھاٹک تک میرے ساتھ آئے ۔ پنواڑی کی دکان سے سگریٹ خریدا اور مجھے خُدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے ۔ میں سائیکل پر سوار ہُوا اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا ۔ سڑک پر بجلی کے کھمبے روشن تھے ، لیکن کُہر نے اُن کی روشنی کو کم کرکے سائے کا سا احساس پیدا کر دیا تھا ۔ کبھی کبھار کوئی آدمی گزرتا تو سڑک کی ویرانی کَم ہو جاتی اور جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوتا ، سڑک بھائیں بھائیں کرنے لگتی ۔ ابھی میں تھوڑی دُور ہی گیا ہوں گا کہ میں نے دیکھا کہ مجھ سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر کوئی آدمی بید ہاتھ میں لیے میری طرف آرہا ہے ۔ بید اور ہاتھ تو مجھے صاف نظر آرہے تھے ، لیکن آدمی صاف نظر نہیں آرہا تھا ۔ میں سڑک پر بائیں طرف کو چل رہا تھا اور وہ بید اور ہاتھ

اُسی طرف سامنے سے آ رہا تھا۔ میں نے سائیکل کو اور بائیں طرف کر دیا۔ بید اور ہاتھ بھی اُسی طرف کو ہوگئے۔ میں گھبرا گیا اور سائیکل کو جلدی سے ہوسٹل کی طرف موڑ دیا۔ ابھی میں مُڑا ہی تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی کیریئر کو پکڑ کر سائیکل اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں نے آگے بڑھنے کے لیے زور لگایا، لیکن سائیکل ایک اِنچ آگے نہ بڑھ سکی اور میں دھڑسے مع سائیکل زمین پر گر پڑا۔ چھُن چھُن چھُن چھُن کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔ یہ آواز سُنتے ہی میں اتنی زور سے چیخا کہ پاس کی کوٹھیوں سے کئی آدمی نکل آئے۔ میں نیم مُردہ حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ لوگوں نے مجھے اُٹھایا اور حال دریافت کیا۔ میں نے مَری ہوئی آواز میں سارا حال بتایا، لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا اور بتایا یہ تو خان صاحب کا بیٹا ہے۔ خوف سے میرا بُرا حال تھا۔ وہ آدمی مجھے گھر تک پہنچا آئے۔ میں ایک ہفتہ پلنگ پر پڑا رہا۔ جھاڑ پھُونک، تعویز گنڈے، ڈاکٹر حکیم سب کچھ ہُوا۔ رفتہ رفتہ اس خوف کا اثر کسی حد تک کم ہوا۔ اب میں نے مغرب کے بعد گھر سے نِکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اگر جاتا بھی تھا تو کسی کو اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا۔ اندھیرے میں جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا۔ رات کو سوتے سوتے چونک پڑتا تھا۔ چھُن چھُن کی آواز اکثر میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔

ایک دن صبح ۸ بجے کلاس تھی۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی، اس لیے تیزی سے سائیکل پر جا رہا تھا۔ کالج کے احاطہ میں داخل ہوکر میں نے جلد پہنچنے کے خیال سے پگڈنڈی کا راستہ اختیار کر لیا۔ پیدل آنے جانے والے عام طور پر اسی راستے سے آتے جاتے تھے۔ بائیں طرف ایک اِملی کا بڑا سا درخت تھا۔ ابھی میں اس درخت سے کچھ فاصلے پر تھا کہ دھم سے ایک آدمی درخت پر سے کُودا۔ اس کے جسم پر سے سر غائب تھا۔ وہی بید اس کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ دُور میرے آگے آگے چلا اور پھر غائب ہوگیا۔ میں نے وہیں سے سائیکل موڑ دی اور پکی سڑک پر آگیا۔ سائیکل اسٹینڈ پر سائیکل کھڑی کی اور سیدھا کلاس میں چلا گیا۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں پسینے سے شرابور تھا اور دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔

اس واقعے کے دو چار دن بعد کی بات ہے کہ میں کالج لائبریری کی کتابیں واپس کرنے اوپر کی منزل پر گیا۔ کاؤنٹر کے قریب کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک بہت ہی بھدّی شکل کا لڑکا میرے پیچھے کھڑا ہے۔ دو کتابیں اس کے اُلٹے ہاتھ میں تھیں اور —— اور وہی بید اس کے سیدھے ہاتھ میں تھی۔ میں بید دیکھ کر ایک دَم گھبرا گیا اور بغیر کتابیں واپس کیے جلدی سے نیچے آگیا۔ پھر یہ حالت ہوگئی کہ میں اکیلا، نہ دن میں نہ رات میں، کہیں نہ جاتا تھا۔ کالج بھی ایک دوست کے ساتھ جاتا اور ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جاتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا۔ شام کا نکلنا بالکل بند ہوگیا۔ ایک خوف ہر وقت سائے کی طرح میرے

ساتھ رہتا۔ اس کے بعد پھر کوئی واقعہ میرے ساتھ پیش نہیں آیا اور دو سال گزر گئے۔ اس عرصے میں میں اس واقعہ کو بڑی حد تک بھول چکا تھا۔ ایک دن رات کو دس بجے کے قریب میرے ہم جماعت اور عزیز دوست انور عالم صدیقی آئے اور کہنے لگے کہ "رات زیادہ ہوگئی ہے سینما سے آرہا ہوں۔ اگر اکیلا جاؤں گا تو والد صاحب ناراض ہوں گے۔ تم چلو، یہ بہانہ بنائیں گے کہ میں تمہارے ہاں تھا اور ساتھ پڑھ رہا تھا۔" ہم دونوں سائیکل پر بیٹھ کر چلے۔ انور کو اس کے گھر چھوڑا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا۔ گھر کے قریب پہنچا تو پہلے ایک پہیئے کی ہوا نکل گئی اور پھر فوراً ہی دوسرے پہیئے کی ہوا بھی نکل گئی۔ میں جلدی سے سائیکل پر سے اُترا اور سائیکل کو ہاتھ میں پکڑ کر گھر کی طرف چلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میری سائیکل کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے میں نے اُسے آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے اندازہ ہُوا کہ اب سائیکل گرفت سے آزاد ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے۔ میں نے سائیکل کو جیسے ہی آگے بڑھایا۔ اتنے میں کسی نے بید کی مُوٹھ میری گردن میں ڈال کر مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ میں زور زور سے چیخنے لگا۔ میری چیخیں سُن کر آس پاس کے لوگ باہر نکل آئے۔ لوگوں کے آتے ہی بید میری گردن سے ہٹ گئی۔ میں چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ لوگوں نے سہارا دے کر مجھے اُٹھایا اور گھر تک پہنچا دیا۔ اس دن کے بعد سے میں نے وہ کمرہ چھوڑ دیا۔ اوپر کی منزل پر اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا اور ہندو مُسلم فسادات کی آگ پورے مُلک میں بھڑک رہی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں مَیں پاکستان آگیا اور تقریباً دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر "ساقی" سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی اور رفتہ رفتہ میرے تعلقات ان سے اتنے بڑھے کہ یا تو وہ روزانہ میرے ہاں آتے یا میں اُن کے ہاں جاتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے سے فاصلے پر پیر الٰہی بخش کالونی کراچی میں رہتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی کے دو محبوب مشغلے تھے۔ ایک ادب اور دوسرا موسیقی۔ مہینے میں ایک آدھ بار ان کے ہاں گانے کی بڑی محفل جمتی۔ ہفتہ کا دن تھا اور شاہد صاحب کے ہاں استاد چاند خاں کے اعزاز میں دعوت تھی اور اس کے بعد گانا بجانا۔ رات کے تین بجے کے قریب محفل ختم ہوئی اور ہم سب لوگ رخصت ہو کر گھر سے باہر آئے، تو ان کے گھر کے سامنے برگد کے بہت بڑے اور پُرانے درخت پر لاکھوں کی تعداد میں جگنو چمک رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سب بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن شام کو جب میں شاہد صاحب کے ہاں گیا، تو میں نے دیکھا کہ برگد کا سارا پیڑ جل کر کوئلہ بن گیا ہے اور صرف تنا اور چند لُنڈ مُنڈ شاخیں باقی رہ گئی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے بتایا کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ اس درخت میں آگ کب اور کیسے لگی اور کیسے بجھی۔ صبح کو جب ہم سو کر اُٹھے اور گھروں سے باہر نکلے، تو درخت کوئلہ بنا کھڑا تھا۔ برسوں اس درخت کی یہی حالت رہی۔ پھر یہ دوبارہ پھُوٹا اور پہلے برگد کے مقابلے میں دسواں

حصّہ آج بھی شاہد احمد دہلوی کے گھر کے سامنے موجود ہے۔ جس کے سائے میں اکثر لوگ گرمیوں کی دوپہر میں پلنگ ڈال کر سوئے یا لیٹے رہتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں شاہد صاحب کے گھر سے واپس آ رہا تھا کہ دیکھا اسی برگد پر ایک آدمی پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔ سر اُٹھا کر اوپر دیکھا تو جسم سے سَر غائب تھا اور —— اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہی بید برابر کی شاخ پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے شاہد صاحب کے گھر آیا۔ اور شاہد صاحب کو کھڑکی میں سے بغیر سَر کے آدمی اور لٹکی ہوئی بید کو دکھایا۔ وہ پیر لٹکائے اُسی طرح بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر شاہد صاحب بھی خوفزدہ ہو گئے۔ پھر ہم دونوں باہر آئے، لیکن وہاں نہ وہ آدمی تھا اور نہ بید۔ شاہد صاحب نے اس واقعے کا ذکر اپنے بیوی بچّوں سے اس لیے نہیں کیا کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگیں گے اور اشرف صبوحی صاحب کے بھائی وصی اشرف صاحب سے سارے گھر کو کلوا دیا۔

ایک دن شاہد صاحب نے بتایا کہ رات کو تین بجے کے قریب اس درخت سے عجیب و غریب ڈراؤنی آوازیں آتی رہی ہیں، جیسے کوئی کسی کا گلا گھونٹ رہا ہو جیسے دو آدمی ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہوں۔ ایک بھاگ دوڑ سی سارے درخت پر ہوتی رہی ہے۔ سارا درخت چرچرا تا رہا ہے۔ ان آوازوں کو سُن کر محلّے والے گھروں سے باہر نکل آئے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گلیوں میں روشنی نہیں تھی۔ اماوس کی رات تھی۔ ٹارچ سے درخت پر روشنی ڈالی، لیکن درخت اُسی طرح چرچرا تا رہا۔ اُسی طرح آوازیں آتی رہیں، لیکن نظر کچھ نہ آیا۔ کچھ دیر بعد وہ آوازیں بند ہو گئیں۔ اس واقعے نے سارے محلّے کو دہشت زدہ کر دیا۔

اس واقعے کے کئی سال بعد میں کھانا کھا کر ٹہلنے کے لیے نکلا۔ اب میں اپنے بھائی ڈاکٹر عقیل کے ساتھ شمالی ناظم آباد میں رہتا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے پُل کے پاس پہنچا اور وہاں سے اقبال ٹاؤن جانے والی سڑک کے فٹ پاتھ پر ہو لیا۔ کچھ دُور چلا ہوں گا کہ ایک پتھر میرے سامنے آ کر گرا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں سمجھا کہ کسی بچے نے پتھر پھینکا ہو گا جو اتفاق سے یہاں آ کر گرا ہے۔ ابھی میں دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ ایک اور پتھر پہلے سے بھی زیادہ قریب میرے سامنے آ کر گرا۔ میں نے پھر مُڑ کر دیکھا۔ مجھے دائیں بائیں آگے پیچھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں پھر آگے بڑھا۔ اب ایک پتھر اور آ کر گرا۔ اس کے بعد پتھر آنے کی رفتار بڑھ گئی۔ میں تیزی سے آگے کی طرف بھاگا۔ پتھر پیچھے کی طرف سے آ رہے تھے۔ چند سو گز چلنے کے بعد بائیں طرف کی سڑک پر مُڑ گیا جس پر ابنِ انشاء رہتے ہیں۔ ان کے گھر پہنچا۔ دروازے پر دستک دی کہ اتنے میں ایک اور پتھر میرے قریب آ کر گرا اور پھر جتنی دیر میں ان کے گھر میں سے کوئی آ کر دیکھتا کہ کون آیا ہے، پتھر میرے قریب آ آ کر گرتے رہے۔ اتنے میں دروازہ کھُلا اور ابنِ انشا باہر نکلے اور مجھے اندر لے گئے۔ بہت دیر اُن سے باتیں کرتا رہا اور پھر جب وہ مجھے چھوڑنے

دروازے پر آئے، تو میں نے اُن سے کہا کہ بھئی انشا ذرا پُل تک میرے ساتھ چلیے۔ ابنِ انشا پُل تک میرے ساتھ آئے اور پھر خدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے۔ میں بڑی سڑک سے چل کر اپنے گھر واپس آگیا۔ دو تین دن کے بعد اخباروں میں پڑھا کہ کئی رات سے ابنِ انشا کے گھر پر پتھر آرہے ہیں۔ پولیس کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ پتھر کون پھینک رہا ہے۔ پتھر کہاں سے آرہے ہیں اور کیوں آرہے ہیں۔ تقریباً ایک ہفتہ تک اخباروں میں اس عجیب وغریب حیرت ناک واقعے کا چرچا رہا اور پتھر مسلسل اُسی طرح آتے رہے، پھر خود ہی اچانک بند ہوگئے۔ اس واقعے سے ابنِ انشا کے دِل پر کیا گزری وہ جانتے ہوں گے، میں خاصا پریشان ہوا۔

تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں اور میری بیوی رات کو بارہ بجے کے قریب سینما سے واپس ہوئے۔ بھوک سخت لگی ہوئی تھی۔ سوچا کہ کھانا باہر ہی کھا لیا جائے۔ بندر روڈ کراچی پر ہوٹل شیراز گئے جو رات کے دو بجے تک کھلا رہتا ہے اور کار میں بیٹھے بیٹھے ہی کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران فقیر پر فقیر آتے رہے۔ ابھی ہم ہاتھ دھو رہے تھے کہ ایک آدمی، جو سامنے کی دکان کی سیڑھیوں پر گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا، ہمارے پاس آیا اور میری بیوی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"بیگم صاحب میں بہت غریب آدمی ہوں۔ فقیر نہیں ہوں حالات کا مارا ہوا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا آپ مجھ سے یہ خرید لیجیے" یہ کہہ کر اُس نے بید میری بیوی کی طرف بڑھا دی۔ میں نے بید دیکھی تو سناٹے میں آگیا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ "اُسے دس روپے دے دو"۔ بیوی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے پھر اصرار کیا کہ "اُسے دس روپے دے دو"۔ جلدی سے بیوی نے اُسے دس روپے دے دیے اور بید کو پیچھے کی سیٹ پر ڈال دیا۔ بل ادا کر کے ہم فوراً وہاں سے چل دیے۔ مجھے ہر دم یہ خیال ستا رہا تھا کہ یہ بید پھر کہیں کوئی اور نئی مصیبت نہ لائے۔ کہیں انگڑائی لے کر جاگ نہ جائے اور ہم پر حملہ نہ کردے۔ راستے میں میری بیوی مجھ سے سوال پر سوال کرتی رہیں، میں خاموش تھا۔ میں نے جھلا کر صرف اتنا کہا "خدا کے واسطے چُپ ہو جاؤ، میں گھر جا کر بتاؤں گا"۔ گزشتہ پچیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے میرے سامنے آرہے تھے اور خوف مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر پسینے کی شکل میں پیشانی سے بہہ رہا تھا۔

اس کے بعد پھر کوئی واقعہ میرے ساتھ پیش نہیں آیا۔ وہ بید آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ لیکن اسے استعمال کرنے کی میں نے آج تک ہمت نہیں کی ہے۔ ایک بڑے صندوق میں لحافوں کے نیچے برسوں سے دبی پڑی ہے۔ اب "بھیا" بھی اس دُنیا میں نہیں ہیں کہ یہ بید میں اُن کو واپس کر دوں کہ اُن کے باپ کی نشانی تھی۔ اور جو مرتے دم تک چچا میاں سے اس بید کے کھو جانے کی وجہ سے ناراض رہے۔

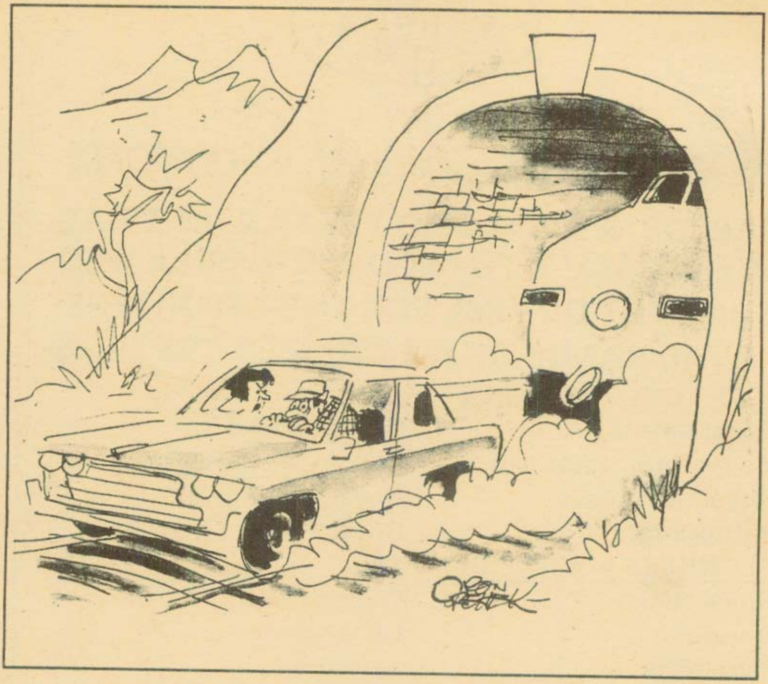

شارٹ کٹ کا انجام

کیا ڈکی کا دروازہ کھل گیا

SABCOS

Creators of Royal Comforts

SABCOS. SPECIALIZED TEXTILE UNIT HAS THE CAPACITY TO PRODUCE IN BULK AND SHIPMENT ON TIME FOR THE EXPORTERS

ROYAL RANGE OF SPECIALIZED TEXTILES

100% COTTON TOWELS:

Royal Velour
Royal Terry (Jacquard)
Royal Uni Colour
institutional;

BLANKETS ACCRYLIC:

Royal Mink
Royal Fur
Plush Mink.

BLANKETS WOOLEN:

Commercial
Institutional
Army
Woolen Fabrics

COTTON BLANKET:

Cellular
Royal Cotton Blanket

BED COVERS.

ROYAL PLUSH MINK

Royal Velour
Royal Terry
AND
Prayers Rugs
Upholstery
Velvets
Carpets Etc.
BATH ROBES 100% Cotton
(Shawl Colar, Kimano Style)

BABY PRODUCT

Royal Baby Sets.
Royal Baby Blankets.
Royal Baby Bath Robes.
Royal Baby Towelets.

SABCOS (Pvt.) LTD.

A/12, S.I.T.E. Karachi, Pakistan
Phones: 295877, 295334, 295333,
Telex: 24293 JAMAL PK, Cable: TAJBAWA

کلیم چغتائی

وعدہ

ایک واقعے نے
رشی میاں کی زندگی کو
بدل کر رکھ دیا

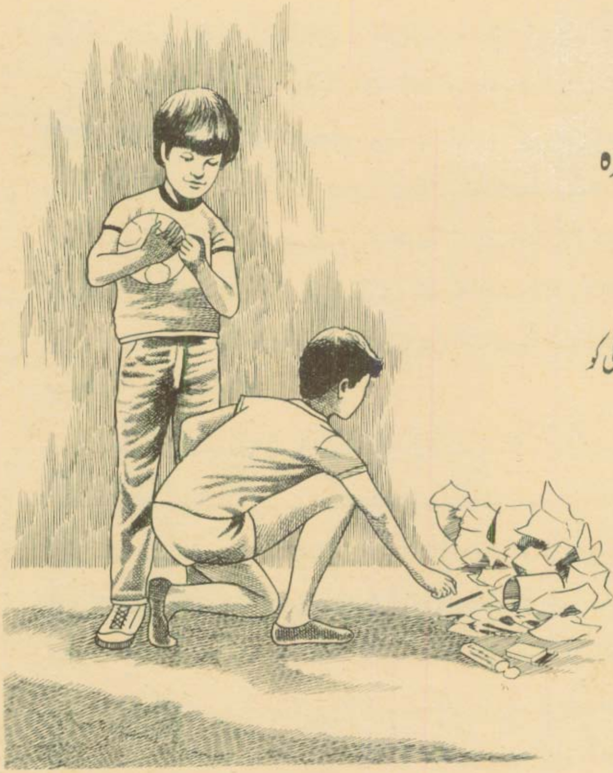

رشی میاں اگر اپنی امی اور ابو کے لاڈلے نہ ہوتے تو روزانہ اچھی طرح پڑھتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے ہی لاپرواہ قسم کے لڑکے تھے۔ نہ انہیں اپنی کاپیوں کا ہوش رہتا تھا نہ پینسل کا۔ ربر کہیں تو کتابیں کہیں۔ ان کی چیزیں ضرورت کے وقت ہمیشہ اِدھر اُدھر غائب ہوجاتیں۔ پھر تلاش شروع ہوتی تو جوتے کیاری میں ملتے۔ بستہ پرانے جوتوں میں دھرا ہوتا اور ٹوپی میز کے نیچے سجی ہوئی دکھائی دیتی۔ ان کی امی نے انہیں کئی بار سمجھایا کہ دیکھو بیٹے اچھے بچے اپنی چیزیں سنبھال کے رکھتے ہیں لیکن رشی میاں کو اچھا بچہ بننے سے شاید کوئی دلچسپی نہ تھی۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ رشی میاں کی امی نے ان کو انعام کا لالچ دیا اور وعدہ کیا کہ اگر رشی میاں سارا دن اپنی چیزیں سنبھال کر رکھیں گے تو امی انہیں دس روپے دیں گی۔ اور وہ ان دس روپوں سے اپنی مرضی کی چیزیں خرید سکیں گے۔ آئس کریم، کوئی کھلونا یا کوئی کتاب، لیکن وہ رشی میاں ہی کیا جو مان جائیں۔ وہ جان چھڑانے کے لیے تو امی سے وعدہ کر لیتے کہ امی اب آئندہ سے تمام چیزیں سنبھال کر رکھوں گا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اپنا وعدہ بھی دوسری چیزوں کی طرح کہیں

رکھ کر بھول جاتے اور پہلے کی طرح ان کی چیزیں زمین پر، میز کے نیچے اور کیاریوں میں گھومتی نظر آنے لگتیں۔

رشی میاں کا اصل نام تو رشید انور تھا لیکن امی اور ابو انہیں پیار سے رشی رشی کہتے تھے۔ ان کے ابو دواؤں کی ایک بڑی کمپنی میں بہت بڑے افسر تھے اس لیے گھر میں پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ دو دو کاریں کھڑی رہتیں۔ فریج مزے مزے کی چیزوں سے بھرا رہتا۔ کپڑوں کی الماریوں میں کپڑوں کے ڈھیر لگے رہتے اور کھلونوں کی الماری میں قسم قسم کے کھلونے نظر آتے۔ رشی میاں جب چاہتے کوئی سا کھلونا نکال لیتے۔ تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد ان کا جی اُکتا جاتا تو وہ کھلونے کو اس کی صحیح جگہ یعنی کھلونوں کی الماری میں رکھنے کے بجائے ادھر ادھر پھینک دیتے اور کسی کے پیروں کے نیچے آکر وہ کھلونا ٹوٹ جاتا۔ ان دنوں رشی میاں پانچویں جماعت میں تھے لیکن ان کا دل پڑھائی سے زیادہ کھیل کود میں لگتا تھا۔

ہر چند دنوں کے بعد رشی میاں کی امی نوکر کو بازار بھیج کر درجن بھر پنسلیں، قلم، ربر، اسکیل اور کاپیاں منگواتیں لیکن ایسا لگتا تھا جیسے رشی میاں پنسلیں، ربر، اسکیل اور کاپیاں کھا جاتے ہوں۔ ہر چند دن بعد امی ان کے بستے کی تلاشی لیتیں۔ تو پتا چلتا کہ پنسل نہیں ہے یا ربر غائب ہے یا اسکیل ٹوٹا ہوا ہے۔ دراصل رشی میاں ایک تو تھے ہی بڑے لاپرواہ پھر گھر میں پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اس لیے وہ اور بھی زیادہ لاپرواہ ہو گئے تھے۔ ان کو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی بھی چیز اگر کھو گئی تو امی اور منگوا دیں گی اور یہی ہوتا کہ امی اور منگوا دیتیں لیکن ہر بار انھیں ڈانٹ ضرور پڑتی۔ رشی میاں ابو کے ذرا زیادہ لاڈلے تھے اس لیے ابو ہمیشہ ان کی طرفداری کرتے۔ امی البتہ ابو سے ہمیشہ کہتیں: "آپ کے لاڈ پیار نے رشی کو بگاڑ دیا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ پیسہ کتنی مشکل سے کمایا جاتا ہے۔ نوٹ کوئی درختوں پر تو نہیں لگے ہوتے:" لیکن ابو ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ "بچّہ ہے، بڑا ہوگا تو خود ہی سمجھ آجائے گی۔"

ایک دن رشی میاں اپنا فٹ بال لے کر گھر کے سامنے والے میدان میں دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے نکل گئے۔ واپسی پر انہوں نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو دیکھا جو میدان کے کونے میں پڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر پر جھکا ہوا کچھ تلاش کر رہا تھا۔ وہ یوں ہی دیکھنے کے لیے رُک گئے کہ لڑکا آخر کیا ڈھونڈ رہا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ لڑکے کے گھر والوں کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہے جسے تلاش کرنے کے لیے گھر والوں نے اسے بھیجا ہے، لیکن رشی میاں نے غور سے دیکھا تو لڑکے کا لباس پرانا سا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ شاید یہ لڑکا کسی گھر میں نوکر ہے اور ممکن ہے کہ کوڑے کے ساتھ گھر کا کوئی چمچہ یا کوئی اور چیز غلطی سے پھینک دی گئی ہو جسے تلاش کرنے کے لیے گھر والوں نے اس لڑکے کو بھیجا ہو۔

تھوڑا سا آگے بڑھنے پر رشی میاں نے دیکھا کہ لڑکے کے کپڑوں میں ایک دو پیوند بھی لگے ہوئے ہیں اور اس

کے پیروں میں ٹوٹی ہوئی چپل ہے۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ لڑکا ضرور، کوڑے میں سے کاغذ، ٹین کے ڈبے اور بوتلیں جمع کرکے کباڑیوں کے ہاتھ بیچتا ہوگا۔ لیکن جب وہ اس لڑکے کے قریب پہنچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ لڑکے کے ہاتھ میں پینسلوں کے دو تین ٹکڑے اور ربر کا ایک ٹکڑا ہے اور وہ کوڑے کے ڈھیر پر جھکا ہوا ایک لکڑی سے کوڑے کو کرید رہا تھا۔ شاید اُسے امید تھی کہ کوڑے میں اُسے اور پینسلیں مل جائیں گی۔

رشی میاں سے رہا نہ گیا، وہ زور سے بولے "کیا ڈھونڈ رہے ہو بھئی" لڑکا جو کوڑے کے ڈھیر کو کریدنے میں مصروف تھا۔ اچانک رشی میاں کی آواز سُنتے ہی گھبرا گیا۔ اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پینسلوں کے ٹکڑے چھوٹ کر واپس کوڑے کے ڈھیر میں جا گرے۔ وہ ڈری ڈری سی آواز میں بولا۔

"جی، کچھ نہیں۔ اس کوڑے میں سے پینسلیں اُٹھائی تھیں۔ آپ کی ہیں تو آپ لے لیں۔"

"ہونہہ" رشی میاں منہ بگاڑ کر بولے "کوڑے میں پڑی ہوئی پینسلیں اُٹھانے کی مجھے کیا ضرورت ہے لیکن تم کیوں پینسلیں اٹھا رہے ہو۔ کیا انہیں بیچو گے؟"

"نہیں... نہیں تو... میں تو... پینسل سے لکھتا ہوں۔ میری امّی کے پاس پیسے نہیں ہیں، پینسل خریدنے کے لیے۔ اس لیے میں یہاں کوڑے میں پینسل کے ٹکڑے تلاش کر لیتا ہوں۔ کوڑے کے اس ڈھیر میں مجھے بہت سی پینسلیں، ربر اور دوسری بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ایک بستہ بھی ملا تھا۔"

رشی میاں حیرت سے منہ کھولے ہوئے اس چھوٹے سے لڑکے کی باتیں سُن رہے تھے جس کی امّی کے پاس اُسے پڑھانے لکھانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ لیکن وہ کوڑے کے ڈھیر میں سے پینسلیں چُن کر پڑھتا لکھتا تھا اور ایک وہ خود تھے۔ انہیں خود پر بڑی شرم آئی، انہوں نے سوچا "میں تو روز اپنی چیزیں ادھر اُدھر پھینک کر برباد کرتا رہتا ہوں جیسے یہ چیزیں مفت کی آتی ہوں۔ اور پھر بھی مجھے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں..."

"اچھا صاحب میں چلتا ہوں" لڑکے کی آواز سے وہ چونک پڑے۔

"ہاں، ہاں ٹھیک ہے، میں بھی جا رہا ہوں۔ ہاں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی، ہارون"

"رہتے کہاں ہو تم؟"

"ادھر... پہلی کوٹھی کے پیچھے جھونپڑی ہے نا۔ اس میں"

"تمہارے ابّا کہاں کام کرتے ہیں؟"

"ابّا؟ امی کہتی ہیں وہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، نہیں تو امی ناراض ہوں گی۔"

"ہاں، ہاں جاؤ۔"

رشی میاں وہاں سے تیر کی طرح گھر پہنچے۔ جاتے ہی انہوں نے اپنی امّی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ امّی نے اس اچانک پیار پر عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے انہیں ایک طرف کیا اور اطمینان سے بولیں "کیا چاہیئے۔ تمہیں بہانے نہیں چلیں گے۔"

"امّی امّی! رشی میاں پھر سے امّی کے گلے میں جھول گئے۔" امّی میں اب اپنی چیزوں کو کبھی اِدھر اُدھر نہیں پھینکوں گا۔ ہمیشہ اپنی چیزوں کا خیال رکھوں گا، لیکن ایک وعدہ کیجیے۔"

"ماشاءاللہ! امّی مسکرائیں "وعدہ مجھ سے لے رہے ہو۔ خیر بتاؤ تو، کیسا وعدہ ہے؟"

"امی وہ پہلی کوٹھی ہے نا۔ اس کے پیچھے ایک جھونپڑی میں ایک لڑکا رہتا ہے۔ ہارون۔ بیچارہ بہت غریب ہے۔ میں جو پنسلیں، ربڑ، اسکیل، اِدھر اُدھر پھینک دیتا تھا نا، تو ہمارا نوکر اُسے کوڑے میں پھینک آتا تھا۔ وہ لڑکا کوڑے میں سے پنسلیں، ربڑ وغیرہ جمع کرکے لکھتا پڑھتا ہے۔ امّی اُسے پڑھنے لکھنے کے لیے ہر مہینے پیسے دے دیا کریں نا۔ اچھی امّی۔!"

امّی، رشی میاں کو بڑی دیر تک غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔

"بیٹے آج تم نے میرا جی خوش کر دیا۔ اللہ تمہیں اور اچھا بنائے۔ میرا تم سے پکّا وعدہ۔ تم ہارون کو یہاں لانا میں اُسے کتابیں، پنسل، کاپی، ربڑ سب کچھ دوں گی اور پیسے بھی۔"

"سچ امّی! میں اُسے ابھی لے کر آتا ہوں۔" رشی میاں کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا اور وہ چھلانگیں لگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

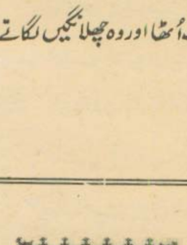

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف:۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مفت منگوانے کے لیے
صرف ۲؍ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کردیجئے۔۔

جنگل کی کہانی

خواجہ حسن نظامی

جب سارے مینڈک سر جوڑ کے بیٹھے ۔

برسات ہو چکی ۔ جنگل میں جگہ جگہ کا بھرا ہوا پانی سوکھ گیا۔ بڑے بڑے تالاب بھی چھوٹے چھوٹے ہو گئے ۔ اب پانی میں رہنے والے مینڈک پر دیس جاتے ہیں ۔ کچھ خبر بھی ہے کہ ان کا پر دیس کہاں ہے ۔ سنو ہم بتاتے ہیں ۔

جب سردی کا موسم آتا ہے ۔ تو مینڈک زمین کے اندر گھس جاتے ہیں یا بڑے بڑے پتھروں کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہتے ہیں ۔ اس سے اُن کو سردی نہیں ستاتی ۔ کیونکہ سردی کے موسم میں زمین کے اندر گرمی ہوتی ہے ۔

اور جب سردی کا موسم گزر جاتا ہے ۔ گرمی شروع ہوتی ہے ۔ تو اللہ میاں زمین کے اندر ٹھنڈک کر دیتے ہیں اور مینڈک گرمی کی دھوپ سے اور لُو سے بچے ہوئے چپ چاپ پڑے رہتے ہیں ۔ جہاں برسات شروع ہوئی اور مینہ برسا ۔ اور مینڈک اپنے پر دیس سے گھر کو آئے ۔ پھر جہاں دیکھو مینڈک صاحب اُچھلتے کودتے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔ رات کو تالابوں اور جنگل میں پانی کے جوہڑوں

پر بیٹھ کر وہ ایسا زور و شور سے ٹرّاتے ہیں کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔

برسات کے دنوں میں تم نے دیکھا ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے مینڈ کہاں راستوں میں اچھلتی دوڑتی پھرتی ہیں۔ یہ بارش کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہیں۔

اب برسات ختم ہوئی۔ سردی آئی اور مینڈک پردیس چلے۔ تو انہوں نے ایک جلسہ کیا اور سب مینڈک ایک مکان میں جمع ہوئے جہاں کرسیاں بچھائی گئیں اور ایک ایک کرسی پر ایک ایک مینڈک بیٹھ گیا۔ بیچ میں ایک تخت بچھایا گیا اور تخت پر ایک کرسی رکھی گئی۔ جس کے اوپر چھتر لگا ہوا تھا۔ ایک کرسی پر مینڈکوں کا بادشاہ ایک بڑا مینڈک آن کر بیٹھا اور اس نے سب مینڈکوں سے کہا۔

"اے میری پیاری رعیت۔ آج کا دربار اس واسطے ہے کہ ہم سب مل کر جنگل میں چلیں اور اپنے پیدا کرنے والے کا شکرانہ ادا کریں۔ جس نے ساری برسات ہم کو آرام سے رکھا۔ تالابوں میں پانی بھرا۔ جس میں ہم تیرتے غوطے مارتے۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے پھرے۔ اُسی خدا نے ہم کو کھانا دیا اور اُسی خدا نے ہم کو رات بھر گانا گانے کی بے فکری دی۔ اب ہم سب پردیس جاتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیے کہ سب مل کر خُدا کی نعمتوں اور احسانوں کا شکریہ ادا کریں اور اُس سے دُعا مانگیں کہ وہ سردی اور گرمی کا زمانہ پردیس میں آرام سے گزارے۔"

بادشاہ مینڈک کی یہ بات سُن کر ایک مینڈک کھڑا ہوا اور اُس نے کہا "پردیس میں ہم لوگ کھائیں گے کیا؟"

بادشاہ نے کہا "خدا نے اپنے فضل سے یہ بندوبست کیا ہے کہ پردیس میں ہم کو بھوک نہیں لگے گی۔ مٹی چاٹ چاٹ کر ہمارا پیٹ بھر جائے گا اور کسی دُوسری چیز کے کھانے کی ضرورت ہم کو نہ ہوگی۔"

یہ سُن کر سب مینڈکوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اور "خدا کا لاکھ لاکھ احسان۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر" کہنے لگے۔

دربار برخاست ہوا۔ تو سب مینڈک جنگل میں جمع ہوئے۔ کسی کے سر پر تُرکی ٹوپی تھی۔ کسی کے سَر پر عمامہ تھا۔ کسی کے سَر پر ہندوانہ گول پگڑی تھی۔ کسی کے سَر پر پارسی پگڑی تھی۔ کسی کے سَر پر انگریزی ٹوپی تھی۔ جنگل میں جا کر یہ سب قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر خُدا کا شکرانہ ادا کیا اور پھر وہاں سے اُٹھ کر اپنے اپنے سوراخوں میں چلے گئے۔ جو اُن کے پردیس جانے کا راستہ تھا۔

تم بھی اے بچّو خدا کی نعمت کا شکرانہ بھیجا کرو۔ جس نے سردی گرمی برسات کی بے شمار نعمتیں تم کو دی ہیں۔

شگفتہ کہانی

مرغی اور بلّی

شوکت تھانوی

میں نے پالی مُرغی اور باجی نے پالی بلّی۔ وہ کہتی تھیں کہ "میری بلّی بہت خوبصورت ہے۔ سفید سفید اور نرم نرم جیسے رُوئی کا گالا"۔ میں کہتا تھا کہ "کس کام کی یہ بلّی خوبصورت ہے تو کیا ہوا۔ مگر ہے کس کام کی فائدہ تو کوئی اس کا ہے نہیں اُلٹا نقصان ہی پہنچائے گی۔ دُودھ کھُلا ہوا چھوڑ دیجیے تو پی جائے۔ سالن ڈھکنا بھول جائیے تو چٹ کر جائے۔ پڑوس میں چلی جائے تو بے چارے کبوتروں کی شامت"۔

البتہ ہماری مُرغی ہے کام کی۔ کھانے کے لیے انڈے دے گی۔ ان انڈوں پر بٹھا دیجیے تو درجنوں چوں چوں کرتے ہوئے گیندے کے پھول کی طرح کے چوُزے پھُدکنے لگیں۔ جب وہ بڑھ جائیں تو چاہے اُن کا مرغ پلاؤ پکا لیجیے۔ چاہے یوں ہی بھُون کر کھا لیجیے اور اگر نہ بھی کھائیے تو یہی بہت سی مُرغیاں انڈوں سے گھر بھر دیں۔

میں نے ایک دن اُن کو حساب لگا کر بتایا۔ کہ ایک مُرغی سے آدمی لکھ پتی تک بن سکتا ہے مگر وہ ہمیشہ منہ بنا کر کہتیں کہ "گندا جانور ہے۔ سارے گھر میں بدتمیزی کرتا پھرتا ہے اور میری بلّی اس قدر شفّاف رہتی ہے کہ اُس کی صفائی سے ہم انسانوں کو سبق سیکھنا چاہیے۔ پھر اس کا سب

سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گھر میں چوہے نہیں رہنے پاتے۔"
میں نے اُبکائی لے کر کہا "آخ تھو" چوہے۔ بڑی صفائی پسند ہے آپ کی بلی۔ چوہے کھاتی ہے نامُراد "
باجی نے بُرا مان کر کہا "خبردار جو میری بلی کو نامُراد کہا۔ نامُراد ہو گی تمہاری مُرغی"
اپنی مُرغی کے لیے نامُراد کا لفظ میں بھی نہ سُن سکتا تھا۔ میں نے غصّے میں کہا "آپ کی بلّی نامُراد اُس کے سگے سوتیلے نامُراد"
باجی نے مٹھیاں بھینچ کر کہا "نامراد تیری مُرغی اُس کا باپ نامُراد۔ اُس کی ماں نامُراد" میں نے غصّے میں کہا۔
"اللہ کرے مرجائے آپ کی بلّی"
باجی نے کہا "مَرے تیری مُرغی۔ آدھی رات کو اُس کا جنازہ نکلے"
اور میں نے سچ مچ پُورا منہ کھول کر رونا شروع کر دیا۔ بھیں۔ بھیں۔ بھیں۔
امی جان اور ابّا جان دونوں تاش کھیل رہے تھے۔ وہ دوڑے پتّے ہاتھ میں لیے ہوئے اور اب تحقیقات شروع کر دی کہ کس نے ننھے کو مارا۔
باجی نے ڈرتے ڈرتے کہا "اس نے میری بلی کو کہا تھا کہ" اللہ کرے مرجائے تیری بلی"
میں نے روتے ہوئے کہا "انہوں نے کہا کہ تیری مُرغی کا جنازہ نکلے"
ابّا جان نے حیرت سے امی جان کا منہ دیکھتے ہوئے کہا "یہ کوسنا ان کو کس نے سکھایا؟"
امی جان نے کہا "محلّے کے بچوں سے یہی بے ہُودہ باتیں سیکھتے ہیں۔ کل سے اِن کا محلّے کے بچّوں سے کھیلنا بند"
اور اُسی وقت میری مُرغی کی آواز آئی "کُٹ کُٹ، کٹاک۔ کٹاک"
امی جان دوڑیں "بلّی بلّی" کرتی ہوئی۔
اور جب ہم باہر پہنچے۔ تو باجی کی بلّی چٹخارے بھر رہی تھی اور میری مُرغی جنّت کو سدھار چکی تھی۔
باجی کی دُعا قبول ہو گئی۔ مگر خدا کے یہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں۔ دیکھتا ہوں۔ باجی کی یہ بلّی کب تک زندہ رہتی ہے۔

کارخانۂ قدرت کی عجیب الخلقت مخلوق

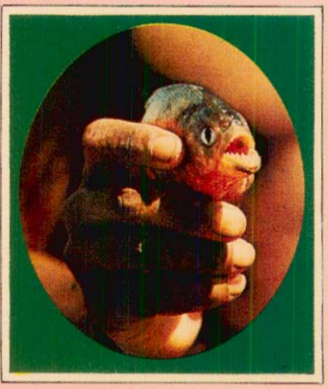

دو انگلیوں میں سما جانے والی چھوٹی مگر خطرناک مچھلی Pirana شدید بھوک کے عالم میں شکار پر وحشیانہ حملہ کرکے چند لمحوں میں چٹ کر جاتی ہے۔

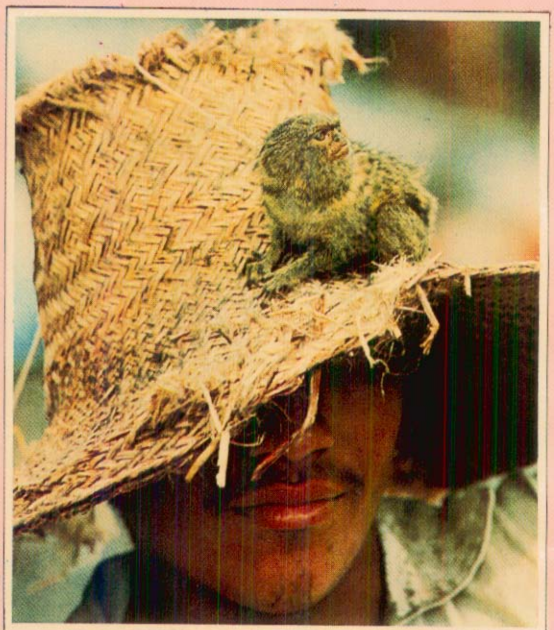

Pigmi Mormoset دنیا کا سب سے چھوٹا بندر۔ ایسے دو پالتو بندر بھی ہوں تو ان کا وزن آنکھ مچولی کے ایک شمارے سے زیادہ نہ ہو گا۔

ایک انچ سے بھی زیادہ بڑی، دنیا کی سب سے بڑی اور خطرناک چیونٹی برازیل میں دریائے ایمزان کے قریب پائی جاتی ہے۔

Trantula مکڑی کی اتنی بڑی قسم کہ چڑیا کو آرام سے دبوچ لے۔ پتوں میں چھپ کر بیٹھتی ہے۔ کوئی چھوٹا پرندہ قریب آجائے تو واپس نہیں جا سکتا

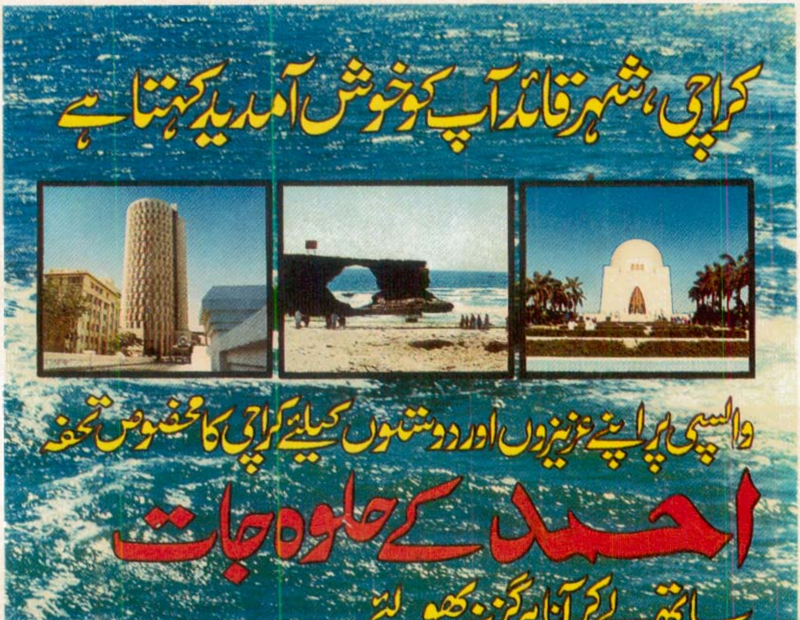
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

غربت کی کہانی

سعیدہ احسان

اُسے سفید چھڑی نے بھلائی کا راستہ دکھایا

شہزاد ٹریفک لائٹ بند ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈی پر بہت سے پھولوں کے ہار اور گجرے تھے۔ ٹریفک سگنل پر فقیروں کا بڑا ہجوم رہتا تھا۔ اکثر فقیر لڑکے اور لڑکیاں گندے گندے جھاڑن ہاتھ میں لیے کھڑے ہوتے تھے۔ شہزاد اُن سب سے الگ تھلگ کھڑا رہتا۔

وہ مستقل سگنل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سگنل سُرخ سے پیلا ہُوا اور پھر ہرا۔ گاڑیاں ہلکے ہلکے رُکنے لگیں تو وہ بھی بڑھا۔ اس کے سامنے ایک آدمی سفید چھڑی تھامے جا رہا تھا کہ اچانک کسی فقیر نے گاڑی کی طرف لپکتے ہوئے اُسے دھکا دیا۔ سفید چھڑی والا آدمی گر گیا۔ شہزاد جلدی سے آگے بڑھا وہ آدمی اندھوں کی طرح اپنی چھڑی تلاش کرنے کے لیے ہاتھ مار رہا تھا۔ شہزاد نے جلدی سے اُسے چھڑی پکڑائی اور اُٹھنے میں اُس کی مدد کرنے لگا کہ اس کے ہاتھ سے پھُولوں کی چھڑی گر گئی اور ایک گاڑی کے پہیوں کے نیچے آگئی۔ پھول سب ٹوٹ گئے تھے۔ شہزاد کو رونا آگیا۔ نابینا شخص نے شہزاد سے کہا۔

"تمہاری وجہ سے میری جان بچ گئی ۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا"

تھوڑی سی ہمدردی سے شہزاد کو اور بھی رونا آیا ۔ وہ چُپ رہا ۔

"کیوں بیٹا ۔ کیا تمہیں چوٹ لگی ہے ؟" نابینا نے پریشان ہو کر پوچھا ۔

"میں پھولوں کے ہار گجرے بیچتا ہوں ۔ میری ہاروں والی لکڑی گر گئی اور موٹر کے پہیے کے نیچے آگئی ۔ اب میں ماں کو کیا جواب دوں گا" شہزاد نے افسردگی سے کہا ۔

"اوہو مجھے بے حد افسوس ہے لیکن تم پریشان نہ ہو" اس شخص نے تسلی دی ۔ پھر اُس نے اپنی قمیص کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ پانچ روپے کے دو تین مُڑے تڑے نوٹ نکالے ۔ اور شہزاد کو دیتے ہوئے کہا "بیٹا تم یہ لے جا کر اپنی ماں کو دے دینا"۔

شہزاد کا دل تو چاہا کہ وہ تھوڑے سے پیسے لے لے پھر اُسے ڈر لگا ۔ جب اماں کو معلوم ہوگا کہ یہ پیسے کسی اندھے آدمی نے دیے ہیں تو بہت ڈانٹے گی ۔

"نہیں چاچا ۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا اماں ناراض ہو جائے گی"۔

"تو اماں کو مت بتانا کہ تمہارے پھُول ضائع ہو گئے ۔ کہہ دینا کہ پھُولوں کے پیسے ہیں" اندھے نے کہا...

"نہیں چاچا ۔ میں اماں سے جھُوٹ نہیں بولتا اور اگر جھُوٹ بولوں تو اماں کو معلوم نہیں کیسے پتا چل جاتا ہے کہ میں سچ نہیں بول رہا ہوں"

"تمہاری ماں عظیم ہے بیٹا ۔ تم نے آج ایک نیکی کی ہے اس نیکی کا انعام اللہ ضرور دے گا"

"نیکی کا انعام ملتا ہے چاچا ؟" شہزاد نے حیرت سے پوچھا ۔

"ہاں بیٹا ہر نیک کام کا انعام ملتا ہے ۔ نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی ۔ اچھا اب تم گھر جاؤ"

شہزاد گھر پہنچا تو چولھا جل رہا تھا اور اس کی ماں کھانا پکا رہی تھی ۔ شہزاد کو بڑی حیرت ہوئی ۔

"اماں آج تم نے کھانا بھی تیار کر لیا"

"ہاں بیٹا ۔ ایک بیگم کچھ کپڑے سینے کو دے گئی ہے اور اُس نے مجھے تھوڑے پیسے پیشگی دے دیے تو میں سودا لے آئی ۔ آج تجھے دیر ہو گئی ؟"

"وہ بیگم بھی ایک نیکی کر گئی" شہزاد نے سوچا ۔

"بتاتا کیوں نہیں دیر کیوں ہو گئی"

شہزاد سوچ میں پڑ گیا کہ اماں کو پورا قصہ بتائے یا نہیں۔ مگر بتانا تو تھا۔ اُس نے رُک رُک کر سارا قصہ سُنا دیا۔ اماں چُپ ہو گئی۔ شہزاد کو فکر ہوئی کہ اماں ناراض ہو گئی ہے۔

اُس نے کہا "مگر اماں۔ تم ہمیشہ کہتی ہو کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نیکی کا انعام ملتا ہے۔ تو پھر مجھے بھی اللہ میاں انعام دے گا"

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم نے بڑی نیکی کی کہ ایک اندھے آدمی کو بچا لیا۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ نیکی کا انعام بھی ملتا ہے۔ مگر فوراً نہیں"

"تو پھر اماں کب ملے گا یہ انعام؟" شہزاد نے بے صبری سے پوچھا۔

"اللہ میاں انعام تو ضرور دے گا لیکن اس کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ اور تُو بے صبرا ہو رہا ہے" ماں نے جواب دیا۔

اگلے دن شہزاد پھر پھُول لیے اپنی خاص جگہ کھڑا تھا۔ مگر کسی نے گاڑی روک کر پھول نہیں خریدے۔ بس صرف دو عورتیں چار ہارلے گئیں۔ رات ہو چکی تھی اور وہ پریشانی سے آتی جاتی... گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک ایک گاڑی شہزاد کے اتنے قریب آکر رُکی کہ وہ اُچھل پڑا۔

"کتنے اچھے پھُول ہیں" کسی کی آواز آئی۔

وہ گاڑی کے قریب چلا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ گاڑی میں اُس کا ہم عمر ایک لڑکا بیٹھا ہے۔

"لاؤ یہ کتنے ہار ہیں؟"

شہزاد نے جلدی جلدی گنتی کی۔ جلدی میں وہ ٹھیک سے گن بھی نہیں سکتا تھا۔ گاڑی میں سے آدمی نے ہاتھ بڑھایا۔

"چلو گنتی چھوڑو سب دے دو" شہزاد کو بڑی حیرت ہوئی اس طرح کا خریدار تو اُسے کبھی نہیں ملا۔ اُس نے پوری گجروں کی چھڑی اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ اُس شخص نے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر شہزاد کو دیا۔ پچاس روپے کا نوٹ دیکھ کر شہزاد کی حیرت کی انتہا نہ رہی "مگر... مگر... اتنے پیسے" اُس نے ہکلا کر کہا۔

"رکھ لو یہ پیسے یہ سمجھو کہ آج پھُول بہت مہنگے ہیں" اس آدمی نے مُسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"ابّا اسے لفٹ دے دیں"، ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے نے کہا۔

ابّا نے کہا، "کہاں رہتے ہو تم بچے؟"

"جی میں اعظم بستی میں رہتا ہوں"، شہزاد نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو بیٹھ جاؤ گاڑی میں ہم تمہیں رستے میں اُتار دیں گے۔"

لڑکے نے شہزاد کو جگہ دی۔ شہزاد کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کبھی کسی کار میں بیٹھا ہی نہیں تھا اور یہ اتنی بڑی گاڑی۔

لڑکے کی گود میں بہت سے کھلونے تھے۔ ایک بڑی خوبصورت لال رنگ کی گاڑی جس پر ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی اور گھنٹیاں تھیں۔ لڑکا چابی دیتا اور گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ گاڑی چلنے لگتی اور سیڑھی اُٹھ جاتی۔ شہزاد پہلے تو کنکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دفعہ اُس نے پوری طرح وہ گاڑی دیکھی تو لڑکے نے کہا۔

"تم بھی چلا کر دیکھو۔ یہ فائر بریگیڈ کی گاڑی ہے۔ لونا۔ اب چابی دو۔"

شہزاد شرما گیا۔ اس نے نہیں میں سر ہلایا۔

"دیکھو تو سہی۔ چابی دیتے ہی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ سیڑھی اوپر ہو جاتی ہے اور یہ سب جو چھوٹے چھوٹے سے آدمی بنے ہوئے ہیں یہ سب اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ آگ بجھانے والی گاڑی ہے۔"

شہزاد کے محلّے میں ایک مرتبہ کسی دکان میں آگ لگ گئی تھی اور ایسی ہی ایک گاڑی آئی تھی۔ جس سے آدمیوں نے آگ بجھائی تھی۔ شہزاد کو سب یاد آگیا۔ اور پھر یہ تو اتنی چمکدار لال رنگ کی گاڑی تھی۔ شہزاد نے ہلکے ہلکے اپنا ہاتھ بڑھایا، لڑکے نے گاڑی اُسے دے دی۔ شہزاد نے چابی بھرلی۔ شہزاد بار بار چابی بھرتا رہا اور گاڑی کے تمام کام شروع ہو جاتے۔ "ہاں بھئی یہ ہی ہے نا اعظم بستی؟" اُس آدمی نے پوچھا۔ شہزاد کو ایسا لگا جیسے کسی نے اُسے آسمان سے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔

"جی... جی... بس یہیں روک لیجیے۔"

وہ گاڑی سے اُترنے لگا تو آگ بجھانے والی گاڑی بڑی حسرت سے اُس نے لڑکے کی طرف بڑھائی۔

باپ کچھ دیر تک دونوں کو دیکھتا رہا پھر کہا، "بیٹا یہ گاڑی ان کو پسند آئی کیوں نہ یہ گاڑی

ان ہی کو دے دو۔" بیٹے نے بڑی خوشی سے گاڑی شہزاد کو دے دی۔ اس سے پہلے کہ شہزاد کچھ کہتا گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔

شہزاد اُچھلتا کُودتا گھر میں داخل ہُوا۔ اماں کچھ پریشان سی بیٹھی تھی۔ خالی ہاتھ۔

"آج پھر تو نے اتنی دیر کر دی کہاں رہ گیا تھا؟"

شہزاد نے کچھ جواب نہیں دیا اور جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر ماں کو دیا۔ وہ اُلٹ پلٹ کر وہ نوٹ دیکھ رہی تھی۔ "اتنے پیسے تجھے کہاں سے ملے؟" اُس نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"اماں پھول بیچ کر۔ کوئی چوری کر کے تو نہیں لایا ہوں۔" "مگر روز تو اتنے پھول کے تو دس یا پندرہ روپے لاتا ہے؟"

"ہاں اماں آج ایک نیک آدمی مل گیا تھا۔" اور پھر شہزاد نے اپنی ماں کو پورا قصّہ سُنایا۔ اور ڈرتے ڈرتے وہ گاڑی بھی دکھائی۔ اماں اب پھر بھڑک اُٹھی۔

"سچ سچ بتا کہ یہ گاڑی کہاں سے ملی ورنہ ابھی میں۔۔۔"

"اماں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں یہ گاڑی مجھے اُسی کار والے لڑکے نے دی۔ اس کے پاس بہت سے کھلونے تھے۔"

اماں چُپ ہو گئی۔ پچاس روپے کا نوٹ اس کی مُٹھّی میں بند تھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ شہزاد کو بہت بھُوک لگ رہی تھی وہ انتظار میں تھا کہ اماں کب کہے گی کہ وہ بازار سے سبزی لائے۔ کچھ دیر بعد اُس سے صبر نہ ہُوا۔

"اماں پیسے تو دو، کیا آج کھانا نہیں ملے گا۔"

اماں کو جیسے ہوش آگیا۔ اُس نے اپنے دوپٹے کے پلّو کی گانٹھ میں سے کچھ پیسے نِکال کر شہزاد کو دیے۔

شہزاد جانے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ مُڑا اور واپس آگیا۔ کھلونا گاڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔

"اماں یہ رکھو۔ کہیں مجھ سے کھو نہ جائے۔ اور اماں میں بڑا ہو کر آگ بُجھانے کی گاڑی پر کام کروں گا۔ ہے نا یہ بھی نیکی کا کام؟" ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اُسے لپٹا کر پیار کرتی رہی، اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خوشی کے، دُعا کے۔

جب چاند کا داغ چمک اُٹھا

سید عبدالودود شاہ

وال کلاک پر نظر پڑتے ہی غصے سے میرا خون کھول اُٹھا۔ پونے نو بج رہے تھے۔ بُری طرح بھنا کر میں نے چادر ایک طرف پھینک دی۔

اب کیا ہوگا ؟ اسکول جانے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ یہ سب کم بخت زینب کی وجہ سے ہوا۔ اسے اتنا نہیں ہوتا کہ صبح آکر اُٹھا دے، دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے چیخ کر کہا۔ "اب کیا کرنے آئی ہو۔ جاؤ!" دروازہ آہستہ سے کھُلا، سر پر چادر کا آنچل ڈالے، سمٹی سمٹائی خوفزدہ سی

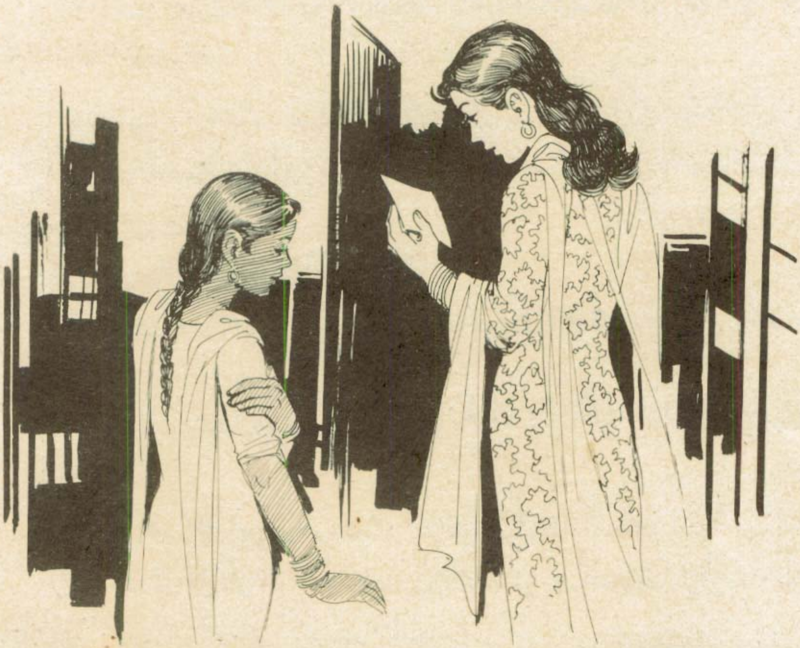

زینب نے اندر قدم رکھا۔ میں نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے وال کلاک کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی خوفزدہ آنکھیں جھپکا کر کلاک کی طرف دیکھا۔

"وہ بی بی جی ... خرم میاں ...!" اس نے ہکلا ہکلا کر کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن اب میرے برداشت سے باہر تھا۔ "تمہیں آخر کس لیے نوکر رکھا گیا ہے۔ جب تم وقت پر کام نہیں کر سکتیں تو تمہارا اس گھر میں کیا کام ہے۔ اب کل اسکول میں بے عزتی کس کی ہوگی تمہاری یا ہماری"! میں نے اُسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

زینب چپ چاپ کھڑی تھی۔ "اچھا اب اپنی منحوس صورت لے کر یہاں سے دفعان ہو جاؤ!"

وہ چُپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی پھر دھیمے قدموں پلٹ گئی۔

باتھ روم سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے میں نے ادھر اُدھر دیکھا' لاؤنج میں بالکل سناٹا تھا۔ کوئی بھی نظر نہیں آر ہا تھا۔ اجو آپی یونیورسٹی اور ہمایوں اسکول جا چکے تھے۔ دُور کہیں سے خرم کے رونے کی ہلکی سی آواز ذرا دیر کو آئی پھر خاموشی چھا گئی۔ شاید آیا نے اُسے چُپ کرا کے سُلا دیا تھا۔ صُغریٰ ناشتہ لے آئی اور خاموشی سے سجا کر چلی گئی۔ میں نے صرف دُودھ کا ایک کپ پیا اور خاصے غصّے کے ساتھ اُٹھ گئی۔ ممّی کے کمرے میں بھی سناٹا تھا۔ وہ شاید صبح ہی صبح کسی سہیلی کے ہاں جا چکی تھیں۔ خرم کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سو چکا تھا اور آیا اس کے برابر بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ زینب شاید اندر کہیں ہوگی۔ ایک لمحے کو تو سوچا کہ آواز دے کر پوچھوں خرم کیوں رو رہا تھا۔ لیکن اُس کے اُٹھ جانے کے خیال سے چپکے سے آگے قدم بڑھا لیے اپنے کمرے میں جا کر پھر وحشت سی ہوئی۔ اب مس شفقت کا پیریڈ ہوگا اور خدا جانے کس نے ان کا نام مس شفقت رکھ دیا ہے۔ ورنہ ان کی شفقت کچھ اور ہی ہُوا کرتی ہے۔ بیڈ پر بیٹھ کر پھر جھنجھلاہٹ سوار ہوئی۔ اجو آپی اور ہمایوں کا مشترکہ خیال ہے کہ نک چڑھے پن میں میرا جواب نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں بچپن میں ایک دفعہ بُری طرح بیمار پڑی تھی بس جان کے لالے پڑ گئے تھے شاید اللہ میاں کو میری زندگی منظور تھی جو میں بچ گئی، لیکن اس کا نتیجہ بے حد لاڈ پیار کی شکل میں نکلا۔ یہاں تک کہ زینب کو صرف میرے کاموں کے لیے ہی ملازم رکھا گیا تھا اور آئے دن میرے ہاتھوں اس کی شامت آتی تھی، پاپا کبھی نرمی سے اور کبھی ہلکی سی تنبیہ کے ساتھ سمجھاتے کہ بیٹا، نوکروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ کسی کو ذلیل

نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور ممی کا تو خیال تھا کہ پاپا نے میری ہر فرمائش پوری کرکے اور ناز نخرے اُٹھا کر میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ چنانچہ اکثر و بیشتر دونوں میں اس پہ بحث بھی ہوجاتی تھی۔ اور ممی تو کبھی کبھی خاصی سختی سے جھاڑ بھی دیتی تھیں۔ خیالوں کی رو میں میں کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اور اُس وقت چونکی جب نگاہ سامنے کیلنڈر پہ پڑی۔ ۱۸ اکتوبر۔ سالگرہ شیما رضوی۔ اُف میرے خدا۔ اُٹھارہ تاریخ میں اب صرف دو دن ہیں اور میں نے ابھی تک اپنی عزیز دوست کے لیے تحفہ بھی نہیں خریدا۔

"زینب۔ یہاں میرے کمرے میں آؤ۔" انٹرکوم پہ میں نے کہا۔

"جج... جی اچھا بی بی جی..." زینب کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ چند لمحے بعد پردہ سرکا اور زینب کا سہما ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ "ذرا میرے ساتھ شاپنگ کو چلو..." اُس نے قدرے حیران ہوکر مجھے دیکھا۔

"اچھا بی بی... لیکن کیسے جائیں گی...؟"

"کیوں...؟"

"گاڑی تو اجو بی بی کو چھوڑنے گئی ہوئی ہے...!"

"اوہ...!" میں جھلا کر رہ گئی ایک مرتبہ پھر موڈ آف ہوچکا تھا۔

گھر میں تین گاڑیاں اور ہمارے لیے عین وقت پر سب غائب، لیکن اب سوائے خون کھولانے کے اور کیا حاصل ہوسکتا تھا۔

"اچھا اب تم جاؤ اپنا کام کرو"، میں نے انتہائی بےزاری سے کہا۔ زینب چپ چاپ کھسک گئی۔ میں نے تھک کر تکیے پر سر ڈال دیا۔

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، نہ پلٹ کر کسی کی سمت دیکھتا ہے۔ دن کے بعد رات بھی آتی ہے اور گرمی کے بعد سردی بھی، خزاں اور بہار آگے پیچھے چلتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک دن گھر سے بہار رُخصت ہوگئی۔

ڈیڈی کی گاڑی کا اتنا شدید ایکسیڈنٹ ہوا کہ وہ بس بچ گئے ورنہ اُن کا سارا جسم مفلوج ہوگیا تھا۔ اب وہ بول بھی نہیں سکتے تھے۔ بس خالی خالی آنکھوں سے سب کو تکتے رہتے تھے، لمبے چوڑے ہینڈسم ابو کی یہ حالت دیکھ کر دوسروں کا جو حال ہوا وہ اپنی جگہ۔ میں خود پاگل

سی ہو گئی تھی۔ ابّو کا ایکسیڈنٹ کیا ہوا۔ گھر سے ساری خوشیاں اپنا ڈیرہ سمیٹ کر رخصت ہو گئیں۔ کاروبار چلانے والا کوئی نہ تھا۔ ممی کو اس میدان میں کوئی تجربہ نہ تھا۔

جس طرح اندھیرے میں سایہ چھوڑ جاتا ہے۔ رشتہ دار بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ اب لے دے کر صرف کوٹھی رہ گئی تھی۔ جس کی اوپری منزل کرایہ پر دے دی گئی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ ملازم کب کے جا چکے تھے۔ آپی خود نوکری کی تلاش میں تھیں۔

ہاں اُس وقت صرف ایک زینب تھی۔ جس نے اب تک ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ممی نے بہت کہا کہ تم بھی کہیں اور جا کر ڈھنگ کی نوکری کر لو مگر وہ نہیں مانی۔

میرا چڑچڑا پن خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اب میں تمام دن کمرے میں بند گزارا کرتی تھی۔ بے حد اخراجات سمٹتے سمٹتے تنگی کی حد تک آ پہنچے تھے۔ کیونکہ ممی کو آپی کی شادی کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ اُنہی دنوں آپی جس آفس میں کام کرتی تھیں خسارے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اور آپی کی سروس بھی ختم ہو گئی۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب کرایہ دار کرایہ ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگا۔

ایک دن اسکول کی پرنسپل نے صاف صاف کہہ دیا کہ "اگر اس ماہ بھی فیس ادا نہیں کی تو پھر اگلے ہفتے سے اسکول مت آنا!"

شام کو میں نے ممی کی گود میں سر رکھ کر روتے روتے سب کچھ بتا دیا۔ رات گئے زینب آہستہ سے میرے کمرے میں داخل ہوئی، وہی سہمی سہمی چال، جیسے اندر آتے ہی میرے زوردار تھپڑ کا اندیشہ ہو۔ اُس نے آہستہ سے کاغذ کا مڑا تڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا، اور میں اُسے دیکھ کر ہی سمجھ چکی تھی کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔۔۔!

"کیا یہ وقت بھی آسکتا تھا؟"

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔۔۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھی اور بستر کے کنارے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یہ پیسے کہاں سے ملے ہیں۔!" میں نے نرمی سے پوچھا

"جی۔۔۔ یہ آپ ہی کے ہیں۔" وہ بولی۔

"لائی کہاں سے ہو؟" میں نے وہی سوال الفاظ بدل کر دہرایا۔

"جی... جو کچھ بچتے تھے... وہ میں الگ رکھ لیتی تھی۔ کسی وقت کام آئیں گے۔ یہ آپ ہی کے گھر کی کمائی ہے اور آپ ہی کی نذر ہے" اس نے کئی قسطوں میں ہچکیوں کے درمیان جو کچھ کہا... اس کا مفہوم یہی تھا۔

مجھے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا کچھ بکھرتا محسوس ہو رہا تھا... وہ مغرور اور بد دماغ لڑکی جو الارم کی آواز بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے بازو آگے کیے اور زینب کو گلے لگا لیا۔ میں اُسے چُوم چُوم کر رو رہی تھی۔ آپی اور ممی حیرت زدہ سی دروازے میں کھڑی تھیں، اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا... !

"کوئی بات نہیں بیگم صاحب۔ چاند میں بھی تو داغ ہوتا ہے اور آپ تو میرے گھر کا چاند ہیں... ہے نا جی!" زینب نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

یہ سوّیاں نہیں ہیں تو پھر یہ کیا ہے؟

ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اسے نہیں پہچان سکتے۔ اگر آپ نے پہچان لیا تو قیمتی انعام آپ کا ۱۵ اپریل تک جواب بھجوائیے۔ اس تصویر کی حقیقت مئی کے شمارے میں دیکھئے۔

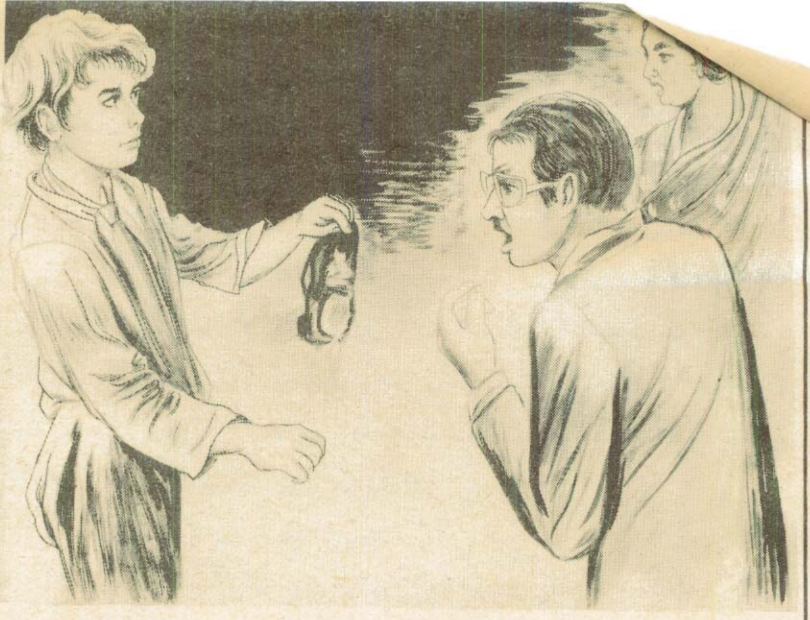

عزیز نہ سن
ترجمہ: کرنل مسعود اختر شیخ

ترکی کہانی

سب ہی کہتے رہے میرا کیا قصور

کسی ملک میں ایک بڑا امیر آدمی رہتا تھا۔ اُس کا نام تھا محمّد خان۔ محمّد خان گندم، جوار باجرہ اور حیوانوں کے چارے کا کاروبار کرتا تھا۔ امیر ہونے کے باوجود وہ فضول روپیہ ضائع کرنے کا قائل نہ تھا۔ ہمیشہ ہاتھ کھینچ کر گھر کا خرچ چلاتا کہ اُس کے نزدیک دولت مند رہنے کے لیے دولت جمع کرنا پہلی شرط تھی۔ ایک روز محمّد خان کی بیوی نے کہا۔

"میاں صاحب! بچّے کا جُوتا پھٹ گیا ہے، اُسے ایک نیا جُوتا تو خرید دیجیے۔" محمّد خان غصّے سے بھڑک کر بولا۔

"بیگم، کچھ خدا کا خوف کرو۔ میری ماں تو مجھے تین سال میں جُوتوں کا ایک جوڑا لے کر دیا کرتی تھی اور اُس پر بھی ابا جان ناراض ہُوا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا دادا جان اُنہیں پانچ سات سال سے پہلے کبھی جوتا لے کر نہیں دیتے تھے اور اب نوبت یہاں آن پہنچی ہے کہ ہمارا صاحبزادہ دو ہی ماہ

میں بُوٹ بھیر پھاڑ کر نئے جُوتوں کی سفارش کر وا رہا ہے۔ نیا جُوتا اور دو ماہ میں ختم! غضب خُدا کا!"

بیوی بولی "آپ خواہ مخواہ غصّہ مجھ پر نکال رہے ہیں۔ آخر میرا کیا قصُور ہے؟ جُوتا میں نے تو نہیں پھاڑا۔ یہ کہا اور پنجے جھاڑ کر بچّے کے پیچھے پڑ گئی۔

" نگوڑے کہیں کے، تمہیں پتہ نہیں جب میں اور تمہارے ابا تمہاری عُمر کے تھے تو سالہا سال نئے جُوتے خریدنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے، میرے مولیٰ! آج کل کی اولاد کے دلوں میں والدین کے لیے ہمدردی کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ دونوں ہاتھوں سے اُن کے گاڑھے پسینے کی کمائی برباد کرتے ہیں۔ دو ماہ ہُوئے نئے جُوتے لیے ہوئے اور آج پھر نئے جُوتوں کا تقاضا۔ آخر تم اتنی جلدی جُوتے پھاڑ کیسے دیتے ہو؟"

بیٹے نے اپنا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا۔

" لیکن امّی جان! آپ خود ہی سوچیے اس میں میرا کیا قصُور ہے؟ پہلے تو آپ بھی مجھے عید کے عید ایک جوڑا لے کر دیا کرتی تھیں۔ پھر نہ معلوم کیوں نیا جُوتا چھ ماہ بعد پھٹنے لگا، تو آپ مجھے سال میں دو جوڑے لے کر دیا کرتی تھیں۔ اب اگر یہ کمبخت دو ہی ماہ میں تار تار ہو گیا ہے تو بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟ ملک بھر میں ہر چیز کی کوالٹی دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دکاندار بے ایمانی کرنے سے باز نہیں آتے۔ گھٹیا مال وہ بیچتے ہیں اور قصور وار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔"

ماں کو احساس ہُوا کہ بیٹا واقعی حق بجانب ہے۔ بیٹے کی اُنگلی پکڑی اور سیدھی جوتے والے کی دُکان پر جا پہنچی۔ جُوتوں کے گھٹیا اور غیر پائیدار ہونے کا گلہ کیا۔ دکاندار نے اپنے دفاع میں ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑ دی۔

" بیگم صاحبہ، جُوتوں کے گھٹیا ہونے کی شکایت آپ ہی نہیں، سب گاہک کر رہے ہیں ... مجھے خود اس قدر گھٹیا کوالٹی کا مال بیچتے شرم آتی ہے، لیکن کیا کیا جائے، زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ لوگوں میں اپنے پیشے کے فخر کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔ آج سارے ملک میں ایک ایسا موچی نہیں ملتا جو عُمدہ قسم کے پائیدار جُوتے بنانے میں فخر محسوس کرتا ہو۔ اب آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصُور ہے؟"

ماں بیٹا تو گھر لوٹ گئے، مگر دُکاندار سیدھا موچی کے ہاں پہنچا۔ نہایت مؤثر انداز میں، گلا پھاڑ پھاڑ کر اُس کے بنائے ہوئے جُوتوں کے گھٹیا ہونے کی شکایت کی۔

موچی نے جواب دیا۔ "جناب اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے جوتا بنانے کا سارا خام مال پہلے سے دُگنی قیمت پر خریدنا پڑتا ہے۔ اتنا پیسہ دے کر بھی مال کی کوالٹی تسلی بخش نہ ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ پہلے زمانے میں لوگوں کو اپنے نام اور عزّت کی فکر ہوتی تھی، مگر اب کون پرواہ کرتا ہے۔ یہ دیکھیے، جو چمڑا ہمیں اس وقت مل رہا ہے اُسے ملاحظہ کیجیے۔

ڈھیلا ڈھالا، مُردار قسم کا چمڑا جس میں ایمان کی ایک رتّی باقی نہیں۔ ایسے ذلیل چمڑے کا جُوتا آخر کتنا عرصہ چلے گا؟ چمڑا بیچنے والوں کو کوئی نہیں پُوچھتا، سب ہمیں میں کیڑے نکالتے ہیں۔ آپ انصاف کیجیے صاحب، اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

دُکاندار واپس چلا گیا، لیکن موچی سیدھا چمڑے کے سوداگر کے پاس پہنچا اور بولا۔

"کیوں جناب، آپ لوگ اب اتنا بے جان قسم کا چمڑا کیوں فروخت کرتے ہیں جس سے بنے ہوئے جُوتے دو ماہ بھی نہیں چلتے؟"

سوداگر نے جواب دیا۔ "بھائی صاحب، مجھے آپ جیسے کرم فرماؤں کو ناراض کرنے میں مزا تو نہیں آتا، یقین کیجیے اس میں میرا ذرا بھر بھی قصور نہیں ہے۔ بس زمانہ ہی کچھ ایسا آگیا ہے کہ لوگوں میں نہ اخلاق باقی رہا ہے نہ دیانتداری۔ گزشتہ چند ماہ میں مَیں چمڑے کے کئی کارخانوں سے مال لا چکا ہوں کہ شاید کسی سے تو اچھی چیز مل سکے، مگر کہاں صاحب، یقین کیجیے ایک سے ایک بڑھ کر بے ایمان ہے۔ آپ ہی بتائیے ہم مال کہاں سے لائیں؟ مجبوراً یہی کوالٹی آپ کے ہاتھ بیچنا پڑتی ہے۔ آخر کاروبار تو چلانا ہی ہے نا؟"

موچی منہ بنا کر واپس چلا گیا مگر سوداگر سیدھا کارخانے دار کے پاس پہنچا اور گرج کر بولا۔

"بھائی صاحب آپ کے گھٹیا مال نے میرا ناک میں دَم کر دیا ہے۔ مجھے ہر وقت اپنے گاہکوں کے سامنے ندامت اُٹھانا پڑتی ہے۔ خُدا را کچھ تو شرم کیجیے اور..." کارخانے دار نے مدافعانہ انداز میں جواب دیا۔

"جناب، آپ بالکل بجا فرماتے ہیں، مگر یقین کیجیے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پہلے ہمیں نہایت عمدہ قسم کی خام کھالیں افراط سے مل جایا کرتی تھیں، قیمت بھی مناسب ہُوا کرتی تھی۔ اب خُدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ قیمتیں تو دُگنی تگنی ہیں مگر مال کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ٹھیکیداروں میں اخلاق کا اس قدر فقدان کبھی دیکھا تھا نہ سُنا تھا۔ کمبخت نہ جانے کہاں سے مریل جانوروں کی کھالیں

جمع کرلاتے ہیں :
سوداگر کے جاتے ہی کارخانہ دار خام کھالیں سپلائی کرنے والے ٹھیکیدار کے ہاں پہنچا اور وہی شکایت دُہرائی۔ ٹھیکیدار نے جواب دیا۔
"جناب، مجھے آپ جیسے مہربان دوستوں کی تکلیف کا مکمل احساس ہے مگر یقین جانیے اس میں میرا کوئی قصُور نہیں۔ میں یہ کھالیں آجڑیوں سے خریدتا ہوں جو ذبح خانوں میں جانور سپلائی کرتے ہیں۔ جب ہمارے ملک کے لوگوں کا اخلاق اچھا ہُوا کرتا تھا اُس زمانے میں کھالوں کی کوالٹی بھی نہایت عُمدہ ہوتی تھی۔ اب جیسے اخلاق باقی نہیں رہا اُسی طرح کوالٹی بھی ناپید ہوگئی ہے۔"
خام کھالوں کے ٹھیکیدار نے جب آجڑی پر غصّہ جھاڑا تو آجڑی نے جواب دیا: "آپ حق بجانب ہیں جناب لیکن اس میں میرا بھی تو کوئی قصُور نہیں۔ میں جانوروں کی کھالیں بیچتا ہوں، کوئی اپنی کھال تو نہیں بیچتا۔ اگر اپنی کھال بیچتا اور اُس کی کوالٹی میں ذرا بھر فرق ہوتا تو آپ کو گلہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ ہم لوگوں کے اخلاق کی طرح جانوروں کی کوالٹی میں بھی ہر روز گراوٹ بڑھتی جارہی ہے۔ قصُور تو اُن بیلوں کا ہے، جن کی کھالیں دن بہ دن ناقص ہوتی چلی جارہی ہیں۔"
جب کئی لوگوں سے ایسی ہی شکایات موصول ہوئیں تو آجڑی فکرمند ہوا۔ ایک روز ذبح خانہ جاتے ہوئے اُس نے ایک بیل کو گردن سے پکڑا اور کہا۔
"بیل میاں، تمہیں ذرا شرم نہیں آتی کہ مجھے ایک مریل قسم کی ناکارہ کھال مہیّا کرکے ہر گاہک کے سامنے میری شرمندگی کا باعث بنتے ہو۔ تمہاری نسل پہلے تو بڑی اچھی کھالیں مہیّا کرکے قوم کی نیک نامی میں اضافہ کیا کرتی تھی۔ اب وہ مضبوط اور جاندار کھالیں کیا ہوئیں؟"
بیل نے گردن جُھکالی۔ ذرا سوچ کر بولا۔
"بھائی اشرف المخلوقات، اس معاملے میں ہم بیلوں کا بالکل کوئی قصُور نہیں۔ اگر قصُور ہے تو تمہارے ہی بھائی بندوں کا ہے۔ ذرا مجھی کو دیکھو، میں اپنے مالک کو فائدہ پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ میرا گوشت، میری انتڑیاں، میرے سینگ، حتّٰی کہ میرا گوبر تک مالک کی خاطر ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص ایک نہ ایک دن مجھے ذبح کرکے میری کھال اُتارنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جس کا رزق کھاتا ہوں، اُسے مرتے وقت کم ازکم ایک پائیدار قسم کی کھال ہی تحفتاً دیتا جاؤں، لیکن انسان بھائی میں کیا کروں؟ زمانہ بدل گیا ہے۔ ہماری

کھال ہمارے باپ دادا کی کھالوں کی طرح مضبوط ہونے ہی نہیں پاتی ۔ اپنی کھال کو مضبوط اور فربہ بنانا آخر اپنے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔ اس کا دارومدار میری خوراک پر ہے اور جو خوراک آج کل مجھے ملتی ہے، اُسے خوراک کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ چارہ کہہ کر جو خوراک ہمیں کھانے کو دی جاتی ہے، اس میں گلے سڑے تنکوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ باجرہ ملتا ہے تو اس میں دو حصے مٹی اور ایک حصہ ریت ملی ہوتی ہے اور پھر خوراک کی جو مقدار پہلے ملا کرتی تھی، اب اُس سے آدھی بھی نہیں ملتی۔ ایسی خوراک کھا کر تو میں آپ کو عمدہ قسم کی کھال دینے سے معذور ہوں۔"

بیل نے آجرّمی کو تو لاجواب کر دیا مگر خود احساسِ ندامت سے نڈھال سیدھا اپنے مالک کے پاس پہنچا اور بولا۔

" مالک، کیا وجہ ہے کہ تم میری دیکھ بھال نہیں کرتے ؟ ایک تو خوراک بہت کم دیتے ہو، دوسرے اس خوراک میں نصف سے زیادہ ملاوٹ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ نہ میری ہڈیوں کی پرورش ٹھیک طریقے سے ہوتی ہے اور نہ کھال میں جان پڑتی ہے۔ مارکیٹ میں گھٹیا کوالٹی کی کھالیں بیچنے کی تمام ترذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے، مگر دنیا والے اس کا گلہ ہم سے کرتے ہیں۔"

بیل کے مالک نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میرے پیارے بیل ! ظاہراً قصوُر میرا ہی لگتا ہے، مگر دراصل میں بالکل بے قصُور ہوں۔ تمہاری خوراک کی چیزیں میں خود تو پیدا کرتا نہیں۔ مکئی، باجرہ، چارہ سب ضروریات مشہور تاجر محمّد خان سے خرید کر لاتا ہوں۔ اس نامراد نے نہ صرف تمہاری خوراک کی قیمتیں پہلے سے دُگنی تگنی کر دی ہیں، بلکہ سب چیزوں میں بے دریغ ملاوٹ بھی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں پہلے کی طرح نہ تو وافر مقدار میں خوراک مہیا کر سکتا ہوں، نہ خالص چیزیں کھلا کر تمہاری کھال میں پائیداری پیدا کر سکتا ہوں۔ زمانہ بدل گیا ہے، میرے پیارے بیل۔ اس ملک میں عزّت، ناموس، اخلاقی قدریں، سب برائے نام ہی باقی رہ گئی ہیں ۔ کہو اس میں میرا کیا قصوُر ہے؟"

بیل تو خاموش ہو گیا، لیکن اُس کا مالک اُٹھا، سیدھا محمّد خان کی دُکان پر پہنچا اور بولا۔

"خان صاحب آپ جانوروں کی خوراک اس قدر مہنگی بیچتے ہیں، مگر پھر بھی اس میں ستّر فیصد ملاوٹ کر دیتے ہیں، آخر یہ کہاں کا انصاف ہے ؟ آپ کی ان حرکتوں کی وجہ سے مجھے ہر روز اپنے بیلوں سے شکایتیں سُننا پڑتی ہیں۔ خُدارا کچھ تو سوچیے۔"

محمد خان نے جواب دیا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں جناب، لیکن یقین کیجیے اس میں میرا رتی بھر قصور نہیں ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ لوگوں میں اخلاق نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ پہلے ہمارے بیٹے کا جوتا پورا ایک سال چل جاتا تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ دو ماہ بھی مشکل سے نکلتا ہے۔ قیمت بھی پہلے سے دُگنی تگنی! محض جوتوں کا ہی یہ حال نہیں، کپڑا لتا، خورد و نوش کی اشیا، گھریلو استعمال کا سارا سامان، غرض کوئی ایسی چیز ایسی نہیں جس کی قیمت پہلے سے کئی گنا بڑھ نہ گئی ہو اور جس کی کوالٹی میں گراوٹ نہ آگئی ہو۔ ان حالات میں مَیں بھی مجبوراً دوسروں کے ساتھ وہی داؤ برتتا ہوں جو دوسرے میرے ساتھ برتتے ہیں۔ آخر بیوی بچوں کا پیٹ بھی تو سفید پوشی میں پالنا ہے۔ میں یہ سب کچھ خوشی خوشی نہیں کرتا، نہایت مجبوری کے تحت کرتا ہوں۔ اب اس میں میرا کوئی قصور ہو تو بتا دیں۔"

اگلے روز محمد خان پھر جوتے والے کی دکان پر گیا۔ جوتے والا موچی کے پاس، موچی چمڑے کے سوداگر کے پاس، سوداگر کارخانے دار کے پاس، کارخانہ دار خام کھالوں کے ٹھیکیدار کے پاس، ٹھیکیدار آجڑی کے پاس، آجڑی بیل کے پاس، بیل اپنے مالک کے پاس، اور بالآخر بیل کا مالک پھر محمد خان کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے دوسرے سے وہی گلہ کیا، اور ہر ایک کا وہی جواب تھا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں جناب، لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ نہ پرانی اخلاقی قدریں باقی ہیں نہ کسی کو اپنے نام کی پرواہ ہے۔ اگر قصور ہے تو میرے سوا قوم کے باقی تمام افراد کا قصور ہے۔"

باپ (بیٹے سے) "اگر تم کتے کو مارو گے تو میں تمہیں ماروں گا اور اگر تم نے کتے کے کان کھینچے تو میں تمہارے کان کھینچوں گا۔"

بیٹا (بڑی معصومیت سے) "ابو جی، اگر میں اس کی دُم کھینچ لوں تو؟"

طلعت حور۔ میمن۔ حیدرآباد

اعداد و شمار کے ماہر پروفیسر نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں کو بتایا کہ "اوسط درجے کا ہر آدمی روزانہ دس ہزار الفاظ بولتا ہے جب کہ اوسط درجے کی عورت روزانہ تیس ہزار الفاظ بولتی ہے۔" پھر آہ بھر کر بولے "بدقسمتی سے شام کو جب میں دفتر سے گھر پہنچتا ہوں تو اپنے دس ہزار الفاظ استعمال کر چکا ہوتا ہوں جبکہ میری بیوی اپنے تیس ہزار الفاظ بولنے کا آغاز کرتی ہے۔"

سُست رفتار گھونگھا
مچھلی کو پکڑنے کے لیے
اپنا تیز رفتار اور زہر آلود تیر مچھلی کی طرف ۔ بڑھا رہا ہے

گھونگھا شکاری مچھلی شکار

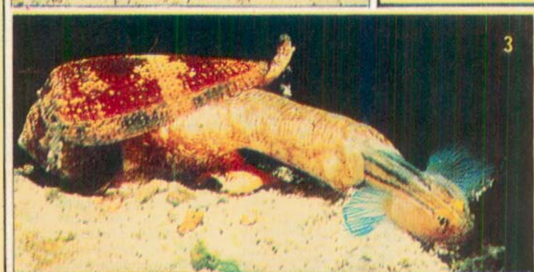

گھونگھے کا زہر آلود تیر برق رفتاری
سے مچھلی کے جسم میں لگا اور مچھلی
مفلوج ہو گئی۔

اب گھونگھے نے مچھلی کو نگلنا
شروع کر دیا۔

شکاری گھونگھے نے کس مہارت
سے پوری مچھلی کو ہڑپ کر لیا

جام جیلی مارملیڈ
اب نئے انٹرنیشنل پیک میں
AHMED PRESERVES
Produce of Pakistan
AHMED
RASPBERRY JAM
AHMED
APPLE JELLY
AHMED
ORANGE MARMALADE
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

سائنسی کہانی

آہ! مستقبل اب بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ تھا

عامر یونس

تیاری مکمل تھی ....

ڈاکٹر قدیر نے کیمرہ، ٹیپ ریکارڈر اور نوٹ بک کو چیک کیا۔ ڈاکٹر قدیر کے دونوں دوست پروفیسر سلام اور ڈاکٹر جعفری، اُس کی تیار کی ہوئی ٹائم مشین کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور ڈاکٹر قدیر وقت میں سفر کرنے کے لیے تیاری مکمل کر چکا تھا۔

"بھئی قدیر ... مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا ... دوبارہ بتاؤ ..." پروفیسر سلام ٹائم مشین کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اُفوہ ... بھئی میں ایک لمبے عرصے سے وقت اور رفتار پر تجربات کر رہا تھا۔ آئن اسٹائن نے جو تھیوری ان تینوں کے متعلق دی تھی، میں اس پر مزید آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے مطالعہ اور مختلف تجربات کرنے شروع کر دیے۔ یہ تو تم دونوں جانتے ہی ہو کہ دنیا میں سب سے زیادہ رفتار روشنی کی ہے۔ یہ جو وقت ہے۔ یہ بھی اُسی روشنی کی رفتار کی مناسبت سے آگے

بڑھتا ہے۔ دُنیا کے نظام میں تمام چیزیں روشنی کی رفتار کے مقابلے میں ساکت ہیں یعنی ان کی رفتار بہت کم ہے۔ اور اسی رفتار کی بنا پر ہمارے وقت کا نظام قائم ہے۔ اب اگر ہم اس دنیاوی نظام میں ہی روشنی کی رفتار جتنی رفتار پیدا کر سکیں تو پھر دُنیا کی باقی چیزیں اس کے مقابلے میں ساکت ہو جائیں گی یعنی اس کے لیے وقت تھم جائے گا۔ اب اگر رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ بڑھ جائے تو وہ باقی دنیا کے مقابلے میں بہت جلدی وقت میں آگے بڑھ جائے گا یا اگر ہم اس رفتار کو صحیح کنٹرول کر سکیں گے تو زمانے میں پیچھے بھی جا سکیں گے مگر میرے تجربات سے فی الحال زمانے میں آگے کی سمت یعنی مستقبل میں سفر کیا جا سکے گا... افوہ ... دیر ہو رہی ہے ... خیر تم یہ تو سمجھ گئے ہو گے۔"

"ہاں کچھ کچھ مگر یہ ناقابلِ یقین لگتا ہے ..." ڈاکٹر جعفری نے کہا۔

"ہاں ناقابلِ یقین تو لگتا ہے مگر میں جانوروں پر تجربات کر چکا ہوں اور آج پہلی دفعہ انسان کے اُوپر تجربہ کرنے والا ہوں ... اسی لیے میں نے تم دونوں کو یہاں بلایا تھا۔" ڈاکٹر قدیر نے بتایا۔

"اچھا... کس پر تجربہ کر رہے ہو ..." پروفیسر سلام نے پوچھا۔

"اپنے اوپر ..." ڈاکٹر قدیر نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا ..." دونوں سائنسدان چلّا اُٹھے۔

"ہاں ... اچھا اب تم دونوں آرام سے بیٹھو ... دیکھو میں نے کیمرہ ٹیپ ریکارڈ وغیرہ رکھ لیا ہے تاکہ مستقبل کو ان میں محفوظ کر سکوں ... میں نے ٹائم مشین پوری سیٹ کر دی ہے۔ تم کو صرف یہ دو بٹن دبانے ہوں گے۔ میں مشین کے اندر ہوں گا... اور بٹن دبنے کے بعد میں قوت کی شعاعوں میں تبدیل ہو جاؤں گا اور یہ شعاعیں روشنی سے دوگنی رفتار میں سفر کر کے مستقبل تک پہنچ جائیں گی۔ پھر وہاں سے واپسی کے لیے میں اپنے ساتھ ایک کنٹرول لے جا رہا ہوں۔ ویسے اس مشین میں ٹائم سیٹ ہے۔ باقی ... اللہ جانے... ٹھیک ہے۔ تم دونوں تیار ہو۔" ڈاکٹر قدیر سے تفصیل بتائی

"قدیر... تم نے سوچ لیا ہے ... دیکھو کچھ بھی ہو سکتا ہے ..." پروفیسر سلام نے کہا۔

"ہاں ... تمہاری جان کا خطرہ ہے۔ پہلے اچھی طرح سوچ لو..." ڈاکٹر جعفری نے بھی ہاں میں

ہاں ملائی۔

"نان سنس... میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب اگر تم نے میری مدد کرنی ہے تو ٹھیک ورنہ میرے اسسٹنٹ بھی یہ بٹن دبا سکتے ہیں..." ڈاکٹر قدیر نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔

"بہت بہتر قدیر۔ بس یہ یاد رکھنا کہ ہم نے تمہیں سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی۔"

"اوکے... لو میں مشین کے اندر داخل ہو رہا ہوں۔ ٹھیک پندرہ سیکنڈ بعد بٹن دبا دینا۔" اور ڈاکٹر قدیر ٹائم مشین کے اندر داخل ہو گئے۔

پھر پندرہ سیکنڈ بعد دونوں پروفیسروں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بٹن دبا دیے۔ ان کی نگاہیں ڈاکٹر قدیر پر جمی ہوئی تھیں۔ بٹن دبانے کے ساتھ ہی روشنی کا جھماکا سا ہوا اور صرف ایک لمحے کو ڈاکٹر قدیر ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ٹائم مشین سے نکل رہا تھا۔

"کیا ہوا... کیا ہوا..." دونوں ڈاکٹر قدیر کی طرف لپکے۔

"کیا ہوا... کچھ بھی نہیں... آؤ پہلے کافی پی لیں" ڈاکٹر قدیر نے کہا اور کافی نکالنے لگا۔

"کیا تم نے وقت میں سفر کر لیا یا نہیں۔ تم تو صرف ایک سیکنڈ کو نگاہوں سے اوجھل ہوئے تھے" پروفیسر سلام نے سانس لیے بغیر پوچھا۔

"ہاں... کوئی خرابی تو نہیں ہوگئی" ڈاکٹر جعفری بھی بہت پُرجوش نظر آ رہے تھے۔

"ہاں... میں نے مستقبل میں سفر تو کر لیا ہے..." ڈاکٹر قدیر نے کافی کی چسکی لے کر سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا...!!" ڈاکٹر جعفری اور پروفیسر سلام اُچھل پڑے۔

"ہاں... مگر..." ڈاکٹر قدیر دوبارہ سوچنے لگا۔

"مگر... مگر کیا..." دونوں پروفیسر قدیر سے تقریباً لپٹ ہی گئے۔

"مگر مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا کہ کیا ہوا تھا..."

"کیا..." ڈاکٹر قدیر کے جواب پر اس کے دونوں ساتھی ایک بار پھر چیخ اُٹھے۔ جذبات اور جوش کی وجہ سے ان دونوں کے چہرے لال ہو گئے تھے اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

"تمہیں۔ کچھ یاد نہیں آ رہا..." ڈاکٹر جعفری نے حیرانی سے اٹکتے اٹکتے پوچھا۔

"ہاں... کچھ بھی تو نہیں... پتا نہیں کیا ہوا..." ڈاکٹر قدیر نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"مگر تمہارا کیمرہ وہ ٹیپ ریکارڈ اور تمہاری نوٹ بک۔ ان سب کا کیا ہوا۔ ان کو تو دیکھو..."
پروفیسر سلام نے ایک اہم بات یاد دلائی تو تینوں ان چیزوں کی طرف لپکے۔ مگر یہاں بھی حیرت انگیز بات کا انتظار کر رہی تھی۔ کیمرہ بالکل بھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ فلم کا نمبر صفر پر تھا۔ یہی حال ٹیپ ریکارڈر کا تھا۔ ٹیپ بالکل خالی تھا۔ نوٹ بک بھی سادہ تھی۔ ڈاکٹر جعفری تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اوہ میرے خدا... یہ کیا ہوا تھا... سوچو قدیر، غور کرو۔ کچھ تو یاد کرو ہوا کیا تھا..." پروفیسر سلام بے چین ہو رہا تھا۔

"مجھے صرف ایک بات یاد آ رہی ہے..." ڈاکٹر قدیر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"کیا..." دونوں پروفیسر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہاں... مجھے یاد آ رہا ہے مجھے سب کچھ دکھا دیا گیا تھا... مستقبل میں پہنچ کر میں پوری دنیا کی تاریخ سے واقف ہو گیا تھا۔ آج سے لے کر دنیا کے اختتام تک کے تمام واقعات میرے سامنے تھے۔ مگر جب میں واپس ہونے لگا تو پتا ہے کیا ہوا..."

"کیا ہوا..." ڈاکٹر جعفری اور پروفیسر سلام نے پوچھا۔

"میرے سامنے ایک شرط رکھ دی گئی۔ اگر میں واپس جانا چاہتا تھا تو پھر مستقبل کے دیکھے ہوئے تمام واقعات وغیرہ کو میری یادداشت سے محو ہونا ضروری تھا... کیونکہ مستقبل کو کوئی نہیں جان سکتا... کوئی بھی نہیں۔"

"اور اگر تم یہ شرط نہیں مانتے..." پروفیسر سلام نے پوچھا۔

"تب میں واپس نہیں آ سکتا تھا... پھر زندہ دنیا سے میرا رابطہ کٹ جاتا... کیونکہ مستقبل صرف زندہ لوگوں کا ہوتا ہے۔ اور جن پر مستقبل ختم ہو کر ماضی ہو جاتا ہے وہ مُردہ کہلاتے ہیں۔ اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا..." ڈاکٹر قدیر کہہ رہا تھا اور بقیہ دونوں پروفیسر سن رہے تھے۔ مستقبل اب بھی انسانی نظروں اور ذہنوں سے دُور نامعلوم مصلحتوں کے دبیز پردوں میں چھپا ہوا تھا۔

ایک بچہ لہولہان ناک لے کر گھر پہنچا تو ماں نے تڑپ کر اس سے پوچھا "کیا بات ہوئی" بچے نے کہا "ایک لڑکے نے مجھے مارا ہے۔" ماں نے پوچھا "اگر تم اُسے دیکھو تو پہچان سکتے ہو؟" بچے نے سسکتے ہوئے کہا "میں اُسے کہیں بھی پہچان لوں گا۔ اُس کا ایک کان میری جیب میں ہے"

محمد اکرم سیالکوی

ننکانہ صاحب

حق اسکواڈ

اخلاق احمد

نیا ساتھی

آخری قسط

حق اسکواڈ میں ایک نئے رکن کا اضافہ

ایک پراسرار شخص حق اسکواڈ کے ارکان کا تعاقب کرتا تھا۔ ایک رات شہریار نے اس کا پتا لگانا چاہا تو اس خوفناک شکل کے آدمی نے اُسے بے ہوش کرکے اغوا کر لیا۔ حق اسکواڈ کے بقیہ ارکان اس کی چیخ سن کر وہاں پہنچے تو ان کو ایک سفید کار جاتی دکھائی دی۔ ادھر شہریار کو ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک دراز قد شخص اُسے نیکی کی سرگرمیوں سے تائب ہونے کی پیش کش کر رہا ہے۔ جس کے عوض ڈھیر سارے روپے ملنے کی نوید بھی تھی۔ شہریار نے اس کی پیش کش ٹھکرا دی۔ اس پر نقاب پوش نے ریوالور نکال لیا اور اپنے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا۔ وہ علاقے کا نیا اور نوجوان تھانیدار انسپکٹر سکندر تھا۔ اُس نے حق اسکواڈ کو ان کی ثابت قدمی پر مبارک باد دی اور قانون سے ہر طرح کا تعاون کرنے کی اپیل کی۔ اپنی آزمائش میں پورا اُترنے کے بعد حق اسکواڈ کے ارکان قانون کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ انسپکٹر سکندر نے ان کو ایک دن بلوایا۔ معلوم ہوا کہ نواب بابر علی کی حویلی میں کسی کا قتل ہو گیا ہے۔ وہاں پہنچنے پر ان کو معلوم ہوا کہ نواب بابر علی نے خودکشی کر لی ہے۔ انسپکٹر سکندر کے ہمراہ وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بڑی سی گھومنے والی کرسی پہ نواب بابر علی کی لاش پڑی ہے۔ میز پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔ ٹائپ کے برابر میں ایک سفید لفافہ بھی موجود تھا۔ لفافے پر لکھا تھا: "انسپکٹر سکندر کے لیے"۔ انسپکٹر سکندر اور حق اسکواڈ کے ارکان اس لفافے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نواب بابر علی کے قاتل کی گرفتاری کی سنسنی خیز داستان کے لیے آخری قسط ملاحظہ فرمائیے

وہ چاروں انسپکٹر سکندر کے ساتھ لاش کے سامنے کھڑے تھے۔ نواب بابر علی کا بےجان بدن گھومنے والی کرسی پر پڑا ہوا تھا اور ان بھتیجا نواب فراست علی ہلکی ہلکی سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔

انسپکٹر سکندر نے وہ لفافہ اُٹھا لیا جو نواب بابر علی کی لاش کے سامنے میز پر پڑا ہُوا تھا۔ لفافے پر لکھا ہوا تھا: "انسپکٹر سکندر کے لیے"

انسپکٹر سکندر نے لفافہ کھولا۔

اندر سے ایک تہہ کیا ہوا سفید کاغذ نکلا۔ یہ وہ خط تھا جو نواب بابر علی نے مرنے سے پہلے ٹائپ کیا تھا۔

لکھا تھا۔۔ "انسپکٹر سکندر۔۔۔ یہ خط میں بہت جلدی میں لکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں یہ خط تم تک پہنچے گا بھی یا نہیں۔ میں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مجھے قتل کیا جانے والا ہے۔ جس شخص کے ساتھ میں کاروبار کرتا ہوں، وہ مجھے قتل کر کے سارے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس شخص کا نام راشد انوار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت حویلی ہی میں کسی جگہ موجود ہے اور مجھے قتل کرنے کے لیے آنے ہی والا ہے۔ میرا ٹیلیفون خراب ہے۔ اس لیے میں تمہارے تھانے ٹیلی فون بھی نہیں کر سکتا۔ اور جوڑوں کے درد کی وجہ سے میں بھاگ کر فرار بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے پیارے بھتیجے نواب فراست کو آواز دے کر بلانے کے بارے میں سوچا تھا، لیکن ایک نوجوان کی زندگی خطرے میں ڈالنا مجھے زیادتی نظر آئی۔ وہ ویسے بھی میری جائیداد کا حق دار ہے۔ اگر آج میں مارا گیا تو میری جائیداد میری بیوی ثروت آرا اور میرے بھتیجے نواب فراست علی کے درمیان تقسیم ہو جائے گی۔ مجھے۔۔۔ مجھے ابھی ابھی ایک شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا سنائی دیا ہے۔ شاید۔۔۔ شاید میرا قاتل راشد انوار آ رہا ہے۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا۔ کاش میرے پاس قاتل راشد انوار سے بچنے کی کوئی صورت ہوتی۔۔۔ مجھے سناٹے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دے رہی ہے۔ کوئی اسی طرف آ رہا ہے۔ میرے کمرے کا دروازہ۔۔۔"

یہاں خط ختم ہو گیا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ اسی وقت قاتل نے نواب بابر علی کو گولی مار دی۔

انسپکٹر سکندر نے وہ خط شہریار کی طرف بڑھا دیا۔

باری باری وہ خط سب نے پڑھا۔
آخر میں وہ خط مرحوم نواب بابر علی کے بھتیجے نواب فراست علی نے پڑھا۔
"مجھے پہلے ہی شبہ تھا..." خط پڑھ کر وہ بڑبڑایا۔
"آپ کو کس پر شبہ تھا مسٹر فراست علی..." انسپکٹر سکندر نے تیزی سے پوچھا۔
"کسی پر نہیں..." فراست علی نے چونک کر کہا..." میں تو... یونہی... بس منہ سے بات نکل گئی"
"کیا آپ راشد انوار کو جانتے ہیں؟"
"جی... جی ہاں..." فراست علی نے کہا..." وہ چچا جان کا بزنس پارٹنر ہے۔ ایک ساتھ کاروبار کرتے تھے دونوں... کچھ عرصے سے دونوں میں کچھ ناراضگی سی تھی"
انسپکٹر سکندر نے کہا..." اتنی ناراضگی تھی کہ قتل ہو سکتا تھا؟"
"پتا نہیں" فراست علی نے کہا۔
انسپکٹر سکندر اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔" ہم ابھی آتے ہیں۔ یہاں پر کسی چیز کو چھیڑا نہ جائے۔ جو چیز جہاں رکھی ہے، وہیں رکھی رہے..."
شہریار، سرفراز، ضیا اور شہزاد بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور انسپکٹر سکندر کے پیچھے پیچھے حویلی سے نکل آئے۔
باہر جیپ میں بیٹھنے کے بعد سرفراز نے کہا..." آپ کا کیس تو آسانی سے حل ہو گیا انسپکٹر صاحب۔ خط میں قاتل کا نام لکھا ہے۔ اب تو صرف قاتل کو گرفتار کرنا ہے اور اس سے جرم کا اعتراف کرانا ہے"
انسپکٹر سکندر مسکرایا..." ہاں۔ بظاہر ایسا ہی لگتا ہے، لیکن کیس اتنی آسانی سے حل نہیں ہوتے" اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔
"آپ کہاں جا رہے ہیں...؟" ضیا نے پوچھا
"تم لوگ میرے گھر جا کر انتظار کرو۔ چائے وغیرہ پیو۔ میں اس مبیّنہ قاتل راشد انوار سے مل کر اور اُسے ساتھ لے کر آتا ہوں..."
ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد جیپ انسپکٹر سکندر کے مکان کے سامنے جا کر رُکی اور انسپکٹر سکندر نے ہارن بجایا۔

دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکی اندر سے نکلی۔
انسپکٹر سکندر نے کہا "بھئی، یہ میری بیٹی ہے سونیا... اور سونیا... یہ وہی ذہین لڑکے ہیں۔ جن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ حق اسکواڈ والے۔ تم انہیں گھر میں بٹھاؤ۔ چائے وغیرہ پلاؤ۔ میں کچھ دیر میں واپس آتا ہوں..."
وہ چاروں جیپ سے اُترے۔ جیپ روانہ ہو گئی۔ وہ انسپکٹر سکندر کی بیٹی سونیا کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔
ڈرائنگ روم میں اُنہیں صوفوں پر بٹھانے کے بعد سونیا نے کہا "تو تم لوگ ہو حق اسکواڈ والے..."؟
"ہاں..." سرفراز نے کہا... "تمہیں کوئی اعتراض ہے...؟"
سونیا نے کہا... "اعتراض تو نہیں ہے۔ لیکن مایوسی ہوئی ہے۔"
"کیوں...؟" ضیاء نے غصّے سے پوچھا۔
سونیا بولی "میرا خیال تھا کہ تم لوگ ذرا بڑے ہو گے... اور شکلوں سے زیادہ ذہین لگتے ہو گے... اور..."
"بس... بس..." سرفراز نے ہاتھ اُٹھا کر کہا... "ہمارا بھی خیال تھا کہ انسپکٹر سکندر کی بیٹی ادب آداب والی تمیز دار ہو گی۔ مایوسی تو ہمیں بھی ہوئی ہے..."
سونیا ہنس پڑی "میں تم لوگوں کے لیے چائے لے آؤں..." وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔
"عجیب لڑکی ہے..." شہزاد نے کہا۔
پھر وہ نواب بابر علی کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دس منٹ بعد سونیا ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی جس میں چائے کے علاوہ بسکٹ اور پھل وغیرہ بھی رکھے ہوئے تھے۔
چائے پینے کے دوران سونیا نے کہا "اچھا ہوا تم لوگ مل گئے۔ میں ایک بات کرنا چاہتی تھی۔"
"ایک نہیں دو باتیں کرو" سرفراز نے کہا۔
سونیا نے اِدھر اُدھر دیکھا، سر کھجایا، مسکرائی اور پھر بولی "بات دراصل یہ ہے کہ... کہ میں... میں بھی حق اسکواڈ میں شامل ہونا چاہتی ہوں..."
شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد... چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ مسکرائے... پھر ہنسے

اور پھر قہقہے مار مار کر ہنسنے لگے۔

سونیا سنجیدہ بیٹھی اُنہیں دیکھتی رہی۔

"کیا میں نے کوئی لطیفہ سُنا دیا ہے...؟" بالآخر اُس نے پوچھا۔

"لطیفہ ہی تو ہے..." شہزاد نے کہا: "تم بھلا حق اسکواڈ میں کیسے شامل ہو سکتی ہو... لڑکیاں بھی کبھی ایسے کام کر سکتی ہیں؟"

"لڑکیاں کیا نہیں کر سکتیں" سونیا نے کہا: "دنیا بھر میں لڑکیاں ہر وہ کام کر رہی ہیں جو لڑکے کر رہے ہیں، ٹرک چلا رہی ہیں، جہاز اُڑا رہی ہیں۔ خلاء میں جا رہی ہیں"

سونیا کی بات میں وزن تھا۔ شہریار غور سے اُسے دیکھ کر بولا: "لیکن حق اسکواڈ میں داخل ہونے کے لیے کسی نہ کسی بڑی خوبی کا، کسی بڑے ہنر کا ہونا ضروری ہے۔ ہم سب میں ایک ایک خوبی ایسی ہے۔ میں کراٹے اور جوڈو جانتا ہوں۔ سرفراز باڈی بلڈنگ کرتا ہے۔ ضیاء بہت تیز دوڑتا ہے۔ شہزاد بجلی کے آلات اور ایسی ہی چیزوں میں مہارت رکھتا ہے"

سونیا مُسکرائی: "میری بھی ایک خوبی ہے"

"وہ کیا ہے...؟" سرفراز نے پوچھا۔

"میں ہر بات یاد رکھتی ہوں، برسوں پُرانی بات ہو یا کل کی بات۔ جس چیز کو دیکھ لیتی ہوں، پھر بھولتی نہیں ہوں... معلومات ہوں، کسی جگہ کا پتہ ہو، کسی شخص کا چہرہ ہو، کوئی قول ہو۔ ہر بات کی تفصیل مجھے یاد رہتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میری یادداشت غیر معمولی ہے"

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے" شہریار نے کہا: "وقت آنے پر تمہیں شامل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے پہلے تمہیں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے دکھانا ہوگا"

اُسی وقت باہر سے جیپ کے ہارن کی آواز آئی۔ انسپکٹر سکندر آ گیا تھا۔

جب وہ چاروں باہر نکلے تو اُن کے پیچھے پیچھے سونیا بھی آ گئی۔

"ابّو جان" اس نے کہا: "میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گی"

"تم...!" انسپکٹر سکندر نے کہا: "تم کیا کرو گی..."

"بس، میں چلوں گی، آپ لوگوں کو دیکھوں گی..."

انسپکٹر سکندر نے اُسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔ آخر تھک ہار کر وہ سونیا کو اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا۔

جب وہ پانچوں جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تو اُنہیں احساس ہُوا کہ اگلی سیٹ پر کوئی شخص اوورکوٹ پہنے بیٹھا ہے۔

انسپکٹر سکندر نے جیپ اسٹارٹ کر کے روانہ ہونے کے بعد کہا: "یہ مسٹر راشد انوار ہیں۔ مرحوم نواب بابر علی کے بزنس پارٹنر۔ کاروباری ساتھی۔"

"میں آپ سے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں انسپکٹر صاحب۔" راشد انوار نے اوورکوٹ اپنے گرد لپیٹتے ہوئے، کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔" میں تو بخار میں پڑا ہوا تھا۔ گھر سے باہر نکلا ہی نہیں۔"

"سب پتا چل جائے گا راشد انوار صاحب۔ سچ جھوٹ سب سامنے آجائے گا۔" انسپکٹر سکندر نے جیپ چلاتے ہوئے کہا۔" اگر آپ بے گناہ ہیں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ نواب بابر علی کی حویلی پہنچے تو سب کچھ اُسی طرح تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ نواب بابر علی کی لاش اُسی طرح پڑی تھی۔ ٹائپ رائٹر کے سامنے وہ خط لفافے میں اُسی طرح رکھا تھا جو نواب بابر علی نے مرنے سے قبل ٹائپ کیا تھا۔ حتیٰ کہ نواب فراست علی بھی اُسی صوفے پر بیٹھا بالکل پہلے کی طرح سِسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

راشد انوار کی نظر جونہی لاش پر پڑی، وہ بُری طرح کانپنے لگا۔ انسپکٹر سکندر نے کہا "راشد صاحب میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ نواب بابر علی نے ایک خط مرنے سے پہلے میرے نام ٹائپ کیا تھا۔ قاتل نے اُنہیں خط مکمل کرنے کی مُہلت نہ دی۔ اس سے پہلے ہی گولی مار دی۔ نواب فراست ان کے بھتیجے ہیں۔ ٹائپ رائٹر کی آواز اُنہیں آئی تھی۔ پھر اُنہیں دھماکہ سُنائی دیا۔ دھماکہ ہوتے ہی یہ یہاں پہنچے تو قاتل اپنا کام کر کے فرار ہو چکا تھا۔ مرتے وقت انہوں نے جو خط ٹائپ کیا اس میں قاتل کی حیثیت سے آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔"

"خدا کی قسم۔" راشد انوار نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔" اللہ پاک کی قسم، میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں تو... میں تو اپنے گھر میں تھا... کل سے گھر سے نکلا ہی نہیں ہوں..."

اسی وقت کمرے میں سونیا کی آواز گونجی۔

"ابّو جان..." اس نے کہا "ایک بات بڑی عجیب ہے...!"

"کون سی بات"۔ انسپکٹر سکندر نے پوچھا۔
"نواب بابر علی مرنے سے پہلے یہ خط ٹائپ کر رہے تھے۔ قاتل نے گولی چلا دی اس لیے یہ خط ادھورا رہ گیا۔"
"ہاں ..." انسپکٹر سکندر نے کہا۔
"فراست علی صاحب کو ٹائپ کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر گولی کے دھماکے کی آواز آئی۔ یہ یہاں پہنچے تو قاتل فرار ہو چکا تھا۔ نواب بابر علی ہلاک ہو چکے تھے۔"
"ہاں ..."
سونیا نے کہا "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ اگر نواب بابر علی خط ٹائپ کر رہے تھے اور اسی وقت قاتل نے گولی چلا کر انہیں قتل کر دیا، جس کے باعث خط ادھورا رہ گیا۔ تو ... تو پھر ... تو پھر یہ خط ٹائپ رائٹر سے کس نے نکالا۔ اسے تہہ کر کے لفافے میں کس نے رکھا؟ جو آدمی مر رہا ہو اس کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے۔"
انسپکٹر سکندر کے علاوہ حق اسکواڈ کے چاروں ارکان کا منہ بھی حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنی سادہ سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
انسپکٹر سکندر نے کہا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو سونیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل نے یہ خط قتل کے بعد ٹائپ کیا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قاتل نے جان بوجھ کر راشد انوار کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کروانے کی کوشش کی۔ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟" انسپکٹر سکندر کی نظریں نواب فراست علی پر جمی ہوئی تھیں "یہ کوئی ایسا شخص ہی ہو سکتا ہے جسے اس قتل سے جائیداد ملنے کا فائدہ ہونے والا ہو۔ قاتل نے ایک طرف آدھی جائیداد حاصل کرنا چاہی اور دوسری طرف راشد انوار کو پھنسانے کی کوشش کی۔"
نواب فراست علی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ تیزی سے فرار ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر سیاہ رنگ کے اس چمکتے ہوئے ریوالور پر پڑ گئی جو انسپکٹر سکندر نے نکال لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔
کچھ دیر بعد جب وہ سب حویلی سے روانہ ہوئے تو انسپکٹر سکندر کے ساتھ والی سیٹ پر فراست علی ہتھکڑیاں پہنے بیٹھا تھا۔

راستے میں سونیا نے اُن چاروں سے پوچھا۔" اب بولو... مجھے حق اسکواڈ میں شامل کرنا ہے یا نہیں...؟ میں نے تمہیں اپنی ذہانت کا اتنا بڑا ثبوت تو دے دیا ہے "

سرفراز نے کہا۔" ہاں... تمہیں شامل تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک شرط ہے..."

"کیسی شرط..."؟ سونیا نے حیرت سے پوچھا۔

" تمہیں ہمارے نعرے کا جواب دینا ہوگا" یہ کہہ کر سرفراز نے چلتی ہوئی جیپ میں کھڑے ہو کر پوری قوت سے نعرہ لگایا..." حق اسکواڈ..."

" زندہ باد..." اس بار جوابی نعرے کی گونج میں شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد کے ساتھ سونیا کی آواز بھی شامل تھی۔

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا
مقبول ترین سلسلۂ تحریر
اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا

دلچسپ مجموعہ

برائیوں سے برسرِ پیکار
۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے
حسین سرورق - اعلیٰ طباعت
حق اسکواڈ کے حصول کے لیے
دس روپے کے
ڈاک ٹکٹ ارسال کیجیے،

ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے کے لیے ہمارا پتہ

گرین گائیڈ اکیڈمی

ڈی، ۱۱۲ نورس روڈ، سائٹ، کراچی ۱۶

جادو کا پانی

پیتے ہی عورت بچّی بن گئی

شیخ محمد اسماعیل
پانی پتی

بہت دنوں کی بات ہے۔ کسی جنگل میں ایک لکڑہارا اور اُس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ دونوں بوڑھے اور غریب تھے۔ لکڑہارا دن بھر گلہاڑی سے لکڑیاں کاٹتا اور شام کو انہیں شہر میں بیچ آتا تھا۔ لکڑہارے کی بیوی گھر کا کام کاج کرتی تھی۔

ایک دن لکڑہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اُسے بہت زور کی پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی کنواں یا تالاب نظر آئے، تو جا کر پانی پی لوں۔ مگر جب کچھ نظر نہ آیا تو اُس نے گلہاڑی ہاتھ سے رکھ دی اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں اُسے ایک تالاب مل گیا۔ جسے اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ تالاب صاف اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا تھا۔ پانی کو دیکھ کر لکڑہارے کی جان میں جان آئی۔ اُس نے تالاب کے کنارے بیٹھ کر دو تین چلّو پانی کے پیئے۔

خدا کی قدرت! پانی پیتے ہی بوڑھے لکڑہارے کے بدن کی ساری جھرّیاں جاتی رہیں۔ سر کے سفید بال سیاہ ہو گئے۔ پہلے منہ میں ایک بھی دانت نہ تھا اب سب دانت پیدا ہو گئے اور بوڑھا لکڑہارا آن کی آن میں جوان، ہٹا کٹا آدمی بن گیا۔

وہ بڑا حیران ہوا کہ ایکا ایکی یہ کیا ہو گیا۔ اُس نے جھک کر تالاب کے صاف پانی میں اپنی شکل دیکھی۔ تو وہ بالکل جوان کی سی نظر آئی۔ اب تو لکڑہارے کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اُس نے

لکڑیاں تو وہیں جنگل میں پھینکیں اور خوشی سے اُچھلتا کُودتا گھر کی طرف چلا۔

لکڑ ہارے کی بیوی نے جو ایک جوان آدمی کو گھر میں آتے دیکھا۔ تو پہلے تو ڈری۔ مگر جب لکڑ ہارے نے کہا۔ کہ "میں جادو کا پانی پی کر جوان ہو گیا ہوں"۔ تو بہت خوش ہوئی، اور کہنے لگی "مجھے بھی جلد اُس تالاب کا پتا بتاؤ۔ میں ابھی وہاں جاتی ہوں، اور جوان ہو کر واپس آتی ہوں۔ پھر ہم تم بڑے مزے میں رہا کریں گے"۔

لکڑ ہارے نے بہتیرا کہا۔ کہ "ٹھہرو میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلتا ہوں"۔ مگر اُس کی بیوی نے ایک نہ سُنی اور کہا "نہیں تم تھک گئے ہو گے۔ تم گھر میں بیٹھو اور مجھے اُس کا پتہ بتا دو، میں اکیلی جا کر پانی پی آؤں گی"۔

اس پر لکڑ ہارے نے اُسے تالاب کا پتہ بتا دیا۔ وہ اُسی وقت جنگل کی طرف چل دی اور تھوڑی دیر میں تالاب کے پاس پہنچ گئی۔

تالاب اُسی طرح پانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ خوشی خوشی تالاب کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُس نے سوچا۔ میں جتنا زیادہ پانی پیوں گی اُتنی ہی زیادہ جوان بن جاؤں گی۔ یہ سوچتے ہی اُس نے جلد جلد پانی پینا شروع کر دیا۔ اور ذرا سی دیر میں اتنا پی لیا کہ منہ تک آ گیا

اُدھر لکڑ ہارے کو انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی۔ مگر اُس کی بیوی گھر نہ پہنچی۔ آخر وہ بے چارہ اُسے ڈھونڈنے نکلا۔ وہ تالاب کی طرف گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تالاب کے پاس ہی ایک درخت کے نیچے زمین پر اُسے اپنی بیوی کے کپڑے پڑے ہوئے نظر آئے۔ دوڑ کر وہاں گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک چھوٹی سی بچّی جو کوئی دو ڈھائی برس کی معلوم ہوتی تھی۔ کپڑوں میں لپٹی ہوئی پڑی ہے۔

قصّہ یہ ہوا کہ لکڑ ہارے کی بوڑھی بیوی نے لالچ میں آ کر جادو کا پانی اتنا بہت سا پی لیا کہ وہ جوانی کی عُمر سے گزُر کر بچپن کے زمانے میں پہنچ گئی اور جوان ہونے کی بجائے چھوٹی سی لڑکی بن گئی۔ اگر وہ پیٹ بھر کر پانی نہ پیتی اور دو تین گھونٹ پی کر گھر چلی آتی۔ تو جوان بن جاتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ننّھی لڑکی نے بہت رنج کے ساتھ لکڑ ہارے کی طرف دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

لکڑ ہارا اُس کی صورت دیکھتے ہی بات کو سمجھ گیا۔ اُس نے بچّی کو گود میں اُٹھا لیا اور غمگین صورت بنائے گھر کی طرف چلا آیا۔

میں لڑکی ہوں

شاہنواز فاروقی

میں لڑکی ہوں ابّو مجھ سے پیار نہیں کرتے
کرتے ہوں گے پر اُس کا اظہار نہیں کرتے

فیصل مجھ سے چھوٹا ہے پر چونکہ لڑکا ہے
ابّو جی کے دِل میں دھڑکن بَن کے رہتا ہے

ابّو جب بھی شام کو دفتر سے گھر آتے ہیں
فیصل، فیصل، فیصل ہی کی ہانک لگاتے ہیں

فیصل کی ہر فرمائش ہے حاکم کا فرمان
فیصل ابّو کا مستقبل، ابّو کی پہچان!

فیصل کے گُڈّے کی پرسوں آٹھویں شادی ہے
لیکن میری گڑیا اب تک گھر پر بیٹھی ہے

فیصل گر اسکول نہ جائے کوئی بات نہیں
فیصل مجھ پر ہاتھ اُٹھائے کوئی بات نہیں

فیصل میری ہنسی اُڑائے کوئی بات نہیں
فیصل کوئی چیز گرائے کوئی بات نہیں

لیکن مجھ سے ہو جائے گر چھوٹا سا نقصان
ابّو جی فوراً جاری کر دیتے ہیں فرمان

بارہ سال کی ہو کر بھی ہو تم اب تک نادان
بوڑھی ہو کر بھی بن پاؤ تم شاید انسان

ابّو جی کہتے ہیں یہ تو مال پرایا ہے
یہ لڑکی ہے، یہ تو بس دو دن کا سایہ ہے

امّی کہتی ہیں شب کو جب میں سو جاتی ہوں
خوابوں کی البیلی دُنیا میں کھو جاتی ہوں

تب ابّو جی آکر میرا سر سہلاتے ہیں
سر سہلاتے ہیں اور آہستہ سے مُسکاتے ہیں

کاش کسی دن ایسے میں میں اِک دم جاگ پڑوں
تاکہ اپنے ابّو جی کے پیار کو دیکھ سکوں

نظر کی فریب کاریاں

وقاص اکرم، سنجوال

بس یا کار کے ذریعے سفر کا لُطف آپ سب نے اُٹھایا ہوگا۔ سڑک پر سفر کرتے ہوئے کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اس راستے پر ہم سے کچھ ہی آگے بہت سا پانی موجود ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ گاڑی چلتی رہتی ہے، پانی نظر آتا رہتا ہے مگر ہم پانی تک پہنچ نہیں پاتے.... پہنچیں بھی تو کیسے.... اس لیے کہ یہ تو محض ہماری نظر کی فریب کاری ہے جس سے ہم ایسا سمجھنے لگتے ہیں... ایسے فریبِ نظر کو "سراب" یا نظر کا دھوکہ کہتے ہیں۔ سراب ریگستانوں میں بہت نظر آتے ہیں۔ اکثر جانور ایسے سراب کو پانی سمجھ کر اُس کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بھٹک جاتے ہیں اور پیاسے مر جاتے ہیں۔

ہم آنکھ مچولی میں "فریبِ نظر" کے عنوان سے بہت سی دلچسپ چیزیں آپ کے مشاہدے کے لیے شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت ہم چند دلچسپ رنگین آئیٹم آپ کے ذوقِ تجسّس کی خاطر شائع کر رہے ہیں جو فریبِ نظر کی بہترین مثال ہیں۔ دو تصاویر تو واقعی انسانی حیرت کو بڑھا دیتی ہیں۔ یہ تصاویر نیویارک سٹی کے کیری گڈمین اور اُس کے ۱۴ سالہ بچے کی ہیں۔

آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ بھی فریب نظر ہے... غور کیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دراصل ایک ایسا کمرہ ہے جس کا ایک کونہ بہت چھوٹا ہے اور دوسرا بہت بڑا... اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اسی طرح رنگین صفحے پر نظر آنے والی سیڑھی کی تصویر بھی اس طرح لی گئی ہے کہ وہ ایک مکمل سیڑھی نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے
کیوں یقیں آتا نہیں

اس تصویر کی حقیقت سامنے کے صفحے پر دیکھیے۔ آپ سمجھ جائیں گے نظر کیسے دھوکہ کھا جاتی ہے

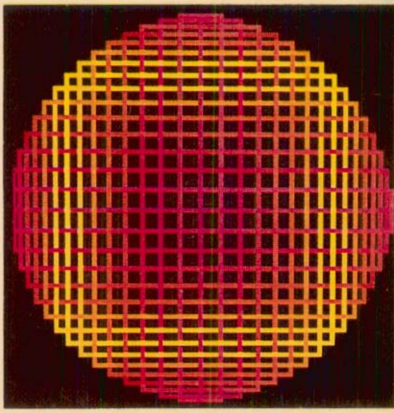

جہاں لائنیں ایک دوسرے کو قطع کر رہی ہیں وہاں آپ کو نقطے نقطے سے نظر آرہے ہوں گے
یہ نقطے نہیں فریبِ نظر ہے

بچہ اپنے ابّو سے بڑا تو ہو نہیں سکتا...؟ پھر یہ کیا چکر ہے؟

شیشے کے عمودی ٹکڑوں میں ڈھیر سارے نظر آنے والے دراصل صرف ۵ افراد ہیں۔

ارے... وہی ابّو اتنے بڑے ہو گئے... حقیقت کیا ہے؟
سامنے کے صفحے پر پڑھیے۔

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

Orient

خواب کہانی

ننّھا کانت پریوں کے درمیان

راجندر سنگھ بیدی

کانت بھولا بھالا رحم دل لڑکا تھا، اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، اُسے کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا۔ جب وہ اپنی بوڑھی خالہ سے کہانی سُن کر اپنے نرم گدگدے بستر پر لیٹتا تو اُسے طرح طرح کے خواب دکھائی دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کانت فرش پر لیٹا ہوا تھا کہ ایک بڑھیا روتی پیٹتی آئی اور کانت سے کہنے لگی "بیٹا! بہت دُور کا سفر کر کے آ رہی ہوں۔ کانٹے چُبھ جانے سے میرے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ اِس

جینے سے تو مرنا بہتر ہے بیٹا! اگر کچھ کھانے کو ہے تو اس بدنصیب بڑھیا کو دے"۔
کانت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دوڑ کر نانبائی کی دُکان پر پہنچا اور روٹیاں خرید لایا۔ جب بُڑھیا پیٹ بھر کر کھا چکی تو ڈاکٹر کو بلوا کر اُس کے پاؤں کی مرہم پٹی کروائی اپنا نرم بستر سونے کے لیے اُسے دیا۔ بڑھیا چارپائی پر لیٹتے ہی خرّاٹے لینے لگی۔ صبح کو اُٹھی تو دیکھا کہ ننھّا کانت فرش پر سو رہا ہے۔ سردی سے ٹھٹھرا جاتا ہے۔ ساری رات اسی حالت میں گزار دی ہے۔ بہت افسوس کیا۔ کانت کو جگا کر اُس کی پیشانی چُومی اور کہا "بیٹا! تو نے میرے لیے اتنی تکلیف اُٹھائی ہے۔ میں بھی اس کا بدلہ دیے بغیر نہ رہوں گی"۔ اس کے بعد محبّت بھرے لہجہ میں کہا "کانت مانگ کیا مانگتا ہے"۔
کانت نے تھوڑی دیر سوچ بچار کے بعد کہا "بڑی بی! مجھے پرستان کی سَیر کا شوق ہے"۔ بُڑھیا نے ہنس کر کہا "اوہ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ کل صبح سویرے ندی کنارے آجانا، میں تمہیں پرستان کی سیر کرالاؤں گی"۔
کانت بہت خوش ہُوا، کہ آخر مدت کی تمنا بر آئی، بڑی مشکل سے دن کاٹا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ننھّا کانت دوڑا دوڑا ندی کنارے گیا۔
ندی کے بیچوں بیچ کنول کا ایک پھُول کھلا ہوا دیکھ کر اُس نے چلاّ چلاّ کر کہنا شروع کیا۔۔۔
"اچھی اماں! جلدی آؤ۔ پرستان کی سَیر کراؤ"۔
آن کی آن میں پھُول کنارے کی طرف آنا شروع ہو گیا۔ جب پھُول کنارے آ لگا تو اُس میں سے وہی بُڑھیا نکلی۔ کانت اُسے دیکھ کر ڈرا پھر بڑھیا نے جو اصل میں پری تھی اُسے گود میں لے کر پیار کیا۔ اور کہا "دیکھو مشرق کی طرف وہ سُرخی سی کیسی ہے"؟ کانت نے اُدھر دیکھا۔ پری نے جھٹ پانی میں دھکا دے دیا۔ اور آپ غائب ہو گئی۔ ندی میں گرتے ہی کانت کو ایک بہت بڑا مگرمچھ نگل گیا۔ اور نگلنے کے بعد ندی کی تہہ میں جا پہنچا۔ یہاں ہر طرف ریت بچھی تھی، پر پانی نام کو بھی نہ تھا۔ مگرمچھ نے کانت کو صحیح سلامت باہر اُگل دیا۔ کانت کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سامنے اُسی بڑھیا کو کھڑے پایا۔ وہ اُس کے ساتھ ہو لیا۔
دونوں چلتے چلتے ایک باغ میں پہنچے۔ وہاں طرح طرح کے پھُول کھلے ہوئے تھے۔ خالص دُودھ کی نہریں جاری تھیں۔ ایک طرف سونے کا ایک تالاب تھا، جس میں ایک فوّارہ چھُوٹ

رہا تھا، فوّارے میں سے بجائے پانی کے امرت نکلتا تھا۔ درختوں پر پرندے طرح طرح کی راگنیاں گا رہے تھے۔ کانت نے ایک طرف اشارہ کر کے بُڑھیا سے کہا کہ "بڑی بی وہ سامنے شعلہ سا کیسا ہے؟" پری مُسکرائی اور کہنے لگی "بیٹا! شعلہ نہیں ہے۔ بلکہ پرستان کا سونے کا محل ہے۔ جس میں ہیرے موتی جڑے ہیں۔ جب سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو دُور سے وہ شعلہ سا معلوم ہوتا ہے۔"

آخر چلتے چلتے دونوں محل میں پہنچ گئے۔ محل کے اندر بھی طرح طرح کے پھُول کھِلے تھے گلاب، موتیا، گیندا، نیلوفر اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ محل کے کمروں میں پردے لٹک رہے تھے۔ پری نے پھولوں کے گرد چھڑی گھما کر کہا "پھولوں کی پریو! نکل آؤ!" اس کا یہ کہنا تھا کہ سب کلیاں چٹکیں اور اُن میں سے طرح طرح کی خوبصورت پریاں رنگا رنگ پوشاکیں پہنے نکل آئیں کانت ہکّا بکّا رہ گیا اور جب پیچھے مُڑ کر دیکھا تو بُڑھیا کی جگہ ایک جوان پری کو کھڑے پایا۔ یہ دیکھ کر وہ سہم گیا مگر اُس پری نے بڑی ملائم آواز میں کہا "کانت ڈرنے کی بات نہیں، میں وہی بُڑھیا ہوں، جس کو تو نے کھانا کھِلایا تھا۔ تمام پریاں میری رعایا ہیں اور میں ان کی ملکہ ہوں۔"

ملکہ کے حُکم پر پریاں ایک بہت بڑی میز لے آئیں جس پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ اس میز کے گرد اگرد سونے کی کُرسیاں رکھ دی گئیں۔ پریوں کی ملکہ نے کانت کو درمیان میں بٹھایا اور آپ میز کے ایک بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ملکہ اُٹھی، اور پرستان کی بولی میں تمام پریوں کو کانت کی مہربانی کا حال سُنایا، جسے سُن کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے کانت کو بہت سے کھلونے اور گڑیاں دیں۔ کانت بہت اُچھلا، کُودا، ناچا، گایا، پریوں نے اُسے طرح طرح کے کھانے کھلائے، پھل دیے۔ بہت رات گزری تو ملکہ نے کہا "کانت بہت دیر ہوگئی تمہاری امّی جان انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں یہ گڑیاں نوکر سے اُٹھوا کر تمہارے گھر پہنچائے دیتی ہوں۔ میری پریاں تمہیں گھر چھوڑ آئیں گی۔"

لیکن کانت کا دل یہاں سے جانے کو نہ چاہتا تھا۔ اُس نے رو کر کہا "اُوں! اُوں! میں تو نہیں جاؤں گا۔"

اتنے میں کانت کی آنکھ کھُل گئی۔ تو کیا دیکھتا ہے نہ وہاں پرستان ہے، نہ محل نہ پریاں فرش پر لیٹا ہے۔ امّی جان سرہانے کھڑی کہہ رہی ہیں "بیٹا کانت یہ تم خواب میں کس سے لڑ

ترسیلِ زر اپنے بینک کے ذریعے کیجئے۔

محفوظ بھی اور
باکفایت بھی

فوری ترسیل کے لئے
نیشنل بینک آف پاکستان

کی شاخیں ملک کے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔
کراچی اور لاہور میں ٹیلی فیکس کی سہولت بھی۔

Overseas Branches

United Kingdom	i) 18, Finsbury Circus, EC2M, 7BJ LONDON ii) 30, Sloane Street, Knightsbridge Branch London SWIX 9 NJ Also at Manchester, Sheffield, Birmingham, Bradford, Edinburgh, Glasgow.
United States	i) 100, Wall Street, P.O. Box 500, New York, N.Y. 10005, ii) I.U.N. Plaza, 1st Avenue, 44, East Street, New York N.Y. 10017, iii) 1825, Connecticut Avenue, N.W. Washington DC 20009 Also at Chicago.
Hongkong	324, Central Building, Queen's Road, G.P.O. Box 3920, Central Hong Kong Also at Kowloon.
West Germany	6000, Frankfurt Main Schwindstrasse-3, P.O. Box 101-643, Frankfurt.
France	90, Avenue Des Champs Elysees, 75008 Paris.
Japan	Mori Building No. 20, 7-4, 2, Chome, Nishi Shimbashi, Minato-Ku, P.O. Box Shiba 272, Tokyo 105-91.
Bahrain	9/10, Manama Centre, P.O. Box No. 775, Manama, State of BAHRAIN
Egypt	64, Gameat Al-Dawal, Al-Arabia Street, Mohandessin, Giza, P.O. Box No. 168 (Mohd Farid) Cairo.
Republic of Korea	Kyobo Building, 12th Floor 1-Chongro, 1-KA, Chongro-Ku KPO Box 1663, Seoul.
People's Republic of China	435, Kunlun Hotel, 21, Liangmaqiao, Chaoyang District Beijing.
Affiliate	Bank Al-Jazira, Saudi Arabia with 26 branches at all important cities of the Kingdom.

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک

PID-1-27/88

United

انگلستان کی کہانی

شانی ایوب

سدا بہار کہانی

بادشاہ کا نیا لباس

تیّار تو ہو گیا لیکن؟

یوں تو دُنیا کے سبھی بادشاہ بہت امیر ہوتے ہیں، لیکن یہ کہانی جس بادشاہ کی ہے وہ سب بادشاہوں سے زیادہ امیر تھا۔ اس بادشاہ کو اچھا لباس پہننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ دن میں ہر گھنٹہ بعد ایک نیا لباس پہنتا تھا۔ نئے سے نیا اور قیمتی سے قیمتی لباس تیار کرنے کے لیے بادشاہ دولت کو پانی کی طرح بہاتا۔

جب بھی کوئی شخص بادشاہ سے ملنے کے لیے آتا۔ بادشاہ کے ملازمین اُسے بتاتے کہ "بادشاہ

سلامت اس وقت اپنا لباس پہن کر دیکھ رہے ہیں۔" گویا بادشاہ رعایا کے مسائل سے زیادہ اپنے لباس پر توجہ دیتا تھا۔

بادشاہ لباس کے لیے اپنے جنون کے باعث دُور دُور تک مشہور تھا۔ لوگ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بادشاہ کو دیکھنے آتے۔ بادشاہ ہر ہفتہ شاہی باغ میں اپنا تازہ ترین سِلا ہُوا لباس پہن کر اُس کی نمائش کرتا تھا۔

کئی سو برس پہلے کی اس کہانی کے بادشاہ کے ساتھ بڑا ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔

ایک دن دو درزی بادشاہ کو ٹھگنے کی نیت سے محل پہنچے۔

"ہم دنیا کے سب سے اچھے درزی ہیں، ہم نہ صرف یہ کہ کپڑے سیتے ہیں بلکہ نہایت عمدہ قسم کے لباس کے لیے کپڑا بھی بُنتے ہیں۔"

درزیوں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ بادشاہ اُن کی باتیں دلچسپی کے ساتھ سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ نے اپنا نیا لباس منگوا کر درزیوں کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"کیا تم اس سے بہتر لباس تیار کر سکتے ہو؟"

"جنابِ عالی! ہم اس لباس سے کہیں عمدہ لباس تیار کر سکتے ہیں"۔ ایک درزی نے کہا۔

"حضورِ والا! ہم ایک خفیہ کپڑے سے بھی لباس تیار کرتے ہیں۔ یہ خفیہ کپڑا ہم دونوں خود بُن کر تیار کرتے ہیں۔" دوسرے درزی نے کہا۔

خفیہ کپڑے کے بارے میں سُن کر بادشاہ کو اور دلچسپی ہوئی۔

"اچھا! تم مجھے اپنے اس خفیہ کپڑے کے بارے میں کچھ بتاؤ۔" بادشاہ نے کہا۔

"جنابِ عالی! ہمارے بُنے ہوئے کپڑے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا بنا ہُوا لباس پہن کر جب آپ لوگوں کے سامنے جائیں گے تو صرف ذہین ترین لوگ ہی اس لباس کو دیکھ سکیں گے۔ احمق لوگوں کو وہ نظر نہیں آئے گا۔ اس طرح آپ اپنے وزیروں اور مشیروں کی ذہانت کا امتحان لے سکیں گے۔ اور آپ جان سکیں گے کہ کون آپ کی خدمت کے لائق ہے، اور کون نہیں۔ ایسا آدمی آپ کی خدمت کے لیے مناسب نہیں ہوگا اُسے اپنی حماقت کے باعث آپ کا لباس نظر ہی نہیں آئے گا۔ چنانچہ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ہم سے خفیہ کپڑے کا لباس بنوا لیں۔"

"واہ ... واہ" بادشاہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولا۔ "میں ضرور تمہارے خفیہ کپڑے کا بنا ہُوا لباس

پہنوں گا تاکہ میں جان سکوں کہ میرے خدمت گاروں میں کون احمق ہے اور کون ذہین۔"
چنانچہ بادشاہ نے دونوں درزیوں کو محل میں خفیہ کپڑا بُننے کے لیے کھڈیاں لگانے کی اجازت دے دی۔ بادشاہ نے دونوں کو بہت سارو پیہ دیا اور اُن سے کہا کہ اُنہیں جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو فوراً مجھے بتاؤ۔
بادشاہ خوش تھا اور دونوں درزی بھی، اُن کی چال کامیاب ہو رہی تھی۔ اُسی روز دونوں درزیوں نے شاہی محل کے ایک کمرے میں خفیہ کپڑا بُننے کے لیے بڑی بڑی کھڈیاں لگالیں۔
کھڈیاں لگا کر درزیوں نے بادشاہ کے نوکروں سے کہا: "ہم صرف عُمدہ ترین سونے کے سُوت سے کپڑا بُنتے ہیں۔" درزیوں کے حُکم کی تعمیل ہوئی اور اُنہیں عمدہ ترین سونے کی بڑی مقدار مہیا کر دی گئی۔ اگلے روز انہوں نے عمدہ ترین ریشم اور کچھ روپوں کی فرمائش کی۔ بالآخر وہ کپڑا بُننے کے لیے کھڈیوں پر بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھ پاؤں اس طرح چلانے لگے جیسے وہ کچھ بُن رہے ہوں، لیکن حقیقتاً کھڈیوں پر کچھ بھی نہ تھا۔
دونوں درزی صبح سے شام تک خالی کھڈیوں پر بیٹھے اُنہیں چلاتے رہتے۔ رات ہو جاتی تو دونوں اُٹھ کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے اور جاتے وقت اپنے ساتھ بادشاہ سے ملا ہُوا سونا اور قیمتی ریشم بھی لے جاتے۔ دن گزرتے گئے اور ہر صبح سے رات تک یہی ہوتا رہا۔
ایک دن بادشاہ نے اپنے وزیر سے خفیہ کپڑے کے متعلق پوچھا بادشاہ کا خیال تھا کہ خُفیہ کپڑا تیار ہونے ہی والا ہو گا۔ وزیر سے کافی وشافی جواب نہ ملا تو بادشاہ نے خود چل کر خفیہ کپڑے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اُسے فوراً ہی خیال آیا۔
"فرض کرو مجھے کپڑا نظر نہ آیا؟ فرض کرو میں کچھ احمق ہوں؟" اِس خیال کے آتے ہی بادشاہ نے درزیوں کے پاس خود جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بادشاہ نے اپنے ذہین ترین وزیر کو درزیوں کے پاس بھیج دیا، تاکہ وہ خُفیہ کپڑے کے بارے میں معلوم کر کے بادشاہ کو اطّلاع دے سکے۔
"یہ میرے سب وزیروں میں ذہین ترین ہے۔ یہ خُفیہ کپڑے کو یقیناً دیکھ سکے گا۔" بادشاہ نے سوچا۔۔۔
بادشاہ نے وزیر کو خُفیہ کپڑے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وزیر درزیوں کے پاس جا پہنچا۔ کمرے میں دونوں کھڈیوں پر درزی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کھڈیاں خالی تھیں۔ وزیر نے اپنی آنکھوں کو خوب اچھی طرح کھول کر کھڈیوں کو گھُورا۔

"میرے خدا! مجھے تو کھڈیوں پر کچھ بھی نظر نہیں آتا" وزیر آہستہ سے بڑبڑایا۔ مگر اُس نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خفیہ کپڑا احمقوں کو نظر نہیں آتا۔

درزیوں نے وزیر کو دیکھ کر اُسے اپنے قریب بُلایا۔ اُن میں سے ایک نے وزیر سے کہا۔

"بتائیے جناب! آپ نے کبھی اس کپڑے جیسے رنگ اور ڈیزائن پہلے کبھی دیکھے ؟"

وزیر نے گھُور کر کھڈیوں کی جانب دیکھا، مگر اُسے وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا، لیکن اُس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ یہ کہے کہ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ وزیر جانتا تھا کہ احمقوں کو خفیہ کپڑا نظر نہیں آتا۔

"ارے جناب کچھ تو کہیے" ایک درزی نے وزیر کو گھورتے دیکھ کر کہا۔

"بہت خوبصورت ... شاندار ... یقیناً اتنا خوبصورت اور شاندار کپڑا میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ بادشاہ سلامت اِسے دیکھ کر بے حد خوش ہوں گے" وزیر نے کہا۔

"شکریہ جناب! آپ کی تعریف کا بے حد شکریہ" درزیوں نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے وزیر کو کپڑے کے رنگوں اور ڈیزائن کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا۔ وزیر خاموشی اور غور کے ساتھ اُن کی باتیں سُنتا رہا، کیوں کہ اُسے یہ ساری باتیں جاکر بادشاہ کو بتانی تھیں۔

اُسی دن درزیوں نے مزید سونے کا مطالبہ کیا جو کہ پُورا ہوا، لیکن کھڈیاں ابھی تک پہلے کی طرح خالی تھیں ...

کچھ وقت اور گزر گیا۔ اس وقت تک خفیہ کپڑے کی خوب شہرت ہو چکی تھی۔ لوگ دُور دُور سے خفیہ کپڑے کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ لوگ وہاں آتے اور انہیں وہاں کچھ بھی نظر نہ آتا، مگر کوئی بھی اس بات کا اظہار نہ کرتا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ خفیہ کپڑا احمقوں کو نظر نہیں آتا۔

رفتہ رفتہ خفیہ کپڑا مُلک کی ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بن گیا۔ سب لوگ اُس دن کے منتظر تھے جب بادشاہ سلامت خفیہ کپڑے کا لباس پہن کر شاہی باغ میں اُس کی نمائش کریں گے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس لباس کی تیاری میں اب بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔

ایک دن بادشاہ انتظار کی کیفیت سے تنگ آکر خود ہی خفیہ کپڑے کو دیکھنے جا پہنچا، بادشاہ اپنے ساتھ اپنے اُن دو وزیروں کو بھی لے گیا جو خفیہ کپڑے کو دیکھ کر اُس کی بادشاہ سے بہت تعریف کر چکے تھے۔

کمرے میں دونوں کھڈیوں پر درزی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے

وہ کچھ بُن رہے ہوں - بادشاہ کو کھڈیوں پر کچھ بھی نظر نہ آیا، لیکن وہ اس کا اظہار نہ کر سکا -
" کس قدر خوبصورت کپڑا ہے " دونوں وزیر کھڈیوں کی طرف دیکھ کر گرمجوشی سے بولے - ان دونوں کا خیال تھا کہ دوسرے نے خُفیہ کپڑے کو ضرور دیکھا ہوگا -
" اُف میرے خدا! بادشاہ نے وزیروں کی توجہ پر تکلیف کے ساتھ سوچا " کیا میں احمق ہوں! کیا میں واقعی بادشاہت کے قابل نہیں ؟
لیکن اُس نے یہ کہا نہیں، بلکہ اس کے برعکس اُس نے زوردار آواز میں کہا -
" سچ مچ کپڑا بہت خوبصورت ہے "
" بادشاہ سلامت یقیناً اس ہفتہ اپنا نیا لباس پہن کر رعایا سے ہم کلام ہوں گے " دونوں وزیروں نے بادشاہ کو گویا مشورہ دیا - بادشاہ نے اُن کے مشورے کو قبول کیا -
چنانچہ وزیروں نے جاتے جاتے درزیوں کو حکم دیا کہ وہ کپڑا بُننے کا کام فوراً ترک کردیں اور اس کپڑے سے جتنی جلدی ممکن ہو بادشاہ سلامت کے لیے لباس سینا شروع کردیں -
حکم کے مطابق ہفتہ کے اختتام سے ایک دن پہلے درزیوں نے بادشاہ کا لباس سی کر تیار کردیا - ہفتہ کے دن پورے ملک میں زبردست جوش و خروش تھا - ہر آدمی کی خواہش تھی کہ وہ بادشاہ کا خفیہ کپڑے سے تیار شدہ لباس ضرور دیکھے -
اُس دن جس دن بادشاہ کو شاہی باغ پہنچ کر اپنے لباس کی نمائش کرنی تھی - دونوں درزی صبح کے وقت بادشاہ کے پاس آئے اور بولے
" حضورِ والا - خُفیہ لباس تیار ہے - اگر آپ اپنا پاجامہ اور کوٹ اُتار دیں تو ہم یہ لباس آپ کو پہنا کر دیکھ لیں "
بادشاہ نے ایسا ہی کیا -
بادشاہ جیسے ہی درزیوں کے مطابق اپنا نیا لباس پہن چکا - وزیروں نے نہایت تحسین آمیز انداز میں بادشاہ کے لباس کی تعریف کی، اگرچہ انہیں اس وقت بھی لباس نظر نہیں آرہا تھا، مگر انہوں نے اس کا اظہار نہ کیا -
" ذرا آئینہ تو دیکھیے حضورِ والا " درزیوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا - بادشاہ نے آئینہ دیکھا - اس دوران دونوں درزی لباس کی تعریف کرتے رہے -

"حضور کیا لباس ہے! بالکل مکڑی کے جالے کی طرح ہلکا پھلکا۔ شاید آپ کو معلوم ہی نہ ہو رہا ہو کہ آپ نے کچھ پہنا ہُوا ہے۔"

بادشاہ نے آئینہ دیکھا، اُسے آئینے میں اپنا آپ نظر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ صرف ایک قمیض اور نیکر پہنے ہوئے ہے۔ اُسے آئینے میں اپنے جُوتے نظر آئے۔ اپنا تاج نظر آیا، مگر اُسے کوئی کوٹ اور کوئی پاجامہ نظر نہ آیا۔ مگر اُسے یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بادشاہ درزیوں سے بہت خوش ہُوا اور اُس نے اُنہیں مزید انعام واکرام سے نوازا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بادشاہ کا جلوس مختلف شاہراہوں سے ہوتا ہُوا شاہی باغ کی طرف روانہ ہُوا۔ راستے میں کھڑے ہوئے لوگوں نے زبردست انداز میں بادشاہ کا استقبال کیا اور اُس کے نئے لباس کی تعریف کی، کسی بھی شخص نے یہ نہ کہا کہ اُسے بادشاہ کے جسم پر قمیض، نیکر، جوتوں اور تاج کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ بھلا کوئی یہ کہہ کر اپنے آپ کو احمق ثابت کیوں کرتا؟

سڑکوں پر جمع ہونے والے لوگوں میں دو بچے بھی تھے۔ بادشاہ جب جلوس کی قیادت کرتا ہوا اُن دونوں کے پاس آیا تو اُن دونوں نے محسوس کیا کہ بادشاہ قمیض نیکر، جُوتوں اور تاج کے سوا کچھ بھی پہنے ہوئے نہیں ہے۔

"ارے بادشاہ تو بغیر کوٹ اور پاجامے کے ہے" دونوں بچے زور سے چلّائے۔

"ذرا احمق بچوں کی بات تو سنو!" بزرگوں نے بچوں کی بات سُن کر طنزاً کہا۔

لیکن پھر فوراً ہی لوگ بچوں کی بات پر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ حتّٰی کہ جلوس میں شامل درباریوں اور وزیروں میں بھی یہی بات گشت کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ بات بادشاہ کو بھی معلوم ہو گئی۔

"ارے واقعی میں تو کچھ بھی پہنے ہوئے نہیں ہوں" یکایک بادشاہ کو احساس ہوا۔ بادشاہ اگرچہ یہ بات محل سے چلنے کے بعد سے سوچ رہا تھا مگر اُسے اس کا یقین نہیں تھا، مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ بادشاہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ سو اُس نے جلوس کی قیادت جاری رکھی۔ بادشاہ نے اپنا سر بلند رکھا۔ اور اپنے چلنے سے یہ ظاہر کرتا رہا کہ سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ بہت سے لوگ بھی یہی سمجھتے رہے۔

بادشاہ واپس محل میں آیا تو دونوں درزی وہاں نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنے احمق نہیں تھے کہ بادشاہ کی آمد تک وہاں ٹھہرتے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے اُنہیں بہت تلاش کرایا، مگر وہ مل کر نہ دیے۔

پھول

پروفیسر عنایت علیخان

پھول ہی پھول کھلے ہیں بچّو!
باغ میں آکر دیکھو تو !
کوئی ہے لال اور کوئی پیلا   کوئی سفید اور کوئی نیلا
کوئی سنہری اور چمکیلا   کوئی گلابی اور شرمیلا
باغ میں آکر دیکھو تو !
وہ دیکھو ننھّا سا پودا   بلّی جیسا پھول ہے اُس کا
اُس کے ساتھ جو پھول کھلا ہے   دیکھو ! بالکل بندر جیسا
باغ میں آکر دیکھو تو !
ایک طرف ہے رات کی رانی   پھول ہیں جس کے دھانی دھانی
رات کو اُس کی خوشبو لے کر   مست ہُوا ہوا اور مستانی
باغ میں آکر دیکھو تو !
نازک تتلی اُڑتی جائے   پھولوں سے جو رنگ ملائے
گلشن کے ماحول میں رہ کر   خود بھی اک گل ہی بن جائے
باغ میں آکر دیکھو تو !
شاخ پہ کوئل کوُکتی جائے   اُس کی رحمت کے گُن گائے
دُھول سے جس نے پھول بنا کر   باغ میں ہیں گل دان سجائے
باغ میں آکر دیکھو تو !
باغ میں آکر دیکھو تو !

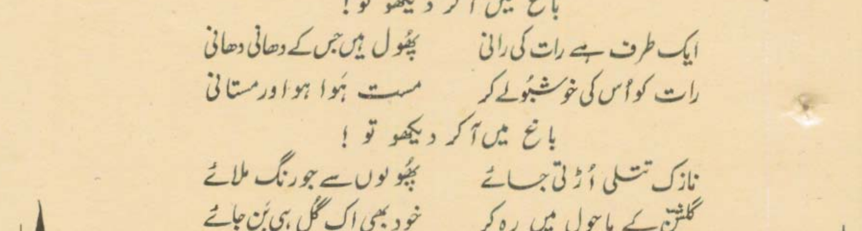

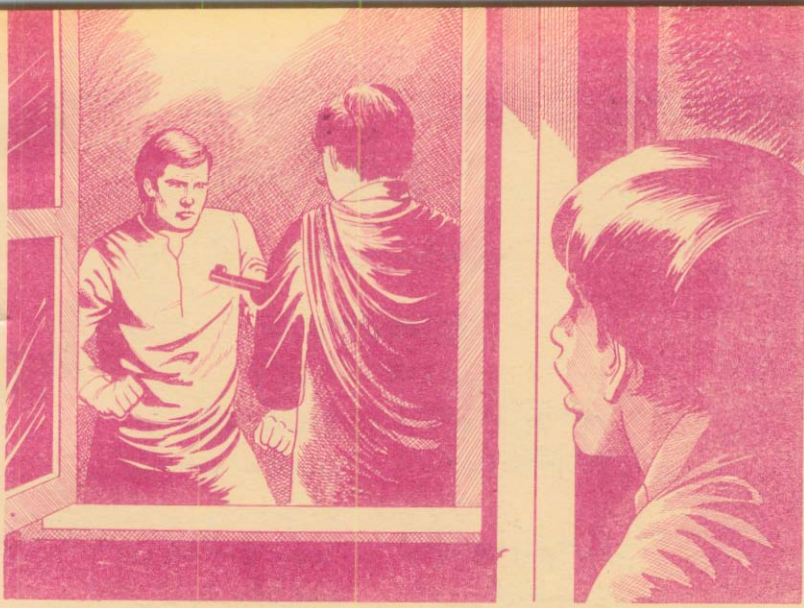

ڈاکہ

نعیم بلوچ

مبارک علی نے جب آنکھیں کھولیں تو کمرہ روشن تھا، وہ بستر پر سے اُٹھنے لگے تو بندوق کی نالی نے انھیں لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا اور ایک پھنکارتی ہوئی آواز آئی۔

"سیف کی چابیاں ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ ۔۔۔"

چہرے کو مکمل طور چھپائے ہوئے آدمی نے جملہ مکمل کرنے کے بجائے بندوق کی نالی ان کے سینے پر لگا دی۔ مبارک علی نے بولنا چاہا لیکن ان کی آواز حلق کے کانٹوں میں پھنس کر رہ گئی اور چند لمحوں کے بعد جو منظر اُن کے سامنے تھا، اُسے دیکھ کر تو ان کی آنکھیں خوف و دہشت سے بالکل پھیل گئیں۔ ان کی بیوی، دو بیٹے اور ایک ننھی بچی خوف سے تھر تھر کانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ تین آدمی ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ لیے، ان کے ساتھ تھے۔ مبارک علی کو اُٹھانے والے آدمی نے پستول والے ایک آدمی کو اشارہ کیا تو اُس نے ننھی رخسانہ کی طرف پستول کا رُخ کیا اور فائر کر دیا۔ گولی دیوار کو لگی۔

"یہ نہ سمجھنا کہ نشانہ غلط ہے۔ یہ صرف ایک وارننگ تھی۔ اب چابیاں چُپ چاپ میرے حوالے کر دو۔"

مبارک علی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑا کر قیمتی نرم قالین پر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ مبارک علی

اوران کے لڑکے اس کی طرف دوڑے مگر انھیں روک دیا گیا۔

"پہلے چابیاں ہمارے حوالے کرو۔۔۔" بے رحم آواز آئی۔

مبارک علی نے تکیے کے نیچے سے چابیاں نکال کر ان کے حوالے کر دیں۔ چابیاں لے کر ڈاکو اپنے کام میں لگ گئے۔ اور گھر کے افراد خاتون کو سنبھالنے لگے۔

کوٹھی کی پچھلی جانب سرونٹ کوارٹر میں لیٹے ہوئے ناجی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ آج بازار سے آئس کریم دیر سے لانے پر نوید نے اس کی جو درگت بنائی تھی اُس کا ایک ایک لمحہ اُسے یاد تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر نوید کا اس میں کیا کارنامہ ہے کہ وہ مبارک علی جیسے امیر کے گھر پیدا ہوا ہے۔ اور اگر اس نے غریب کے گھر میں جنم لیا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ پھر ہر چھوٹی بڑی بات پر اُسے اس کی غربت کا طعنہ کیوں دیا جاتا ہے؟ جب وہ اس گھر میں نیا نیا آیا تھا تو وہ دل میں سوچا کرتا تھا کہ میں ان تمام بچوں سے عمر میں کافی بڑا ہوں لیکن سب مجھے 'تُو' کہہ کر پکارتے ہیں۔ کیا صرف اس بڑے کی عزت کرنی چاہیے جو اپنے جیسا امیر ہو؟ لیکن ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ بہت ساری باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ بس جب بلاوجہ اس کی پٹائی کی جاتی' یا اس کی بے عزتی کی جاتی تو اس کے تمام زخم ہرے ہو جاتے۔ اور آج نوید نے اُسے بلاوجہ جو تھپڑ مارا تھا وہ اس کو بھلا نہیں پا رہا تھا۔ اس طرح کے ہر موقعے پر وہ سوچتا کہ اب اس کے ساتھ یہ زیادتی کی گئی تو وہ ملازمت چھوڑ دے گا۔ لیکن اُس کی غربت اُسے اپنا یہ فیصلہ ہر اگلی زیادتی تک ٹال دینے پر مجبور کر دیتی۔ آنکھوں میں آنسو لیے وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اُسے گولی چلنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ آواز کی سمت بھاگ اُٹھا۔ کمرے سے باہر نکلا تو اُسے پوری کوٹھی میں سے صرف مبارک علی کا بیڈروم روشن نظر آیا۔ وہ دبے پاؤں اس کی طرف چل دیا۔

کمرے کے قریب پہنچ کر اُسے بچوں کے رونے کی گھٹی گھٹی سی رونے کی آواز سُنائی دی۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ جیسے اُس نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ایک گرجدار آواز سُن کر اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ دروازے کے قریب آ کر رُک گئے۔

"انھیں چُپ کراؤ ورنہ اس بندوق کی گولیاں انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چُپ کرا دیں گی۔"

ناجی کچھ لمحے بُت بنا کھڑا رہا۔ جب صورتحال اس کی سمجھ میں آئی تو اس کے دل میں پہلا خیال یہ آیا۔۔۔ "دولت پر غرور کی سزا مل رہی ہے۔ جب سب کچھ لوٹ کر لے جائیں گے تو دیکھوں گا پھر اپنی امیری پر کیسے اتراتے ہیں!۔۔۔ مگر اگلا خیال جو اس کے دل میں آیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔۔۔ "انہیں خدا نے دولت دی۔ لیکن وہ اس آزمائش میں پورے نہ اُترے، مگر تمھیں بھی تو خدا نے مظلوم بنا کر آزمایا ہے۔۔۔ تم بھی انتقام اور حسد کی آگ میں جل کر ان کی طرح اپنی آزمائش میں ناکام ہو رہے ہو۔ نہ وہ

آزمائش میں پورے اُترے نہ تم۔ کیا فرق رہا ان میں اور تم میں ؟" ناجی نے اپنے ضمیر کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ وہ کوئی آواز کیے بغیر ٹیلی فون تک پہنچنے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن ٹیلی فون بالکل خاموش تھا۔ ڈاکو اس کے تار پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ اس ناکامی کے بعد وہ بجلی کے مین سوئچ کی طرف بڑھا۔ اس نے سوئچ آف کرنے کے بعد ایک فیوز بھی نکال لیا۔ پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔ اب وہ تیز قدموں کے ساتھ کوٹھی سے باہر جا رہا تھا۔

ڈاکوؤں کا ایک ساتھی کوٹھی سے باہر گاڑی میں بیٹھا بے چینی سے اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی نظریں اس کمرے پر ٹکی ہوئی تھیں جس میں اُسے روشنی نظر آ رہی تھی۔ پھر یکدم اس کمرے میں بھی تاریکی چھا گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر دوڑائی اور پریشانی سے بڑبڑایا... "ابھی تو پانچ منٹ باقی ہیں۔ پلان کے مطابق۔ اور لائٹ کا آف کرنا بھی تو منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔" اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ وہ کوٹھی کے اندر جانا چاہتا تھا لیکن منصوبے کے مطابق وہ صرف بڑی بندوق کا فائر سُن کر ہی کوٹھی کے اندر جا سکتا تھا۔

"خبردار کسی نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی۔" لائٹ آف ہونے پر ڈاکوؤں کے سردار نے گرج کر کہا۔ اس نے فوراً جیب سے سگریٹ سُلگانے والا لائٹر نکالا۔ لائٹر کی مدھم سی روشنی جب کمرے میں پھیلی تو مبارک علی کا بڑا بیٹا نوید نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے دروازے کی طرف دیکھا، لیکن وہ بند ہی تھا۔ ڈاکو پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ انھوں نے ابھی سیف سے سارے زیورات اور رقم نہیں نکالی تھی، اس لیے ابھی ان کا واپسی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو کوئی اشارہ کیا۔ اور پھر بندوق کا ایک زبردست فائر ہوا۔ فائر کی آواز سُن کر صوفے کے پیچھے دبکا ہُوا نوید باہر نکلا۔ آیا اور جا کر اپنے باپ سے لپٹ گیا۔ اور کانپتے ہوئے بولا۔

"ابّو، مجھے اندھیرے سے ڈر لگ رہا ہے۔"

ڈاکوؤں کا سردار سخت غصّے کے عالم میں نوید کی طرف بڑھا۔ زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ نوید بلبلاتا ہوا گر پڑا۔ باقی ڈاکوؤں نے اپنی بندوقیں گھر کے دوسرے افراد کی طرف سیدھی کر رکھی تھیں تاکہ کوئی حرکت نہ کرے۔ وہ اب اپنے ڈرائیور کا انتظار کر رہے تھے۔

ناجی دبے پاؤں کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی تو باہر نہیں ہے؟ کوٹھی کی بائیں نکڑ کے قریب اُسے ایک کار نظر آئی۔ اتنی رات گئے۔ بغیر کسی لائٹ کے کسی کار کا اس طرح کھڑے ہونا ناجی کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہ گاڑی ڈاکوؤں کی ہو سکتی ہے۔ وہ دروازے سے چپکا ابھی کار کو ہی دیکھ رہا تھا کہ فائر کی آواز آئی۔ اس کے دل کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔ اتنی بات تو وہ سمجھ ہی رہا تھا کہ گھر والوں نے کچھ کام دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اچانک ایک دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اگر کار میں ڈاکوؤں کے اور ساتھی موجود ہوئے تو وہ اب اندر مدد کے لیے ضرور جائیں گے۔ وہ ابھی اسی خیال میں تھا کہ اُسے باہر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ ناجی فوراً لان کی طرف دوڑا۔ اور ایک بڑے سے مور پنکھ کے پودے کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک سایہ گیٹ کے قریب سے کوٹھی کے اندر کُودا۔ وہ سیدھا اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں پہلے روشنی تھی۔ ناجی نے سوچا کہ کیوں نہ وہ کیاری سے اینٹ اکھاڑ کر اس کا سر پھوڑ دے۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے اینٹ پر زور آزمائی شروع کر دی۔ مگر اس کے اینٹ اکھاڑنے سے پہلے سایہ اس کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں دبکا رہا۔ ایک دو منٹ کے انتظار کے بعد وہ پھر گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ کے قریب سے اس نے دیوار پھلانگی اور کار کی طرف بڑھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اس کے ٹائروں سے ہوا نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ڈرائیور نے ایک دروازہ کھولنے کے بعد اپنے منہ سے رات کو بولنے والے ایک کیڑے کی آواز نکالی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ایک ساتھی اس کے پاس آیا۔ اور اس کو اس کمرے میں لے آیا جہاں تمام لوگ موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کے سردار نے اس سے پوچھا "فائر کی آواز زیادہ تو نہیں تھی؟"

"کافی تھی... لیکن اتنی نہیں کہ سوئے ہوئے لوگ جاگ جائیں... لیکن فائر کی ضرورت کیوں پڑی؟ اور یہ لائٹ کیوں آف...؟"

سردار نے اس کا جملہ کاٹا اور بے صبری سے پوچھا "تو کیا باہر لائٹ ہے؟"

"ہاں... بالکل ٹھیک...!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں کوئی اور بھی ہے اور اُسے ہماری موجودگی کا علم ہے۔" ایک ڈاکو نے انتہائی فکرمندی سے کہا۔

ڈاکوؤں کے سردار نے مبارک علی کو دھکا دے کر گرایا اور بندوق ان کی گردن پر رکھ کر انتہائی خونخوار لہجے میں بولا۔

"جلدی بتاؤ، گھر میں اور کون کون ہے...؟"

"وہ... وہ... لڑکا ہے... ہمارا نوکر... ناجی... اور کوئی نہیں ہے۔" انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

تمام ڈاکو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اچانک سردار کے ذہن میں کوئی بات آئی اُس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا "انہیں غسل خانے میں بند کر دو۔"

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ خاموشی سے چھپ جائیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد غسل خانے میں سے شور کی آوازیں آنے لگیں ..."بچاؤ... کوئی ہے ... ڈاکو" اور دروازے کو زور زور سے پیٹنے کی آوازیں۔ ڈاکو بھی یہی چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی اور گھر میں موجود ہو تو وہ یہ آوازیں سُن کر ضرور مدد کو پہنچے گا۔ اور وہ اُسے قابو میں کرلیں گے۔ ان کی ترکیب بلاشبہ بہت اچھی تھی۔ لیکن ناجی اس وقت گھر سے باہر کسی اور کام میں مصروف تھا۔

ناجی نے گاڑی کے ٹائروں سے ہوا نکالنے کی پوری کوشش کی لیکن اُسے ذرا بھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر وہ کوئی اور ترکیب سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس نے گاڑی کے اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھُل گیا اور پھر جب اُس نے دیکھا کہ ڈرائیور چابیاں گاڑی میں چھوڑ گیا ہے تو اس نے لپک کر چابیاں جیب میں ڈالیں اور ساتھ والی کوٹھی کی طرف بھاگ اُٹھا۔ جاتے ہی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ وہ گھنٹی کو وقفے وقفے سے دباتا رہا۔ دو منٹوں کے بعد اس نے کسی کے قدموں کی آواز سُنی۔ پھر ایک اُکتائی ہوئی آواز سُنائی دی "کون ہے بھئی اس وقت؟"

ناجی نے آواز پہچان لی' یہ اس گھر کے چوکیدار ریاض کی آواز تھی۔ ناجی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُسے دروازے کے قریب آنے دیا۔ جب چوکیدار نے دوبارہ ذرا اونچی آواز سے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے سرگوشی کے انداز سے کہا۔ "میں ناجی!

چچا ریاض ... ہمارے گھر میں ڈاکو آگئے ہیں ... دروازہ کھولو... جلدی ..."

اگلے دو منٹوں کے بعد مبارک علی کے ہمسائے شیخ اکرام اللہ پولیس کو فون کر رہے تھے کہ وہ فوراً پہنچ جائے ورنہ اگر کسی قسم کا کوئی نقصان ہوا تو ذمّے داری پولیس کی ہوگی۔

ناجی اور چوکیدار ریاض گیٹ سے لگے ڈاکوؤں کے باہر آنے کا انتظار کر رہے۔ جب انھوں نے مبارک علی کی گاڑی کو باہر آتے دیکھا تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ گاڑی باہر آتے ہی بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر بھاگنے لگی، لیکن سامنے سے ایک اور گاڑی کی لائٹیں ایک دم روشن ہوئیں اور پھر فائرنگ کی آواز سارے علاقے میں گونج اُٹھی۔ ڈاکو جس گاڑی میں تھے اس کے اگلے دونوں ٹائر پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ اور ان کے لیے بھاگنے کا کوئی موقع نہ تھا۔

صبح مبارک علی سمیت تمام گھر والے اپنے بے رحم رویے کی ناجی سے معافی مانگ رہے تھے۔ ناجی نے بُرائی کے بدلے بھلائی کرکے ان کو جیت لیا تھا۔

اس ماہ کے منتخب لطائف

کھٹ مٹھے

انعامی لطیفہ

کمرۂ امتحان میں نگران نے ایک طالب علم کو دیکھ کر اس سے پوچھا "بیٹے کیا سوال بہت مشکل ہے؟"

طالب علم "نہیں! میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس سوال کا جواب میری کونسی جیب میں ہے۔"

محمد رفیع ۔ گاؤں کوٹیاں

ایک دوست دوسرے سے "میں نے آج خواب میں دیکھا ہے کہ میں شہد میں لت پت ہوں اور تم کیچڑ میں۔"

دوسرا دوست "میں نے آج اس خواب کا دوسرا حصہ دیکھا ہے کہ تم مجھے چاٹ رہے ہو اور میں تمہیں۔"

قمر محمود ۔ سکھر

ایک مرغی خانے کے مالک کو دیانتدار ملازم کی ضرورت تھی، ایک امیدوار آیا۔ مالک نے اس سے پوچھا "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم انڈے چوری کر کے نہیں کھاؤ گے؟"

امیدوار نے جواب دیا "میری دیانت کا اندازہ اس طرح لگائیں کہ میں ایک حمام میں تین سال تک ملازم رہا۔ اور ایک مرتبہ بھی نہیں نہایا۔"

عبدالغفور ۔ حیدرآباد

ڈاکٹر مریض سے "تم تندرست نظر آرہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میری ہدایت کے مطابق آب و ہوا تبدیل کی تھی۔"

مریض "جی ہاں۔"

ڈاکٹر "کہاں گئے تھے؟"

مریض "ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس۔"

ممتاز احمد قریشی ۔ مکلی ٹھٹھہ

تین پروفیسر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ انھیں گاڑی آنے کی خبر تک نہ ہوئی، چند منٹ بعد انجن نے سیٹی دی تو وہ چونکے اور گھبرا کر ایک ڈبے کی طرف بھاگے۔ دو کسی طرح اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن تیسرے صاحب نہ چڑھ سکے۔

وہ مایوسی سے جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہے تھے۔ کہ ایک قلی اُن کے پاس آیا اور بولا۔

کوئی بات نہیں صاحب.... دوسری گاڑی سے چلے جانا۔" وہ تو میں چلا جاؤں گا۔" مگر ان لوگوں کا کیا ہوگا؟ وہ مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے سر ہلا کر جواب دیا۔

پرنس وسیم بن اشرف ۔ میاں چنوں

ایک صاحب گھر تبدیل کر رہے تھے۔ وہ سامان اٹھوانے کے لیے ایک مزدو کر کے لائے۔ اُسے سامان دکھایا اور بولے "بتاؤ اس سامان کو لے جانے کی کیا مزدوری لوگے؟"

مزدور نے سامان دیکھ کر کہا "حضور! بہت سی چیزیں ہیں، یہ دیکھیے نا میز ویز، کرسی دری، پلنگ ولنگ برتن ورتن۔ بستر وستر اور دوسری چیزیں وغیرہ ۔ ۵۰ر روپے لوں گا۔"

مالک بولا "تم آدھا سامان لے جاؤ میں تمھیں پچیس روپے دوں گا۔ میز لے جاؤ ویز رہنے دو۔ کرسی اٹھالو دری رہنے دو" پلنگ لے جاؤ ولنگ کی کوئی ضرورت نہیں، برتن اٹھالو۔ ورتن رہنے دو۔ بستر لے جاؤ۔ وستر چھوڑ دو اور بے شک وغیرہ وغیرہ بھی رہنے دو۔"

شیخ عاصم لطیف ۔ لاہور

"خاموش!" جج نے غصے سے کہا "عدالت میں اگر کسی نے شور مچایا تو اُسے نکال دیا جائے گا۔"

"ہا ہا ہا ہا!" ملزم نے فوراً شور مچا دیا۔

فیصل فیروز خلیجی کراچی

ایک خاتون نے اپنی نواسی سے پوچھا "بتاؤ بیس میں سے گیارہ گھٹا دیں تو کتنے بچیں گے؟"

بچی: "میں بچوں گی۔"

خاتون: "وہ کیسے؟"

بچی: "میں آپ کی نواسی ہوں نا۔"

مظہر اقبال ۔ ملتان

استاد۔ شاگرد سے، "بتاؤ سکندر نے ہندوستان پر کب حملہ کیا؟"

شاگرد: "جناب! اس وقت جیب میں وہاں نہیں تھا۔"

عائشہ خالد - کراچی

حسن (امجد سے) "میرا نام اخبار میں آیا ہے۔"
امجد (حیرت سے) "کیا لکھا ہے؟"
حسن: "لکھا ہے کہ پاکستان کی آبادی نو کروڑ ہو گئی ہے۔ اب ظاہر ہے نو کروڑ میں ایک میں بھی ہوں۔"

حسن مہدی خراسانی۔ فیڈرل بی ایریا کراچی

دو پہلوان، اکھاڑے میں کشتی لڑ رہے تھے۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ اچانک ریفری نے ایک پہلوان سے چلّا کر کہا: "یہ ٹانگ مت مروڑو، بے وقوف!"
"نہیں میں اُسے توڑ کر ہی دم لوں گا۔" پہلوان نے غصے سے کہا۔
ریفری نے چیختے ہوئے کہا: "لیکن یہ تمہاری اپنی ٹانگ ہے؟"

شمائلہ احسن، کینٹ اٹک

مُنا (باجی سے) "بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟"
باجی (غصے سے) "میرے سر میں۔"
مُنا: "اسی لیے آپ کی ناک بہتی رہتی ہے۔"

عابد حسین مہدی - ڈسکہ

ایک صاحب کو دفتر میں بہت زیادہ کام تھا۔ وہ اپنا کچھ کام گھر لے آئے اور کام میں لگ گئے۔ اتنے میں ان کا چھوٹا بھائی اپنی ماں کے پاس گیا اور بولا "امی کیا بھائی جان چوہے ہیں؟"
"نہیں بیٹا لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟" ماں نے پوچھا۔
"اس لیے کہ میں جب بھی ان کے پاس جاتا ہوں تو وہ کہتے ہیں، بھاگو یہاں سے، اس وقت میں بل بنا رہا ہوں۔"

سیدہ رضوانہ بتول کاظمی - کراچی

یہ مکھی کیوں تیر رہی ہے اس میں -

ایک استاد صاحب بہت اصول پرست تھے۔ انھوں نے اپنی کلاس کو ہدایت جاری کر رکھی تھی کہ ہر بات کہنے سے پہلے خوب سوچ لو بلکہ کوئی اہم بات کہنے سے پہلے سو تک گنتی گن لیا کرو۔ ایک صبح وہ پڑھا رہے تھے کہ اُن کے کوٹ کی پشت میں آگ لگ گئی۔ اُن کی نظر کلاس پر پڑی تو شاگردوں کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ساری کلاس چلّا اُٹھی: "اٹھانوے، ننانوے، سو... سر آپ کے کوٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

ابنِ مفرح دل - مردان

ایک پادری دورے سے واپسی پر ریلوے اسٹیشن پہنچا تو اُس کی جیب میں چند سکّے رہ گئے تھے۔ جو اُس نے قلی کو دے دیئے جب وہ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو ایک فقیر نے بڑھ کر دستِ سوال دراز کیا پادری بہت رحم دل تھا وہ بھول گیا کہ اس کی جیب خالی ہے وہ گداگر کو ساتھ لے کر اسٹیشن کی طعام گاہ میں پہنچا اور دونوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا جب بل دینے کا وقت آیا تو پادری کو یاد آیا۔ کہ اس کی جیب خالی ہے ۔گداگر نے اس کی پریشانی بھانپ کر خود بل ادا کیا۔ پادری بہت شرمندہ ہُوا اور بولا "مجھے اس واقعے کا دلی افسوس ہے اگر تم میرے ساتھ گھر چلو تو میں تمھیں بل کی قیمت ادا کر دوں گا۔"

گداگر بولا "معاف کیجیے گا۔ پہلے ہی جھانسا دے کر آپ نے مجھ سے کھانا کھا لیا ہے اب ٹیکسی کا کرایہ ہرگز نہیں دُوں گا۔"

کامران :۔ "بتاؤ آملیٹ کسے کہتے ہیں ؟

زاہد :۔ میرے خیال میں جو آم دیر سے پکتا ہے اُسے آملیٹ کہتے ہیں

محمد محبوب ڈھوک میاں راولپنڈی

جلسے کے بعد ایک سیاسی لیڈر نے اپنے سیکریٹری کو ڈانٹتے ہوئے کہا "میں نے تمھیں صرف پندرہ منٹ کی تقریر لکھنے کو کہا تھا مگر تم نے پورے ایک گھنٹے کی لکھ دی بولتے بولتے میرا منہ دُکھ گیا"۔ اس پر سیکریٹری نے کہا۔

"جناب میں نے تو صرف پندرہ منٹ کی تقریر لکھی تھی۔ مگر آپ تقریر کی چار کاپیاں لے گئے تھے۔"

مہارت کا ایک انداز

پروفیسر کی بیوی ۔ (اپنے شوہر سے) "غضب ہو گیا ننھے نے سوئی نگل لی ہے آپ فوراً گھر آ جیے۔"

پروفیسر: اس وقت کلاس میں ہوں، چالیس منٹ بعد آؤں گا۔"

بیوی: "بھاڑ میں جائے کلاس ۔معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے فوراً چلے آئیے۔"

پروفیسر: "کیا تمہیں سوئی ابھی چاہیے ؟

قاضی یاسر نعمان ۔ پشاور شہر

ایک بچّہ (دوسرے بچّے سے) "میرے والد صاحب کل ایک چمچہ لائے ہیں جس پر ان کا نام لکھا ہے"

دوسرا بچّہ "میرے والد صاحب بھی کل ایک چمچہ لائے ہیں لیکن چمچے پر ان کے نام کے بجائے "شیش محل ہوٹل لکھا ہوا ہے۔"

ایک اَن پڑھ آدمی کسی طرح انگلستان جا پہنچا۔ اُسے چونکہ انگریزی نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ پندرہ دن تک بھوکا پھرتا رہا۔ پندرہ دن بعد اُسے ایک دوست ملتا ہے تو وہ اُسے اپنی مشکل سے آگاہ کرتا ہے۔ دوست مشورہ دیتا ہے کہ کسی ریسٹورنٹ میں جاکر بیرے سے کہنا POTATO CHIPS (آلو کے چپس) تو وہ تمہیں کھانے کو لا دے گا۔ وہ آدمی اس کہے پر دو ماہ تک عمل کرتا رہتا ہے لیکن پھر ایک ہی چیز بار بار کھانے سے اُکتا جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ پھر دوست کو ڈھونڈ نکالتا ہے اور کہتا ہے کہ یار تم نے ایک ہی چیز بتائی تھی اب کے دوسری چیز کا نام بتاؤ۔ دوست نے کہا اب ریسٹورنٹ میں جاؤ تو چکن سوپ منگا لینا۔ چنانچہ وہ ریسٹورنٹ میں جاتا ہے اور بیرے کو چکن سوپ کا آرڈر دیتا ہے۔ بیرہ پوچھتا ہے SMALL CUP OR BIG (چھوٹا کپ یا بڑا) اب وہ صاحب بڑے گھبراتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہتے ہیں اور پھر آہستہ سے کہتے ہیں POTATO CHIPS

کھلاڑی: "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دوں۔

صحافی: "آپ کے اس اچانک فیصلے کی وجہ؟"

کھلاڑی: "دراصل میرے چچا نے سلیکشن بورڈ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔"

ایک بچہ بہت دیر سے تاریخ کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کے عروج و زوال کی تاریخ پڑھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُکتا گیا اور کتاب میز پر رکھتے ہوئے بڑبڑایا "ہونہہ! یہ بھی کوئی کتاب ہے کہ چند صفحوں سے زیادہ کوئی زندہ ہی نہیں رہتا۔"

ارشد عمران ارشی۔ مسلم ٹاؤن پنڈی گھیپ

بلاعنوان

ایک باپ اپنے بیٹے کی ڈنڈے سے پٹائی کر رہا تھا۔ اُسی وقت اُس کی ماں آگئی اور بچے کو اپنی پناہ میں لیتے ہوئے کہنے لگی "آخر میرے بچے نے کیا قصور کیا ہے کہ آپ اسے اس بُری طرح مار رہے ہیں؟" باپ نے کہا "میں ایک ہفتے کے لیے گھر سے باہر جا رہا ہوں اور کل اس کا رزلٹ نکلنے والا ہے۔ اور میں کل کا انتظار نہیں کر سکتا۔"

محمد ذیشان ایوب۔ (جگہ نامعلوم)

ایک آدمی کو ایک کچھوا پڑا ملا وہ اُسے ایک چوک میں کھڑے سپاہی کے پاس لے گیا اور بولا "مجھے یہ کچھوا ملا ہے میں اس کا کیا کروں" سپاہی بولا۔ "اسے چڑیا گھر لے جاؤ..."

اگلے روز وہی آدمی پھر اسی سڑک سے گزر رہا

تھا۔ کچھوا اس کے ساتھ تھا۔ سپاہی نے اُسے روک لیا اور پوچھا "میں نے تمہیں کہا تھا اسے چڑیا گھر لے جاؤ" وہ آدمی بولا "کل میں اسے چڑیا گھر لے گیا تھا اور آج فلم دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

مزمّل ۔ حیدرآباد سندھ

افریقہ کے آدم خور سردار کو ایک بار یورپ کے بحری جہاز پر سفر کرنے کا موقع ملا۔

دورانِ سفر بیرے نے "مینو" دیا۔ سردار نے کھانے کی فہرست پر نظر ڈالی اور پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"جناب! یہ فہرست ہے آپ جو چیز بھی کھانا پسند کریں، مجھے بتادیں۔"

"نہیں... مجھے اس فہرست کی ضرورت نہیں مجھے مسافروں کی فہرست لاکر دو۔"

(PIDC) محمد سلیم اختر ۔ ضلع دیر (سوات)

دو لال بیگ ایک ہوٹل کی نالی میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، کہ ایک لال بیگ نے دوسرے سے ٹیبلوں پر لگے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو سامنے رکھی صاف ستھری چیزیں کیسی بھلی لگ رہی ہیں" دوسرے لال بیگ نے فوراً کہا "کھانا کھاتے وقت ایسی گندی باتیں مت کرو مجھے متلی آنے لگتی ہے۔"

شکیل احمد راحت ۔ فیصل آباد

اُستاد: چیزوں کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے کیا کرنا چاہیئے؟

شاگرد: "جناب انہیں کھا لینا چاہیئے۔"

شازیہ ناز اکرم ۔ حیدرآباد

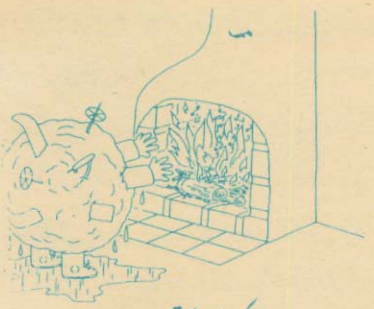

اسکیمو اور آتشدان

ایک آدمی بن بُلائے کسی شادی کی تقریب میں چلا گیا۔ جب میزبان نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو اُس نے بتایا کہ

"میں دولھا کے بھائی کے دوست کا دوست ہوں" میزبان سُن کر چل گیا۔ جب تمام مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا تو میزبان نے پیالی میں تھوڑا سا سالن ڈال کر اُس میں خوب پانی ملاکر اُس شخص کے آگے رکھ دیا۔ مہمان نے حیران ہو کر پوچھا کہ "جناب یہ کیا ہے؟" تو میزبان نے چلا کر کہا۔

"جناب یہ بکرے کے گوشت کے شوربے کے شوربے کا شوربا ہے۔"

شفاعت علی ۔ گوجرانوالہ

عورت: (دکاندار سے) "میں نے منّے کے ہاتھ تین کلو سیب منگوائے تھے، لیکن وہ ڈھائی کلو نکلے"

دکاندار: "میں نے پورے تولے تھے۔ آپ اپنے منّے کا وزن کروائیے۔"

صائمہ محمود ۔ لاہور

جاپانی کہانی

لوٹ کے بدّھو گھر کو آئے

سراج نظامی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جاپان میں دو مینڈک رہتے تھے۔ ایک نے شہر اوساکا کے قریب کسی جوہڑ میں گھر بنا رکھا اور دُوسرا شہر کیوٹو میں ایک صاف ندی میں رہتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی کسی جگہ کا سفر کیا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے دونوں کے دل میں سیر کا شوق چرایا۔ اوساکا کے مینڈک نے دل میں کہا۔ "شہر کیوٹو کی بڑی تعریف سُنتے ہیں۔ ذرا چل کر دیکھ آئیں۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ یہ حسرت تو دل میں نہ رہے گی۔"

اُدھر کیوٹو کے مینڈک نے خیال کیا "ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ جس نے اوساکا نہیں دیکھا اُس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس لیے اوساکا کی سیر ضرور کر لینی چاہیئے۔"

چنانچہ دوسرے دن صبح صبح دونوں مینڈک اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے گھر سے کبھی نکلنا نہیں ہوا تھا۔ یہ پہلا سفر تھا۔ اس لیے جلد ہی دونوں تھک گئے۔ مگر ہمت نہ ہاری۔ اور برابر چلتے رہے۔

راستے میں ایک اونچا پہاڑ پڑتا تھا۔ جس کے اوپر سے گزرنا دونوں کے لیے ضروری تھا دونوں گھٹنوں چھلانگیں لگایا کیے۔ اور آخر جوں توں کرکے اُس کی چوٹی پر پہنچ ہی گئے۔

اتفاق کی بات۔ دونوں ایک ہی وقت چوٹی پر پہنچے تھے۔ جیسے ہی آمنا سامنا ہوا۔ وہ حیران ہوئے۔ پہلے تو کچھ دیر ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر بات چیت شروع کی۔ دونوں نے اپنی اپنی رام کہانی کہہ سُنائی۔ چونکہ اس سفر سے دونوں بہت تھک گئے تھے۔ اس لیے کچھ دیر سستانے کو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

اوساکا کے مینڈک نے کہا "یار کتنے افسوس کی بات ہے کہ اللہ میاں نے ہمارا قد اونچا نہیں بنایا۔ ورنہ ہم یہیں سے بیٹھے بیٹھے ان شہروں کی سیر کر لیتے جہاں ہمیں جانا ہے"۔

کیوٹو کا مینڈک بولا "آؤ، ہم اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر کوشش تو کر دیکھیں۔ کیا عجب اس طرح اونچے ہو کر ہم ان شہروں کو دیکھ لیں"۔

اوساکا کے مینڈک کو یہ خیال بہت پسند آیا۔ پھر کیا تھا دونوں مینڈکوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنے اپنے سینے کو جس قدر تان سکتے تھے تان کر کھڑے ہو گئے۔ کیوٹو کے مینڈک نے اپنی ناک اوساکا کی سیدھ میں کر لی اور اوساکا کے مینڈک نے کیوٹو کی سیدھ میں لیکن بے وقوف یہ بھول گئے کہ ہماری بڑی بڑی آنکھیں ہمارے سر کے پیچھے ہیں اور اس طرح بجائے ایک دوسرے کا شہر دیکھنے کے ہم اپنے اپنے شہر ہی کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں سے ہم آئے ہیں۔

اوساکا کے مینڈک نے کہا "پیارے دوست۔ کیوٹو تو بالکل اوساکا جیسا ہے اگر مجھے یہ پہلے سے معلوم ہوتا۔ تو میں اتنا لمبا چوڑا سفر کبھی اختیار نہ کرتا۔ میں اب واپس جاتا ہوں"۔

کیوٹو کا مینڈک کہنے لگا "اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں۔ تو اوساکا عین بین کیوٹو کی طرح ہے۔ افسوس میں نے یہ ساری تکلیف ناحق اُٹھائی"۔

اس کے بعد دونوں مینڈک۔ بڑی محبت سے گلے ملے اور اپنے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔ وہ ساری عمر یہی سمجھتے رہے کہ اوساکا اور کیوٹو دونوں شہر بالکل ایک ہی جیسے ہیں۔

دادا ابّا کی شرارت

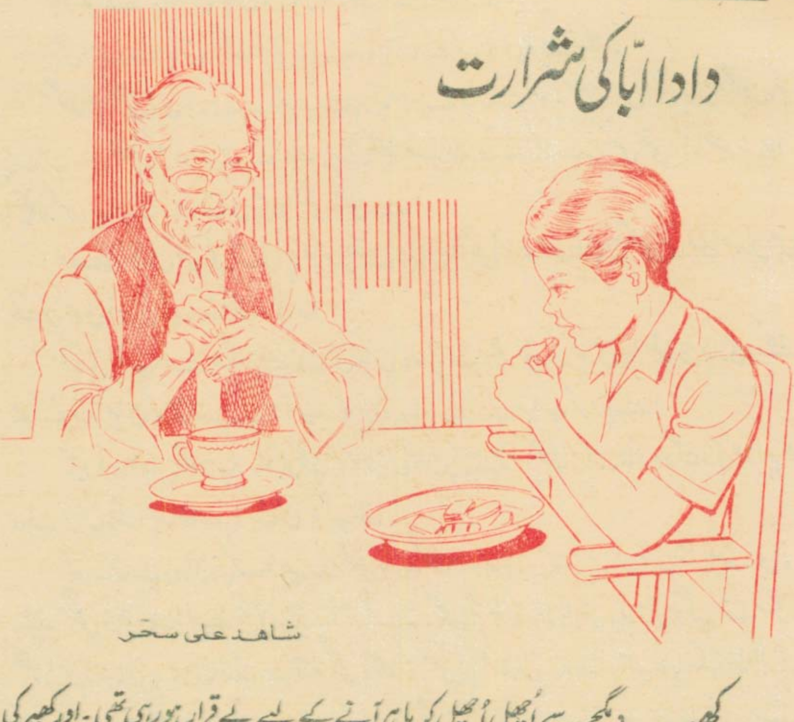

شاہد علی سحر

کھیر دیگچے سے اُچھل اُچھل کر باہر آنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اور کھیر کی زعفرانی خوشبو، صحن میں کھیلتے گلفام کی بے تابی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ کر رہی تھی۔ قریب ہی دادا جان آرام کرسی پر دراز اخبار میں محو تھے۔

امّی جان نے شیشے کی تھالی میں کھیر ڈال کر دادا جان کے قریب تخت پر ٹھنڈی کرنے کے لیے رکھ دی۔ اور خود باورچی خانے میں گرم گرم پوریاں تلنے لگیں۔

"پانچ منٹ بعد ہم سب کھیر اور پوریاں مزے لے لے کر کھا رہے ہوں گے۔" گلفام نے سوچا۔ "کاش یہ پانچ منٹ پانچ سیکنڈ میں گزر جائیں!" وہ اپنا دھیان تخت پر رکھی کھیر سے ہٹانے کے لیے دل ہی دل میں اپنا سبق یاد کرنے لگا۔ "سی، اے، ٹی، کیٹ: کیٹ معنی بلی۔ ڈی، او، جی ڈاگ، ڈاگ معنی، کُتّا...."

"بیٹا گلفام!" دادا جان کی محبت بھری آواز نے گلفام کے خیالات کا تسلسل توڑا۔

"جاؤ، کمرے سے اپنے ابا جان کو بلا لاؤ۔ کھانا لگنے والا ہے۔"

"جی اچھا دادا جان۔" گلفام تیزی سے ابا جان کے کمرے کی طرف لپکا۔

"گلفام، کتنی بُری بات ہے۔ تم بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔" صحن میں امی جان، گلفام پر برس رہی تھیں۔" دو منٹ کے لیے یہاں کھیر ٹھنڈی ہونے کے لیے رکھی تھی۔ ذرا صبر نہ ہوا۔ دیکھو کس بدتمیزی سے تھالی میں انگلی ڈالی ہے۔"

سب کی نظریں کھیر کی تھالی پر مرکوز تھیں جہاں انگلی کا موٹا سا نشان کسی برفیلے میدان میں کھدی ہوئی خندق کی مانند نظر آ رہا تھا۔

"ابا جی، آپ اسے سزا دیجیے نا۔" امی جان نے ایک نوالہ کھیر کی چوری پر احتجاج جاری رکھتے ہوئے دادا جان کو مخاطب کیا۔ "آپ کے لاڈ پیار نے اُسے خراب کر دیا ہے۔"

مجبوراً دادا جان کو اخبار رکھ کر گلفام کا بایاں کان پکڑنا پڑا۔ گلفام اس ناکردہ گناہ کی سزا پر نہ صرف حیران بلکہ اچھا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

کھانے کے دوران ایک ڈھیٹ مکھی بار بار گلفام کے بائیں کان پر اس طرح آ کر بیٹھ رہی تھی جیسے جنگی ہیلی کا پٹر اپنے ہیلی پیڈ پر اُترتا ہے۔ گلفام ہاتھ ہلا ہلا کر بے زار ہو گیا تھا مگر مکھی اپنی ڈھٹائی پر ثابت قدمی سے قائم تھی۔ گلفام مکھی کی ڈھٹائی کے راز کو کبھی نہ پا سکتا تھا اگر اس کے بائیں کان پر کھجلی نہ ہوتی اور وہ اپنے کان پر لگے نامعلوم لیس دار مادّے سے بے خبر رہتا۔ اُس نے تجسس میں اپنی اُنگلیوں کو سونگھا تو کھیر کی زعفرانی خوشبو اس کی سانسوں میں تحلیل ہو گئی۔ بے ساختہ گلفام کی نظریں دادا جان کی طرف اُٹھ گئیں جو جانے کب سے گلفام کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

جگنو سے جو روشنی نکلتی ہے، وہ دراصل ایک مادّے لوسی فرین اور لوسی فریز کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جگنو میں یہ دونوں مادّے پائے جاتے ہیں، جو آکسیجن کے ساتھ مل جاتے ہیں تو جگنو میں روشنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جگنو زیادہ تر منطقۂ حارہ کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ اور دنیا میں اس کی تقریباً ...۲۰۰ اقسام پائی جاتی ہیں۔ جگنو سے نکلنے والی روشنی ٹھنڈی ہوتی ہے، اسی لئے اس روشنی کو کولڈ لائٹ یا سرد روشنی بھی کہا جاتا ہے۔

ROBERT WERNICK

ترجمہ:۔ سیّد خورشید عالم

موت سے جنگ

جس میں موت ہار گئی

یہ سچی کہانی آئس لینڈ کے ایک نوجوان ملّاح گڈلاگر کی ہے جو اپنی بے پناہ اور ناقابلِ یقین جدوجہد کی وجہ سے اپنے ملک کا قومی ہیرو بن چکا ہے۔

۱۱ مارچ ۱۹۸۴ء کی ایک سرد رات، بائیس سالہ گڈلاگر اپنے دیگر چار ساتھیوں کے ہمراہ واپس آرہا تھا۔ ان کا فشنگ ٹرالر جس کا نام "ہیلیسے" تھا۔ مچھلیوں سے بھرا ہُوا تھا۔ آئس لینڈ کا ساحل اب صرف سات میل دُور رہ گیا تھا۔ وہ سب اپنے کپتان کے ہمراہ "وہیل ہاؤس" میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پونے دس بجے سب کو کافی کی طلب محسوس ہوئی۔ چنانچہ گڈلاگر نیچے کچن میں چلا گیا۔ ابھی اُس نے پانی چولھے پر رکھا ہی تھا کہ اُسے یوں لگا جیسے لانچ رُک گئی ہو۔ اُس نے کوئی خیال نہ کیا، بلکہ کیتلی سے نکلتی ہوئی بھاپ کو غور سے دیکھنے لگا۔

اتنے میں اُسے اُوپر سے سب کے پکارنے کی آواز آئی۔ وہ سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا ڈیک پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ لانچ کے ساتھ منسلک مچھلی پکڑنے کا جال پانی کے اندر کسی چٹان کے نوکیلے حصّے میں پھنس گیا ہے۔ کپتان جانسن جال کو خالی کرنے کے لیے لانچ کو ایک مخصوص دائرے میں گھمانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش کے دوران لانچ ۴۰ درجے کے زاویے پر ایک طرف کو جُھک گئی۔ ہیلیسے کی بناوٹ کے مطابق ۳۰ درجے زاویے پر جُھکنا کوئی خطرے کی بات نہ تھی مگر بدقسمتی سے اُسی وقت ایک انتہائی اونچی لہر نے لانچ کو کھلونے کی طرح ایک طرف پلٹ کر رکھ دیا۔ اس طرح عملے کے پانچوں افراد بھی قلابازیاں کھاتے ہوئے سمندر میں جا گرے۔ پہلی ڈُبکی کھا کر گڈلاگر جب سطحِ سمندر پر آیا تو اُس نے دیکھا کہ لانچ کا پیندا اوپر ہو چکا ہے۔ گڈلاگر نے اپنے ساتھ چیف انجینئر پیٹر کو پیندے پر چڑھنے میں مدد دی۔ دوسری طرف کپتان جانسن سیکنڈ انجینئر ایڈسن کو سہارا دینے آگے بڑھا مگر اس کے پہنچنے سے قبل ہی ایک اور تیز لہر ایڈسن کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ کپتان جانسن نے لانچ کی طرف رُخ کیا۔ گڈلاگر اور پیٹر نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُوپر کھینچ لیا۔ ان کا پانچواں ساتھی اور باورچی ویلر لانچ اُلٹتے وقت ہی سمندر کی بے رحم موجوں میں غائب ہو چکا تھا۔

سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہوا اُن کے گیلے کپڑوں سے ٹکرا کر گزر رہی تھی۔ اُنہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی تیز چھُری اُن کے جسموں کو کاٹ رہی ہو۔ تینوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کا تیر کر آئس لینڈ کے ساحل تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔ اُنہیں امید تھی کہ وہ صبح تک اس حالت میں بیٹھے رہیں گے۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہونے کی صورت میں ساحل سے کوئی نہ کوئی امدادی پارٹی ان کی تلاش میں آجائے گی۔ مگر شاید قدرت کو اُن کا ایک اور امتحان لینا مقصود تھا۔ ایک اور اُونچی لہر کے نتیجے میں لانچ پھر ٹیڑھی ہو گئی۔ اور وہ ایک بار پھر سمندر میں غوطے کھانے لگے ... چاندنی میں انہوں نے اپنے سامنے لانچ کو غرق ہوتے دیکھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی ڈوبنے لگے گا تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے کسی دوسرے کو پکڑنے کی ضرور کوشش کرے گا اور اس طرح کوئی بھی نہیں بچ پائے گا۔ بہت دُور اُن کو لائٹ ہاؤس کی مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ سمندر میں طویل عرصہ

گزارنے کے بعد اُنہیں اتنا معلوم تھا کہ سخت سردی میں اتنی دُور تیر کر جانا ناممکن ہے۔
جیسے جیسے ان کے جسم کی حرارت کم ہوتی جائے گی، ویسے ویسے وہ موت کے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ کیونکہ جسم کا درجۂ حرارت ۹۳،۲ ڈگری فارن ہائٹ سے نیچے چلا جائے تو دماغ تک خون کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح درجۂ حرارت ۹۰ ڈگری فارن ہائٹ ہو جائے تو دل اپنا فعل اچھی طرح ادا نہیں کر پائے گا۔
وہ تینوں سطحِ سمندر پر ایک دوسرے کو دُور سے دیکھتے اور زور زور سے آوازیں دے کر ہمت بندھاتے رہے۔ گڈلاگر نے دیکھا کہ پہلے چیف انجینئر پیٹر اور پھر کپتان جانسن سمندر کی بے رحم موجوں میں غائب ہو گئے۔ اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اُس کی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ مگر اُس نے خود کو سنبھالا۔ اُسے اپنے چاروں طرف سمندر کی اونچی لہروں اور خوفناک آوازوں سے ڈر لگنے لگا تھا مگر زندگی کی کشش اُسے ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور کر رہی تھی۔
"سمندر کا ٹھنڈا پانی میرے جسم کو کسی بھی وقت سُن کر سکتا ہے مگر میں ہمت نہیں ہاروں گا۔ میں اپنے آخری دَم تک زندگی کے لیے جدّوجہد کرتا رہوں گا۔" گڈلاگر نے لائٹ ہاؤس کی روشنی کو دیکھا۔ تو اُسے یُوں لگا جیسے روشنی اُسے مخاطب کر کے کہہ رہی ہو۔
"گڈلاگر آگے بڑھو... گڈلاگر آگے بڑھو۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" گڈلاگر جانتا تھا کہ اگر ایک لمحے کو بھی اُس نے ہمت ہار دی تو پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ لہریں اُس کی سخت مخالف تھیں۔ مگر وہ برابر تیرتا رہا۔ کبھی کبھی کوئی تیز لہر اُسے ہوا میں اُچھال دیتی اور وہ قلابازیاں کھاتا ہُوا، دوبارہ سمندر میں آگرتا۔ مگر اُس نے بھی تہیّہ کر لیا تھا کہ وہ ہار نہیں مانے گا۔ اس کے اعضأ شل ہونے لگے تھے اور ذہن سُن ہونے لگا تھا مگر لاشعوری طور پر وہ زندگی کی جدّوجہد میں لگا رہا۔ سخت تھکن کا احساس اُسے مجبور کرنے لگا کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو ڈھیلا چھوڑ کر آرام کرنے لگے۔ مگر اُس کے اندر کی ایک آواز اُسے کہتی۔
"اگر میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تو موت میرا مقدر بن جائے گی۔ اور مجھے موت کو شکست دینا ہے۔ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ مجھے ساحل پر پہنچنا ہے۔"
اُس نے ایک بار پھر لائٹ ہاؤس کی روشنی کو دیکھا۔ اُسے یُوں لگا جیسے روشنی کچھ قریب آگئی

ہے۔ اس احساس نے اُس کے جسم میں توانائی کی نئی لہر پیدا کر دی۔ وہ ایک نئے حوصلے کے ساتھ تیرنے لگا۔

اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُسے تیرتے ہوئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ شدید تھکن اور اعضا کے سُن ہونے کے احساس کی وجہ سے اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے تیر تا رہا ہے۔ پانی کے شور سے کبھی کبھی وہ گھبرا اُٹھتا۔ سخت سردی کی وجہ سے اُس کا جسم اکڑنے لگا تھا۔ مگر لائٹ ہاؤس کی روشنی دیکھ کر اُس کے ٹوٹتے ہوئے اعصاب پھر مضبوط ہو جاتے۔ بس ایک دیوانگی تھی جو اُسے بچ رہنے کی جدّو جہد پر مجبور کر رہی تھی۔ کبھی کبھی اُسے لگتا جیسے اُس کے بچھڑے ہوئے ساتھی اُس کو آواز دے رہے ہوں، گڈلاگر کو یوں لگتا جیسے وہ سب ہنس رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں۔

"تمہاری ساری کوششیں بے کار ہیں۔ تمہیں بالآخر ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو ڈھیلا چھوڑ دو، تمہیں سکون مل جائے گا۔ آجاؤ ہماری طرف، ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا۔ جب تک میرے جسم میں جان ہے۔ میں ساحل پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ یا خدا... یا خدا... میری مدد فرما۔ مجھے حوصلہ دے۔" اُس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی۔ اُسے لگا جیسے وہ سراپا دُعا بن گیا ہو۔ اُسے تیرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اُسے ایسا لگا جیسے بہت سا پانی چٹان سے آکر ٹکرا رہا ہو۔

"آہ... میں ساحل کے قریب آچکا ہوں۔" اُس کے ذہن نے آواز دی۔

"مجھے اب بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ ذرا سی بے احتیاطی مجھے ان خطرناک چٹانوں میں پھنسا دے گی۔" اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سوچا۔ آہستہ آہستہ اُسے اپنے نیچے چٹانوں کی نوکیں چبھنے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُس کے تلوے گھٹنے اور کہنیاں چٹانوں کی رگڑ لگنے سے بُری طرح چھل چکی تھیں۔ اب پانی بھی کم ہونے لگا تھا۔ اُس نے پانی میں کھڑے ہو کر احتیاط سے ایک اُبھری ہوئی چٹان کا کونا پکڑ کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ مشرق کی طرف سے روشنی اُبھرنے لگی تھی۔ گڈلاگر کو یوں لگا جیسے یہ روشنی اُسے زندگی کی نوید سُنا رہی ہو۔ اب وہ ایک پتھریلے راستے پر کھڑا تھا۔ زخمی تلووں کی وجہ سے اُس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا، مگر اس کے باوجود اس نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ دُور بنے ہوئے مکانات کی چھتیں نظر آنے لگی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پیروں سے اُٹھتی ہوئی ٹیسوں کی پرواہ کیے بغیر اُس نے لڑکھڑاتے

ہوئے مکانات کی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ اُسے یُوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ کسی بھی لمحے گر پڑے گا۔

"جب میں سخت سردی میں کئی گھنٹے پانی میں تیر کر یہاں آسکتا ہوں تو سامنے بنے مکانات تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ موت مجھے اب بھی شکست نہیں دے سکتی۔" اُس نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچا۔ سامنے ہی ایک خوبصورت سا مکان نظر آرہا تھا۔ مکان کو دیکھ کر اُسے خیال آیا۔ کہ جیسے وہ کسی محفوظ پناہ گاہ میں آگیا ہو۔ وہ مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔

فرائنر کو دروازے پر مسلسل ہونے والی دستک سے غصّہ آگیا اور وہ تیز تیز قدموں سے دروازہ کھولنے گیا۔ اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ وہ آنے والے کو یہ ضرور بتائے گا کہ کسی کے دروازے پر دستک دینے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ مگر دروازہ کھولتے ہی اُس کا غصّہ غائب ہو گیا اور وہ دم بخود رہ گیا، اس کے سامنے اُس کا عزیز دوست گڈلاگر عجیب وغریب حالت میں کھڑا تھا، ہاتھوں اور پیروں سے بہتا ہوا خون، گیلے کپڑے جن سے پانی کے قطرے اب تک ٹپک رہے تھے اور نیلا چہرہ۔ اس نے جلدی سے اپنے باپ کو آواز دی۔

"ڈیڈی... ڈیڈی جلدی آئیے۔ گڈلاگر زخمی ہے۔" اس نے جلدی سے گڈلاگر کو سہارا دیا اور ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ گڈلاگر کی ہمت اب ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ بے دم ہو کر فرائنر کے بازوؤں میں جھول گیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی ایک ایمبولینس اُسے اسپتال کی طرف لے جا رہی تھی۔ گرم کمبل میں لپٹے ہوئے اُس نے بہت دھیمے لہجے میں ایک پولیس افسر کو جو ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھا تھا، اپنی داستان سُنائی۔ کسی کو یقین نہ آیا کہ نو گھنٹے تک اتنے ٹھنڈے پانی میں تیر کر یہ نوجوان خشکی تک پہنچا ہوگا۔ مگر اس کے سارے جسم پر چوٹ اور زخموں کے نشانات اور سُوجے ہوئے بازو اور جسم کا گرتا ہوا درجۂ حرارت اس کے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔

اگلی صبح وہ آئس لینڈ کا قومی ہیرو بن چکا تھا۔ سارے اخبارات میں اس کی بڑی بڑی تصویریں شائع ہوئیں۔ اخبارات نے اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں تفصیلی خبریں شائع کیں اور گڈلاگر کی ہمّت اور اس کے استقلال کو سراہا گیا۔ جن ڈاکٹروں اور صحافیوں نے اسپتال میں اس سے ملاقات کی وہ اُسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ سب حیران تھے کہ موت کا ۹۹٫۹ فیصد

امکان ہونے کے باوجود اس نوجوان نے اُسے کس طرح شکست دے دی۔

آج کل گڈلا گر فرڈ تھارسن آئس لینڈ کے دارالحکومت رکیاوک میں یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس ہولناک حادثے نے اُس پر صرف اتنا اثر ڈالا ہے کہ اب وہ سمندری سفر پہ کئی سال سے نہیں گیا ہے۔ اُسے اپنے چاروں رفقا بھی یاد آتے ہیں، جو اُس کے سامنے اُس سے بہت دُور چلے گئے تھے۔ اب وہ صرف ساحل سے سمندر کا نظارہ کرتا ہے۔

(ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۸۶ء)

اگر آپ اپنے پسندیدہ ماہنامہ "آنکھ مچولی" میں لکھنا چاہتے ہیں تو ان باتوں کا خیال ضرور رکھیے۔

- جو بھی تحریر ہمیں ارسال کریں، وہ آپ کی اپنی تخلیق ہو، نقل یا چوری کی، یا پہلے سے شائع شدہ تحریر ناقابلِ اشاعت ہوگی۔
- پینسل سے، مشکل رسم الخط میں اور چھوٹے پُرزوں پر لکھی گئی تحریر بھی ناقابلِ اشاعت ہوگی۔
- تحریر کاغذ کے ایک جانب، ایک سطر چھوڑ کر صاف اور خوشخط لکھیے۔
- آپ ہمیں اچھی اچھی کہانیاں، نظمیں، گیت، مضامین، دلچسپ واقعات، مزاحیہ تحریریں، لطائف، خاکے، اور ناقابلِ فراموش واقعات لکھ کر بھیجیں، تاکہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہو اور آپ مستقبل کے بڑے ادیب بن سکیں۔
- آپ کی تحریر کا اندازِ بیان، خیال اور اسلوب بچّوں کی نفسیات کے مطابق ہونا چاہیئے۔
- جن تحریروں میں نیا پن اور دلچسپی ہوگی، وہ ترجیحی بنیادوں پر جلدی شائع کی جائیں گی۔
- کہانی یا مضمون ہمیں بھیجنے سے قبل اس کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، کیونکہ ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں کوئی تحریر واپس نہیں کی جاتی۔

(ادارہ)

JAMES BALDWIN

ترجمہ: حِنا شہزاد

فن کار کی کہانی

وہ دو عظیم مصوّر تھے لیکن ان میں زیادہ عظیم کون تھا؟

کسی زمانے میں یونان میں زیوکسز نام کا ایک مصور رہا کرتا تھا۔ زیوکسز ایسی تصاویر بناتا تھا کہ لوگ اُنھیں دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتے کہ آیا یہ تصاویر ہیں یا حقیقی چیزیں۔

ایک مرتبہ زیوکسز نے پھلوں کی ایک تصویر بنائی۔ تصویر اتنی حقیقی تھی کہ کچھ چڑیاں اُڑتی ہوئی آئیں اور اُس تصویر پر بیٹھ کر پھلوں پر ٹھونگیں مارنے لگیں۔ زیوکسز نے یہ دیکھا تو اُسے اپنے فن پر بہت فخر ہوا۔

"میں یقیناً دنیا کا سب سے اچھا مصور ہوں۔" زیوکسز نے اعلان کر دیا۔ اُس کا فخر شیخی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اُسی زمانے میں یونان میں پار ہیسیوز نام کا ایک اور بڑا مصور رہا کرتا تھا۔ اُس نے جب زیوکسز

کے شیخی بگھارنے کے بارے میں سُنا تو اُس نے خود سے کہا۔

"ہوں! تو اب مجھے بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا"

چنانچہ اُس نے بھی ایک خوبصورت تصویر بناڈالی۔ اس تصویر کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ پردے سے ڈھکی ہے۔ پارہیسیوز نے ایک روز زیوکسز کو اپنی یہ تصویر دیکھنے کی دعوت دی۔

زیوکسز آیا اور اُس نے غور سے پارہیسیوز کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"اچھا اب ذرا تصویر پر پڑا پردہ اٹھاؤ تاکہ میں تصویر کو دیکھ سکوں!"

پارہیسیوز نے یہ سُنکر ایک زور دار قہقہہ لگایا اور بولا۔

"ارے بھئی یہ پردہ ہی اصلی تصویر ہے!"

"اچھا!" زیوکسز نے حیرت سے کہا۔ پھر بولا۔

"میں آج سے شیخی بگھارنے سے توبہ کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے صرف چڑیوں ہی کو دھوکہ دیا تھا لیکن تم نے تو مجھے یعنی ایک مصوّر کو بھی دھوکہ دے دیا"

پھر کچھ دنوں بعد زیوکسز نے ایک اور تصویر بنائی۔ تصویر میں ایک لڑکے کو باسکٹ میں پکی ہوئی لال چیریاں لے جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ زیوکسز نے تصویر کو مکمل کرکے اپنے دروازے پر لٹکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ چڑیاں اُڑتی ہوئی آئیں اور اُس تصویر میں موجود چیریوں کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔ زیوکسز نے یہ دیکھا تو افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"میری یہ تصویر بھی شاہکار نہ بن سکی۔ کیونکہ اگر میں نے تصویر میں موجود لڑکے کو درست انداز میں پینٹ کیا ہوتا تو یہ چڑیاں یقیناً اُسے دیکھ کر ڈرتیں اور تصویر میں موجود چیریوں کو لے جانے کی کوشش نہ کرتیں"

امام حسنؓ سے کسی نے پوچھا ایسا کیونکر ہے کہ آپ کسی سائل کو مایوس نہیں لوٹاتے۔ اگرچہ آپ خود فاقے کاٹ رہے ہوں۔ آپ نے جواب دیا "میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور سائل بنا رہتا ہوں اور اس کی ذات سے ہر اُمید وابستہ رکھتا ہوں۔ اس لیے مجھے حیا آتی ہے کہ میں خود تو سائل ہوں اور کسی دوسرے سائل کو مایوس ہونے دوں۔ خدا تعالےٰ نے یہ بات میری سرشت میں ڈال دی ہے کہ جوں جوں وہ مجھے اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ اسی قدر میں اُس کی عطا کردہ نعمتوں کو دوسرے بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے بکھیرتا ہوں"

(عنبر بن اسحاق، شیخوپورہ)

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو

محمد جاوید خالد

ناصر تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہُوا۔ شام ہو چکی تھی اور دن بھر کی تھکن اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ کمزور سی آواز میں اُس نے گھر والوں کو سلام کیا اور کمرے میں گھستے ہی صوفے پر گر گیا۔ "آ گئے بیٹا؟" اُس کی امّی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "چلو جلدی سے کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھو لو۔ کھانا لگا ہُوا ہے بس تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"امّی مجھے بھُوک نہیں ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔" ناصر نے بمشکل سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے!! تمہاری وجہ سے سب بھُوکے بیٹھے ہیں اور تمہیں بھُوک نہیں ہے۔ چلو اٹھو جلدی۔" امّی نے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ

لیا۔ ناصر آہستہ آہستہ اُٹھا، کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھویا اور دسترخوان پر آ بیٹھا۔

"ابا کہاں ہیں؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ نماز۔۔۔۔" "پڑھ کر آ گئے ہیں" حفیظ صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی بیگم کا جُملہ پورا کر دیا۔ سب ہنس پڑے۔ ناصر نے سلام کیا۔ "وعلیکم السّلام!"

انھوں نے جواب دیا۔ "کیسے ہو بیٹے؟ آج تو سارا دن ہی لگا دیا۔ کہاں رہے۔؟"

"کہاں جانا ہے ابا جان" ناصر نے اُداسی سے جواب دیا۔ "بس وہی دفتروں اور کمپنیوں کے چکّر لگاتا رہا۔"

"تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تمہیں آج پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ حفیظ صاحب نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ابا جان آج بھی ناکامی رہی۔" اس نے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ "اب تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ"

"تم بالکل غلط سوچ رہے ہو" ناصر کی امّی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا خبر امّی جان کہ میں کیا سوچ رہا ہوں" ناصر بے ساختہ مُسکرا دیا۔

"میں تمہاری ماں ہوں بیٹے، چلو کھانا شروع کرو۔"

کچھ دیر بعد ناصر پھر بولا۔ "امّی تو آپ نے بتایا نہیں کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔"

"تم" امّی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم یہ سوچ رہے تھے کہ تم نے کہیں غلط قدم تو نہیں اُٹھا لیا؟"

ناصر سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ جھینپ کر اُس نے سر جھکا لیا۔

"یہ بہت بُری بات ہے بیٹے" اس کی امّی دوبارہ بولیں۔ "نیکی کی راہ اختیار کرو تو پورے اعتماد کے ساتھ۔ قدم اتنا جما کے رکھو کہ کوئی لالچ یا خوف اس میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔ تمہاری یہ تھکن اس ملامت کے عذاب سے بہت کم ہے۔ جو دوسری صورت میں تمہارا ضمیر تمہیں کرتا رہتا اور ہم الگ حرام کھانے کے گناہ گار ہوتے۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ حرام لقمہ کھانے والے کی دُعا تک قبول نہیں ہوتی۔"

ناصر بے چارہ ان باتوں کے جواب میں کیا کہتا۔ شرمندگی کے ساتھ سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔

البتہ اس کی سوچیں اُسے کھینچ کر بیتے دنوں کی طرف لے گئیں۔ ابھی پچھلے مہینے تک وہ ایک بڑے ادارے میں معقول تنخواہ پر ملازم تھا۔ اچھی خاصی بسر ہورہی تھی۔ ڈیوٹی ایسی تھی کہ براہ راست جنرل مینجر سے واسطہ رہتا تھا۔ جنرل مینجر صاحب بہت نیک اور شریف انسان تھے۔ ان کے ساتھ دو برس کا عرصہ ناصر کو ایسے ہی لگتا تھا جیسے پلک جھپکتے بیت گیا ہو۔ مگران کی ریٹائرمنٹ کے بعد نیا آنے والا جنرل مینجر اُسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ چڑچڑا اور بدمزاج۔ اور چند ہی دنوں میں اس پر یہ بھی کھُلا کہ نیا مینجر راشی بھی ہے۔ وہ رشوت لے کر نہ صرف معاشرے میں خرابی پھیلانے کا ایک بہت بڑا کام کررہا تھا۔ بلکہ مالکان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے ان کے نقصان کا باعث بھی بن رہا تھا۔ ناصر کے خیال میں یہ نیا جنرل مینجر دوہرے جُرم کا ارتکاب کررہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے قریبی دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔ بات کا تو یہی ہوتا ہے کہ ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی، نئے جنرل مینجر کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑگئی اور ایک دن صبح ہی صبح اُس نے ناصر کو اپنے کمرے میں بلوالیا۔

"دیکھو لڑکے" اس نے ناصر کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا "میں کچھ بھی کروں تم اپنے کام سے کام رکھو اور زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو، ورنہ یہ دو ٹکے کی نوکری بھی ٹھکانے لگ جائے گی۔" ناصر افسروں کے سامنے عام طور پر گونگا ہی بنا رہتا تھا مگر آج جانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ اُس نے مینجر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بے دھڑک لہجے میں کہنا شروع کردیا۔

"سر!! میں حق بات کہنے سے نہیں رُک سکتا۔ رشوت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ حق دار کا حق مارا جاتا ہے۔ معاشرے میں خرابی پھیلتی ہے پھر مالکان کا نقصان ہے، رہی بات میری نوکری کے ٹھکانے لگنے کی تو اس کی مجھے پرواہ نہیں، رزق دینے والی خدا کی ذات ہے۔"

جنرل مینجر کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہوگیا۔ کچھ دیر ناصر کو گھورتے رہنے کے بعد اس نے اسے اپنی سیٹ پر جانے کو کہا اور ایک ہی گھنٹے کے بعد اُسے ملازمت سے رخصت کا پروانہ مل گیا۔ اس کے قریبی دوست وسیم نے اُسے بتایا کہ جنرل مینجر نے ہنگامی بنیادوں پر مالکان سے رابطہ کرکے اس کے بارے میں جانے کیا کیا کہہ کر اُن کے کان بھرے ہیں کہ انہوں نے جنرل مینجر کو اس کی نوکری ختم کرنے کی اجازت دے دی۔

"اب تم کیا کرو گے؟" وسیم نے اُسے چُپ دیکھ کر کہا۔

"میں" ناصر نے ایک لمبی سانس کھینچی "میں اب نئی نوکری تلاش کروں گا۔ تم دیکھ رہے ہو وسیم" اس نے جذباتی لہجے میں کہا "برائی کی طاقتیں کس قدر مضبوط ہوتی جا رہی ہیں"

"ہاں میرے دوست" وسیم نے سر ہلایا "شیطانی طاقتیں آدمی کو ہراساں اور خوفزدہ کر دیتی ہیں مگر آخری فتح حق کی ہوتی ہے"۔

ناصر کی تربیت بہت اچھے اور نیک ماحول میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے جنرل منیجر کے سامنے صاف صاف بتا دیا کہ وہ خیانت کر رہا ہے مگر نوکری کے حصول میں اُسے جو مشکلات پیش آئیں تھیں، وہ اُسے اب تک یاد تھیں، وہ کچھ پریشان سا تھا مگر وسیم کے الفاظ نے اُسے بڑی ڈھارس دی۔

"مجھے مالکان کا پتہ مل سکتا ہے؟" اُس نے وسیم سے کہا۔

"مالکان کا پتہ تمہیں مل تو جائے گا مگر تمہاری جذباتیت اور جلد بازی نے جنرل منیجر کو موقع دے دیا اور اُس نے مالکان کو تمہارے خلاف کر دیا ہے" وسیم نے جواب دیا۔

بہرحال وسیم نے اس کے اصرار پر اُسے مالکان کا پتہ دے دیا تھا۔ مگر وہاں بھی وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا یعنی انہوں نے ناصر کا نام سُن کر ہی ملاقات سے انکار کر دیا۔ اور جب سے ناصر نئی نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

"کن سوچوں میں کھو گئے، کھانا تو ڈھنگ سے کھا لو" اس کی امی نے اُسے ٹوکا۔

"آج پتہ ہے کیا ہوا" شاید انہیں خیال آیا کہ ناصر چپ بیٹھا رہے گا تو سوچوں میں گم رہے گا۔ "آج میں نے تمہاری پُرانی کتابیں اور اخبار کی ردّی نکال کر گڈو کو دی کہ وہ اسے فروخت کر آئے۔ کتابیں چھانٹنے میں تمہاری اسلامیات کی کتاب بھی سامنے آئی، اُسے میں نے علیحدہ کر لیا۔ اس کی ورق گردانی میں مجھے ایک بڑی نکتے کی بات ملی، پوچھو کیا؟"

"کیا؟" ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سورۃ "والعصر" کا ترجمہ تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ وہی لوگ کامیاب ہیں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ نکتے کی بات یہ ہے کہ حق کے ساتھ صبر کی تلقین کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی یہ چیز لازمی ہے کہ جو آدمی حق پر چلے گا اُسے مشکلات کا سامنا ہوگا۔ یہ مشکلیں اور پریشانیاں اگرچہ عارضی ہوں گی مگر ایسے میں صبر سے کام لینا ہوگا"۔

"واہ بیگم" حفیظ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ہم تو آپ کو باورچی خانے کی دنیا کا ماہر سمجھتے تھے مگر ماشاءاللہ..."

ناصر کے چہرے پر بھی شگفتگی کے آثار نظر آئے۔ حفیظ صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا "تمہاری امّی نے بہت کام کی بات بتائی ہے ہمیشہ یاد رکھنے والی۔ کھانا کھا کے میرے پاس آؤ۔ ایک بات مجھے بھی یاد آرہی ہے"

"جی ابّا جان ابھی آیا" ناصر نے مُستعدی سے کہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اپنے ابّا کے سامنے بیٹھا تھا۔

"مغل بادشاہ جہانگیر کا نام سُنا ہے تم نے" حفیظ صاحب نے ناصر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ابّا جان میں نے تاریخ کی کتاب میں خاندانِ مُغلیہ کے بارے میں پڑھا تھا" ناصر نے کہا "اسی کے دور کی بات ہے اس بادشاہ کے گرد جی حضوری اور خوشامد کرنے والے بہت جمع ہو گئے تھے جو اس کے ہر جائز و ناجائز کام کی تائید کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے دربار سے اسلامی آداب و رسوم ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور ہندو اثرات کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایسی باتیں بھی داخل ہونے لگیں جو قطعاً غیر اسلامی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو اس کے پاس حاضر ہوتا۔ اس پر لازم تھا کہ اُسے سجدۂ تعظیمی کرتا۔ ان غیر اسلامی حرکتوں پر سب سے بلند آواز اُٹھانے والے اللہ کے ایک نیک بندے حضرت مجدّد الف ثانیؒ تھے۔ وہ اپنے حلقے میں بادشاہ اور امرا کے ہر اُس کام پر تنقید کرتے جو غیر اسلامی ہوتا تھا۔ بادشاہ کے خوشامدیوں نے حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی اس عادت کو بادشاہ کے حضور نہایت نمک مرچ لگا کر پیش کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ... "حضرت کے ہزاروں مرید ہیں ایسا نہ ہو کہ کل وہ حکومت کے لیے خطرہ بن جائیں" بادشاہ نے اُن کی باتوں میں آکر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کو بلوایا۔ حضرت کے چند ایک خیر خواہوں نے یہ بھی کہا کہ جان بچانے کے لیے آپ بادشاہ کو سجدہ کر دیجیے گا ورنہ وہ آپ کا دشمن ہو جائے گا، حضرت نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ وہ صرف اللہ کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں اور حق کی راہ میں ہر مصیبت برداشت کرنے کو تیار ہیں، آخر وہی ہوا حضرت مجدّد الف ثانیؒ جہانگیر کے دربار میں گئے اور اپنی مومنانہ شان کے ساتھ گئے۔ بادشاہ واقعی ناراض ہوا۔ اور اُس نے حضرت کو قید کرنے کا حکم دے دیا

حضرت مجدد الف ثانیؒ گوالیار کے قلعے میں تقریباً سال بھر قید رہے اور معاملہ صرف قید و بند تک نہ رہا، بلکہ ان کا مکان، جائیداد حتیٰ کہ کتابیں تک ضبط کرلی گئیں مگر حضرت پر ان باتوں کا ذرا اثر نہ ہوا اور نہ ہی وہ گھبرائے بلکہ آپ نے جیل میں اپنے جیل کے ساتھیوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنا شروع کردیا اور کتنے ہی لوگ اسلام لے آئے۔ اب دیکھا جائے تو بظاہر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے لیے بلاشبہ یہ بڑا کٹھن وقت تھا اور آپ نے ایسی ایسی سختیاں جھیلیں جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا مگر آپ کی یہ حق گوئی بیکار نہ گئی۔ اس نیک مثال نے لوگوں کو جرأت دلائی۔ جو دبے بیٹھے تھے وہ دلیر ہوگئے۔ اسلام پسند گروہ کو توانائی ملی اور آہستہ آہستہ اس کا اثر جہانگیر کے دربار پر بھی پڑنا شروع ہوا۔ غیر اسلامی آداب و رسوم رخصت ہونے لگے مذہب کا جوش بڑھ گیا اور جہانگیر نے احترام و عزت کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو رہا کردیا۔ تو تم نے دیکھا کہ آخر کار حق کا بول بالا رہا۔"

"بے شک ابا جان" ناصر نے جوش سے کہا: "میں وقتی طور پر کچھ پریشان ہوگیا تھا مگر اب آپ یقین کریں کہ مجھے اپنے عمل پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے بہتری کی راہیں کھول دے گا۔"

اگلی صبح ناصر ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ناصر باہر لپکا تو وسیم کو موجود پایا۔

"تم ابھی تیار نہیں ہوئے" وسیم نے جوش سے پوچھا۔

"کہاں کے لیے" ناصر نے سوال کیا لیکن وہ اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کررہا تھا۔

"دفتر کے لیے، اپنی پرانی جگہ کے لیے" وسیم نے پھولی ہوئی سانسوں سے کہا: "رات مجھے دیر زیادہ ہوگئی تھی ورنہ میں رات ہی یہ خوشخبری لے کر آتا۔ ہوا یہ کہ تم کو تو ملازمت سے خارج کردیا گیا مگر دفتر میں ایک بے چینی پھیل گئی اور جنرل منیجر کی بدعنوانیوں کی باتیں سرگوشیوں سے نکل کر کھلے عام ہونے لگیں۔ ظاہر ہے مالکان کو خبر ہونا تھی انھوں نے اپنے طور پر ایک کمیٹی مقرر کی اور کل صبح جنرل منیجر کو رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔ مالکان خود آئے ہوئے تھے۔ اظہر صاحب نے تمہارا ذکر چھیڑ دیا اور بتایا کہ محض حق گوئی کے سلسلے میں تمہاری ملازمت ختم کی گئی تھی۔ انھوں نے فوری طور پر نہ صرف تمہیں بحال کردیا ہے، بلکہ

اضافی ترقی بھی دی ہے ۔ بس اب جلدی نکل چلو دیر ہو رہی ہے:"

ناصر اُلٹے قدموں اندر آیا ۔ سیدھا امّی کے کمرے میں "امّی امّی" پکارتا ہُوا داخل ہوا مگر کمرے میں آکر ٹھٹک کر رُک گیا ۔ اس کی والدہ جائے نماز پر سجدے کی حالت میں پڑی تھیں اور بے ساختہ "اللہ تیرا شکر ہے" کا وِرد کر رہی تھیں ۔

"بیٹا تم کو مبارک ہو" آواز سُن کر ناصر پلٹا تو سامنے حفیظ صاحب کھڑے تھے ۔

"ابّو جان آپ کو پتہ چل گیا" اُس نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں بیٹا! تمہارا دوست جوش کے عالم میں اتنی بلند آواز سے بول رہا تھا کہ اندر صاف سُنائی دے گیا اور پھر مجھے یقین بھی تھا:"

"آپ کو یقین تھا" ناصر ابھی تک حیران تھا ۔

"ہاں بیٹا! سوفیصد یقین تھا وہ اس لیے کہ خدا اپنے ماننے والوں کو اور اپنی راہ پر استقامت کے ساتھ چلنے والوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا ۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں مگر خوشی کے عالم میں آدمی کو اخلاق نہیں بھُول جانا چاہیئے" حفیظ صاحب نے مُسکراتے ہوئے کہا ۔

"کیا مطلب ابّا جان"؟ ناصر نے سراسیمگی سے کہا ۔

"مطلب یہ کہ تمہارا دوست اب تک باہر کھڑا ہے ۔ جب تک تم تیار ہو اُسے اندر بٹھاؤ، چائے پلاؤ:"

"اوہ، وہ وسیم" ناصر بوکھلاہٹ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی ۔

سفرِ مبارک

معلومات بھی ـــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۳۰۲ صفحات

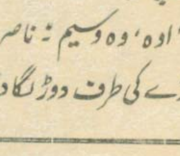

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرکے حاصل کرسکتے ہیں

دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال ــــ نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ ــــ موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزاً ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنالیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پالیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو ــــ مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

آج کی کہانی

یہ ہاکی کا فیصلہ تھا کہ اُسے کھیل کے میدان میں رہنا چاہیئے

طاہر مسعود

لڑکے پوری قوت سے نعرے لگا رہے تھے۔ کالج کے درودیوار ان نعروں سے گونج رہے تھے بلکہ دہل رہے تھے۔ فضیل نے لائبریری میں پڑھتے پڑھتے ایک لمحے کے لیے کتاب سے نظریں ہٹا کر ان نعروں کو سُننے کی کوشش کی اور پھر مطالعے میں ڈوب گیا۔ فضیل کتاب پر جُھکا ہُوا تھا اور بوڑھا لائبریرین اسے دیکھ کر سوچ رہا تھا یہ لڑکا بھی کتنا عجیب اور دوسروں سے مختلف ہے۔ سارا کالج نعرے بازی اور ہنگاموں میں لگا ہے اور اسے جیسے دنیا کے کسی کام سے کوئی مطلب ہی نہیں، فضیل کے ہاتھوں میں اُس وقت تاریخ کی کوئی کتاب تھی۔ اُسے تاریخ سے شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ اور جب وہ تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا تو ذہنی طور پر وہ ماضی میں پہنچ جاتا، اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ پچھلا دور دوبارہ جی اُٹھا ہے اور وہ ان بادشاہوں کو زندہ حالت میں دیکھ سکتا ہے جنہیں مرے ہوئے بھی اب صدیاں بیت چُکی ہیں۔

وہ اُن شہروں اور جنگوں کا حال اُسی طرح جانتا ہے جیسے یہ سب کچھ اُس کے سامنے ہی سے تو گزرا ہے۔ اس لمحے بھی جب کالج میں ہلّڑ بازی ہو رہی تھی وہ اسپین کی تاریخ پڑھ رہا تھا۔ اسپین جو مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت تھی۔ جہاں مسلمان سلاطین نے علم و فضل کے چراغوں سے دنیا کو منوّر کیا۔ وہ اسپین کی سلطنت بالآخر مسلمانوں کے ہاتھوں سے کتنی آسانی سے نکل گئی۔ آٹھ

سو سالہ حکومت کو زوال آگیا۔ ایک عجیب سی بات تھی جو فضیل نے تاریخ کی کتاب پڑھتے ہوئے محسوس کی۔ اُس نے کچھ ایسا احساس کیا کہ وہ تاریخ کا جُوں جُوں مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ وہ حال کی زندگی کو پہلے سے بہتر طریقے سے سمجھ سکتا ہے۔ ماضی اور حال میں کوئی خاص فرق تو نہیں۔ زندگی کا دھارا یکساں طریقے سے بہتا رہتا ہے۔

فضیل ابھی پڑھ ہی رہا تھا کہ یکایک چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید لڑائی ہوگئی تھی۔ لڑائی جھگڑا تو کالج کی زندگی کا معمول تھا۔ لڑکوں کی مختلف ٹولیاں مل کر پہلے سیاسی نعرے بازی کرتیں اور پھر آپس میں اُلجھ جاتیں۔ خوب مار پیٹ ہوتی، کسی کا سر پھٹتا، کسی کا ہاتھ ٹوٹتا، سب زخمی حالت میں اسپتال پہنچتے اور دونوں گروہوں کے زخمی لڑکے ایک ہی وارڈ میں داخل کر دیے جاتے۔ فضیل کو ان تفصیلات کا علم اخبار ہی سے ہوتا۔ کیونکہ وہ ان معاملوں سے لاتعلق ہی رہتا تھا۔

بھاگنے دوڑنے والوں کے قدموں کی چاپ نزدیک آتی گئی اور تھوڑی دیر بعد لائبریری میں دو لڑکے گھُس آئے۔ دونوں زخمی تھے اور شاید پناہ لینے لائبریری میں آگئے تھے۔ اُن میں سے ایک کا چہرہ سُوجا ہُوا تھا اور دوسرا بُری طرح لنگڑا رہا تھا۔ دونوں نے آتے ہی لائبریری کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ فضیل اُن میں سے ایک لڑکے کو جو لنگڑا رہا تھا، پہچانتا تھا۔ وہ اُس کے محلّے ہی میں رہتا تھا۔ اُس کا نام عبدالرحمٰن تھا اور اُس کے والد بینک میں اوسط درجے کے ملازم تھے۔ عبدالرحمٰن نے بھی فضیل کو پہچان لیا۔

"کیا ہوا عبدالرحمٰن! تم تو مجھے زخمی دکھائی دے رہے ہو۔" فضیل نے اُس کے نزدیک آکر قدرے پریشانی سے پوچھا۔

"انہوں نے مجھے مارا ہے۔ وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں، مجھے کہیں چھُپا دو۔" عبدالرحمٰن سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے فضیل کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی، جیسے فضیل کوئی سیسہ پلائی دیوار ہو۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ لائبریری ہے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" فضیل نے مسکرا کر کہا "یہاں صرف وہی آتے ہیں جنہیں پناہ کی ضرورت ہو۔" اُس نے رُک کر جملہ مکمل کیا۔ بوڑھا لائبریرین اس صورت حال سے سخت ہراساں ہو رہا تھا۔

"بھئی دیکھو... یہاں دھینگا مُشتی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ لائبریری ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم

لوگ یہاں سے چلے جاؤ" لائبریرین کو غالباً کتابوں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ابھی باہر شور و ہنگامہ جاری تھا۔

"بابا... آپ چوکیدار سے کہہ کر گیٹ اندر سے بند کرا دیجیے" فضیل نے تجویز پیش کی۔ اور یہ بات لائبریرین کی سمجھ میں فوراً آ گئی، وہ بھاگا بھاگا گیا اور اُس نے لائبریری کے مرکزی گیٹ پر تالہ ڈال دیا۔

اس عرصہ میں فضیل نے دونوں لڑکوں کو میز پر لٹا کر اُن کی جو کچھ دیکھ بھال کر سکتا تھا کرنے لگا۔

"جھگڑا ہوا کیوں؟" فضیل نے ابتدائی مرہم پٹی کے بعد پوچھا۔

"ہمارا گروپ نعرے لگا رہا تھا کہ دوسرے گروپ کے لڑکے آ گئے۔ ہمارے درمیان نعرے بازی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ اور معاملہ پھر لڑائی بھڑائی تک جا پہنچا۔ پہلے اُن کے لڑکے نے ہمارے ایک ساتھی کو پیچھے دھکیلا جس پر ہمارے لڑکے مشتعل ہو گئے اور انہوں نے جواباً ان کو دھکا دیا اور یوں مار پیٹ ہو گئی"

عبدالرحمٰن نے جھگڑے کی تفصیل بیان کی۔

"ہاں مگر تم لوگ نعرے لگاتے ہی کیوں ہو؟ کیونکہ سارا جھگڑا تو نعروں سے شروع ہوا ہے نا۔ نہ نعرے لگتے نہ جھگڑے ہوتے" فضیل نے جرح کی۔

"نعروں سے تو ہم پہچانے جاتے ہیں۔ ہم نعروں سے ہی بتاتے ہیں کہ ہم کتنے مضبوط ہیں۔ کتنے لڑکے ہمارے ساتھ ہیں" دوسرے لڑکے نے کہا جس کا چہرہ سُوجا ہُوا تھا۔

"ہاں مگر اب تم اپنے نعروں سے نہیں اپنے سُوجے ہوئے چہرے اور اپنی لنگڑی ٹانگ سے پہچانے جاؤ گے۔ کم از کم ایک ڈیڑھ ہفتے تک" فضیل نے کہا۔

فضیل نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی جس کا دونوں لڑکوں پر اچھا اثر ہُوا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے چُپ رہے۔ بلکہ عبدالرحمٰن نے تو جیسے پشیمانی سے دانتوں سے اپنا ناخن کُترنا شروع کر دیا...

"دیکھو رحمٰن" فضیل نے کہا "جب ہم چیخ چیخ کر نعرے لگاتے ہیں تو اس کا صرف ایک مطلب ہوتا ہے کہ ہمارے نرخرے بہت مضبوط ہیں۔ ہماری آواز بہت اُونچی ہے۔ نعروں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ نعرے لگانے والے کے پاس عقل بھی ہے"

"ہاں مگر نعروں کے بغیر تو کوئی پارٹی چل ہی نہیں سکتی"۔ رحمٰن کے دوست نے مزاحمت کی۔
"اور کوئی پارٹی صرف نعرے لگا کر بھی نہیں چل سکتی"۔ فضیل نے کہا" نعرے لگانے چاہئیں لیکن اُن کا بھی موقع محل ہوتا ہے، بلکہ نعرے ہی کیا جلسے جلوس سبھی کچھ ہونا چاہیئے، لیکن ہر وقت اور ہر روز نہیں۔ کبھی کبھار وہ بھی ضرورت کے تحت۔ ہم لوگ جلوس نکالتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔ نتیجے میں جھگڑا ہوتا ہے، خُون بہتا ہے۔ یہ کون سی اچھی بات ہے۔ ہماری غیر ذمّے داری کتنے گھروں کے چراغ گُل کر دیتی ہے۔ کیا کبھی تم نے سوچا ہے؟"
"باتیں تمہاری ساری ٹھیک ہیں، لیکن ہم ایک اعلیٰ مقصد کے لیے جدّوجہد کر رہے ہیں، اور اس میں سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے"۔ رحمٰن نے کہا۔
"یہ بڑی دلچسپ صورتحال ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا میں ایک غریب آدمی کی مدد کرنے کے لیے چوری کر سکتا ہوں۔"
"بالکل نہیں..."
"کیوں...؟"
"اس لیے کہ غریب آدمی کی مدد کرنا ایک اچھا کام ہے، لیکن چوری کرنا نہایت بُری بات ہے۔"
"گویا ایک نیک کام کرنے کے لیے غلط راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا"؟ فضیل نے پوچھا۔
"بالکل یہی بات ہے"۔
"تو پھر تم لوگوں کی یہ دلیل تو غلط ثابت ہوئی نا کہ اعلیٰ مقصد کے لیے سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے"۔
عبدالرحمٰن اور اس کا دوست چُپ ہو گئے، لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لاجواب تو ہو گئے ہیں لیکن دل سے قائل نہیں ہوئے ہیں۔ فضیل نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔
تھوڑی دیر بعد جب باہر کا شوروغُل گھٹا تو دونوں لڑکے ——— لائبریری سے نکل گئے۔

بوڑھے لائبریرین نے کہا
"فضیل بیٹا۔ تم بھی کیسے سمجھا رہے تھے۔ ان پر کیا اثر ہونا ہے"۔
"نہیں بابا۔ اُن کا قصور نہیں ہے۔ یہ بے گناہ اور معصوم لڑکے ہیں۔ ساری ذمّے داری اور کوتاہی ان کے والدین اور سرپرستوں کی ہے"۔

یہ کہہ کر فضیل اپنی کتاب میں کھو گیا۔

اگلے دن جب فضیل دوپہر کے وقت لائبریری کی طرف آرہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ عمارت کے پیچھے رحمٰن اور اُس کے دو تین دوست، ہاکیاں اور لاٹھیاں وغیرہ سنبھالے کھڑے ہیں۔ اُن کے چہرے بتا رہے تھے کہ عزائم خطرناک ہیں۔ فضیل سمجھ گیا کہ یہ لوگ کل کی لڑائی کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں۔ اُس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ اُنہیں اس سے باز رکھنا چاہیے۔ فضیل ان کے نزدیک گیا "رحمٰن کیا بات ہے، کیا آج ہاکی میچ کھیلنے کی تیاری ہے؟"

"تم بیچ میں مت آؤ، اپنا راستہ لو۔ کیا سمجھے؟" ایک موٹے سے لڑکے نے غُرّا کر کہا۔

"تم لوگ تو آج لڑنے کے موڈ میں نظر آرہے ہو؟" فضیل خوش دلی سے مُسکرایا۔

"ہاں آج ہم اُن کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔" دوسرے لڑکے نے ہاکی لہراتے ہوئے کہا۔

"مگر کس کی؟" فضیل نے پوچھا۔

"اوئے فلسفی۔ میں نے کہا نا کہ راستہ ناپو۔ سُنائی نہیں دیتا ہے کیا؟" اُسی لڑکے نے برہمی سے کہا

رحمٰن چونکہ فضیل کی عزّت کرتا تھا اس لیے وہ آگے بڑھا اور اُس نے موٹے لڑکے کو ڈانٹ پلائی اور پھر فضیل سے کہا: "فضیل بھائی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ کیونکہ جھگڑا ہونے والا ہے"۔

"رحمٰن ..." فضیل نے بلند آواز میں کہا "جس ہاکی سے ہم نے بھارت کو ہرایا ہے، مغربی جرمنی کو ہرایا ہے، اسپین اور ہالینڈ کو ہرایا ہے کیا تم اس ہاکی کو اپنے ہی دوستوں پر برساؤ گے۔ اپنے ہی کالج کے طالب علموں کو اس کا نشانہ بناؤ گے۔ جس ہاکی نے ہمیں دنیا میں عزّت دلائی ہے۔ اس کا تم لوگ یہ استعمال کرو گے؟"

رحمٰن کی نظریں خود بخود جھک گئیں، لیکن موٹے لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کس زمانے کی بات کر رہے ہو تم ... ہاکی میں اب ہم مار کھا چکے ہیں۔"

"اور کیا ہم عالمی میچ ہار چکے ہیں۔" دوسرے نے تائید کی۔

فضیل طنز سے ہنسا "لیکن تم لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ایسا کیوں ہُوا۔ اس لیے کہ اب ہاکی سے ہم لوگ کھیلنے کے بجائے آپس میں لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہیں۔ ہاکی کا احترام ہم نے مجروح کر دیا ہے۔ اور جب ہم کسی کھیل یا پیشے کی عزّت کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو پھر ہم خود بھی اس عزّت سے محروم ہو جاتے ہیں جو اس کھیل کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوتی ہے۔

کیوں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟"

رحمٰن کے سارے دوست چُپ تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ فضیل کے الفاظ اور خیالات نے اُن پر جادو کر دیا ہے۔ وہ کتنے ہی بُرے تھے لیکن سچائی کو پہچاننے کی صلاحیت سے محروم نہ تھے۔ فضیل نے دیکھا کہ سب سے پہلے رحمٰن نے ہاکی پھینکی اور پھر باری باری دوسرے لڑکوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"اسے پھینکنے کی ضرورت نہیں ہے" فضیل نے کہا "آؤ اسے لے کر گراؤنڈ میں چلتے ہیں"

تھوڑی دیر بعد کالج کا گراؤنڈ تالیوں کے شور سے گونج رہا تھا۔

فضاؤں میں آنکھ مچولی

کبھی ہوائی سفر کا اتفاق ہو اور حُسنِ اتفاق سے یہ سفر پی آئی اے کے کسی خوبصورت سے طیارے کے ذریعے ہو تو آپ یہ بات مت بھولیے کہ اس جہاز میں آپ کا پسندیدہ ماہنامہ آنکھ مچولی بھی آپ کا ہم سفر ہے۔ آپ دورانِ سفر مطالعے کے لیے فضائی میزبانوں سے آنکھ مچولی طلب کر سکتے ہیں۔

گھر ہو یا سفر آپ کا ہم سفر "آنکھ مچولی"

چارفٹ بولر چمپنزی

"شاباش! زور سے کک مارو" ولی کبلر چیخ رہے تھے"اور یہ لو گول ہوگیا" انہوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ یہ چاروں چمپنزی فٹبال کے اچھے کھلاڑی ہیں۔ ولی کبلر جو آسٹریا کے شہر ینوباؤ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل ان چمپنزیوں کو آئس ہاکی کا کھیل سکھانا شروع کیا تھا۔ پھر ان ذہین جانوروں کے ساتھ انہوں نے سارے یورپ کا دورہ کیا جہاں انھوں نے تماشائیوں کو ان کے کھیل دکھائے۔ چمپنزی آئس ہاکی کے کھیل سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ پھر اس دوران ولی کبلر نے انھیں فٹبال کھیلنے کی تربیت دی۔ فٹ بال میچ میں مزہ زیادہ تھا کیونکہ یہ برف کے بغیر بھی کھیلا جا سکتا تھا۔ ولی کبلر کا ارادہ ہے کہ اگر اس کھیل میں چمپنزیوں کو مہارت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ اور اچھی بات ہوگی۔ کیونکہ اس کے بعد تماشائیوں کے سامنے وہ ان چمپنزیوں کو اور زیادہ فخر کے ساتھ پیش کر کے اُنھیں حیران کر سکیں گے۔۔

کھیل کے آغاز سے قبل قطار کی صورت اترنے کا سلیقہ بھی ہمیں آتا ہے

"ہاف ٹائم" کھیل کے دوران ملنے والا وقفہ بھی کتنا خوشگوار ہوتا ہے۔

کک لگانے سے پہلے میدان کا جائزہ

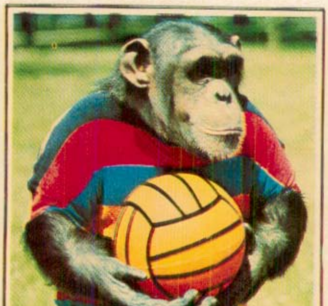

کوچ اور کھلاڑی کھیل سے پہلے پریکٹس کرتے ہوئے

دوستی دُشمنی

محمد سلیم مُغل

کھلونے کھلونے اور بس کھلونے... ایسا لگتا تھا جیسے اُس کی زندگی کا مقصد ہی کھلونے جمع کرنا رہ گیا ہو... ابھی کل ہی اُسے اپنی سالگرہ پر ڈھیر سارے کھلونے ملے تھے ۔ ان کھلونوں کو دیکھ دیکھ کر وہ خوش ہوتا رہا مگر اُس کا جی نہیں بھرا، سونے سے پہلے اُس نے تمام کھلونوں کو اپنے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی ایک میز پر سجایا اور ٹیڈی بیئر کو اپنے ساتھ لٹا کر سو گیا...

"اسے تو خواب میں بھی کھلونے نظر آتے ہوں گے"۔ اماں بی نے فراز کو کھلونوں کے ساتھ یوں سوتا ہوا دیکھ کر کہا...

"ہمارا بیٹا بڑا ہو کر انجینئر بنے گا..." فراز کے ابّو نے سوتے ہوئے فراز کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ فراز زبیری صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا، اُس کی ایک ننھی سی بہن تھی "ماریہ" مگر ماریہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ اسے ابھی غوں غاں کرنے کے علاوہ، کچھ آتا ہی نہ تھا۔

زبیری صاحب ایک غیر ملکی ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اچھی تنخواہ، لاتعداد سہولتیں، کسی چیز کی کمی تو تھی نہیں پھر بھلا وہ فراز کی خوشی کی خاطر اُس کی ہر فرمائش کو کیوں پورا نہ کرتے۔ ہر ماہ سب سے پہلے وہ فراز کے لیے کھلونے خریدتے، اُس کے بعد گھر کی کوئی اور چیز خریدی جاتی۔ فراز کا چھوٹا سا کمرہ کھلونوں سے

بھر گیا تھا۔ شاید ہی کوئی کھلونا ایسا ہو جو فراز کے لیے نہ خریدا گیا ہو۔۔۔ اسکول میں فراز کا سب سے اچھا دوست دانش تھا۔ ان دونوں کی دوستی ضرب المثل بن گئی تھی، عین ممکن ہے اس دوستی کی وجہ بھی "کھلونے" ہوں۔ دانش بھی فراز کی طرح کھلونوں کا بے حد شوقین تھا مگر ان دونوں کے کھلونوں میں بس فرق اتنا تھا کہ فراز کھلونے خریدا کرتا تھا جبکہ دانش اپنی ضرورت کے کھلونے گھر کی بے کار چیزوں کی مدد سے خود ہی بنا لیا کرتا تھا۔۔۔ دانش کھلونے خریدنا چاہتا بھی تو کیسے خریدتا۔ اُس کے ابو ایک اسکول میں معمولی تنخواہ کے ملازم تھے۔ کہنے کو وہ اُستاد تھے مگر اُستاد کو پیسے اسی کتنے ملتے ہیں کہ وہ زندگی کی دوسری ضرورتوں کے علاوہ بچّوں کے لیے کھلونے بھی خرید سکے۔ یہ تو اُس کی سُگھڑ ماں کا کمال تھا کہ جس نے بہت چھوٹی عمر ہی میں دانش کو طرح طرح کے کھلونے بنانا سکھا دیے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کھلونے بنانے کا شوق تو دانش کی گھُٹی میں ایسا پڑ گیا تھا کہ اب تو اُسے بازار کے کھلونے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اُس نے ماچس کی خالی ڈبیوں سے ایک بہت بڑا محل بنا لیا تھا۔۔۔ کپڑے کی کترنوں اور بٹن کی مدد سے اُس نے طرح طرح کے جانور بنا رکھے تھے۔ دیا سلائی کے پھُول اور انڈوں کے کھلونے چھوٹی سی عمر میں اُس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر تھے۔۔۔ دانش کے گھر کوئی بھی مہمان آتا، وہ دانش کی ذہانت اور اس کے کھلونوں کی تعریف کیے بغیر واپس نہیں جاتا۔

دانش اور فراز کی مس اکثر کہا کرتی تھیں کہ "دیکھنا ہماری کلاس کے یہ دونوں بچے بڑے ہو کر انجینئر بنیں گے۔" اس پر دانش اور فراز دونوں بہ یک زبان جواب دیتے۔ "ان شاءاللہ ضرور بنیں گے"۔ دانش اور فراز یوں تو اچھے دوست تھے مگر گزشتہ چند روز سے فراز میں ایک عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ اکثر دانش کو اُس کی غربت کا طعنہ دے دیتا یا اُس کی غربت کے حوالے سے کوئی ایسی چبھتی ہوئی بات کہہ جاتا جو کسی تیز دھار آلے کی طرح اُس کے ننھے سے دل میں پیوست ہو جاتی مگر وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموش رہتا اس لیے کہ اُس کی تربیت ہی ایسی تھی۔ ایک روز ایسی ہی کسی بات پر اُس کا دل بہت دُکھا اور وہ گھر آکر بہت دیر تک روتا رہا مگر پھر اپنی ماں کی باتوں نے جیسے اُس کے زخموں پر مرہم سا رکھ دیا ہو۔ ماں بہت دیر تک دانش کو اُن بڑے لوگوں کے قصے سُناتی رہی جو غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے مگر اپنے عزم و ہمت سے انہوں نے دُنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا۔

دانش نے ماں کی بات کاٹ کر پوچھا۔ "ماں امریکہ کا صدر ابراہام لنکن بھی تو غریب تھا نا"؟

"ہاں وہ تو بہت غریب تھا۔ ہم سے بھی کہیں زیادہ غریب۔ وہ اسٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں پڑھتا اور مٹکے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پر کوئلے کی مدد سے لکھا کرتا تھا۔ مگر وہ کبھی مایوس نہیں ہُوا اور پھر ایک دن امریکہ کا صدر بن گیا۔"

ماں کی ایسی باتیں سُن کر دانش کا دل بڑا ہو جاتا۔

اب تو اُس نے تہیہ ــــ کر لیا تھا کہ وہ فراز یا دوسرے لڑکوں کی باتوں سے بے نیاز ہو کر پڑھے گا، محنت کرے گا۔

اور ایک دن بڑا آدمی بن کر سب کو حیرت میں ڈال دے گا۔

فراز سے دانش کے تعلقات دن بہ دن خراب ہوتے چلے گئے مگر اس میں دانش کا کیا قصور...؟ خود فراز کی عادتیں ہی اتنی بگڑ چکی تھیں کہ لامحالہ یہ تعلقات تو کشیدہ ہونا ہی تھے۔ فراز پڑھنے لکھنے میں ایسا بُرا نہ تھا بس یہ روپے پیسے کا گھمنڈ اس کے دماغ میں ایسا آ بسا تھا کہ کسی غریب کو تو وہ خاطر ہی میں نہ لاتا خصوصاً دانش تو آئے دنوں اُس کی تلخ اور زہریلی باتوں کا نشانہ بنتا مگر اس کے باوجود خاموش رہتا۔

دانش اور فراز دونوں اب ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت پاس کر چکے تھے مگر اُن کی کشیدگی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا بلکہ یہ اُس وقت تو اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ جب جاپانی کلچرل سینٹر کے زیرِ اہتمام بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش میں دانش اور فراز دونوں کی چیزوں کو رکھا گیا، مگر فراز کے کھلونے کوئی انعام حاصل نہ کر سکے۔ جبکہ دانش کی بنائی ہوئی چیزیں اوّل قرار دی گئیں۔ فراز کی موجودگی میں نہ صرف دانش کے لیے اوّل انعام کا اعلان ہوا بلکہ مہمانِ خصوصی نے تالیوں کے شور میں اُسے گولڈ میڈل پہنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اخبار کے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کا جمِ غفیر دانش کے گرد جمع ہو گیا۔ فراز کے سامنے دانش کی اس غیر معمولی پذیرائی نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا اور فراز کی مخالفت اب مخالفت کے بجائے نفرت اور دشمنی کی شکل اختیار کر گئی۔ فراز دانش کو ایذا پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا مگر دانش اب ایسی باتوں کا عادی ہو گیا تھا، وہ سُنی ان سُنی کر دیتا اور اپنے کام سے کام رکھتا۔

دانش کا خیال تھا کہ شاید اسکول کے بعد کالج میں ان دونوں کا ساتھ نہ رہے، اس طرح کالج میں جا کر اس بدتمیز لڑکے سے نجات مل جائے گی مگر کالج تو کالج انٹر کرنے کے بعد جب دانش کا داخلہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہوا تو فراز وہاں بھی کسی آسیب کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ یونیورسٹی میں ان دونوں کا داخلہ الیکٹریکل کے شعبے میں ہوا تھا۔ اور یہ ایک ہی کلاس میں بیٹھا کرتے تھے۔ "اذیت کے چار سال مزید گزارنا ہوں گے"! اس تصور ہی سے دانش کانپ جاتا تھا۔ یوں بھی اب فراز اسکول والا فراز تو نہیں تھا۔ اس کے گرد آوارہ لڑکوں کا ایک گروہ ہر وقت موجود رہتا اور فراز اپنے گمراہ دوستوں کو اپنی اصل قوت سمجھ کر مزید سرکش ہو جاتا۔ دانش نے بارہا کوشش بھی کی کہ کسی طرح فراز سے اُس کی صلح ہو جائے تاکہ یہ دیرینہ دشمنی ختم ہو اور دانش سکون کے ساتھ انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر سکے مگر فراز تو کسی ضدی بچے کی طرح اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دانش کو تنگ کرتے رہنا اُس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہو۔

انجینئرنگ کے دوسرے سال تک پہنچتے پہنچتے دانش اپنی ذہانت کے باعث بہت سی ایسی چیزیں بنا چکا تھا جو یونیورسٹی اور محلے کے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا چکی تھیں۔ کم وولٹیج سے چلنے والے پنکھے، پانی بھرنے کے لیے خود بہ خود چلنے اور بند ہونے والی موٹر، چوری کے ممکنہ خطرے کو بھانپنے والا سائرن اور تار کے بغیر ایک انچ کا چھوٹا سا مگر طاقتور انٹینا اس کی ایسی ایجادیں تھیں جس پر وہ اور اُس کے گھر والے بجا طور پر فخر کرتے تھے۔

فراز اب کھلونے جمع کرنے والا بچہ نہیں رہا تھا وہ بڑا ہو چکا تھا، مگر اُس کے مشاغل بڑے عجیب و غریب

ہو گئے تھے۔ دن بھر ڈرائیونگ کرنا اور پیسے اُڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ غریب لڑکوں سے نفرت کا اظہار کر کے نہ جانے کیوں اُسے راحت سی محسوس ہوتی۔ اپنی ان تمام خامیوں کے باوجود حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے رزلٹ اب بھی اچھے آرہے تھے۔

دانش ایک روز اپنی سائیکل میں چھوٹا سا انجن فِٹ کر کے یونیورسٹی لایا تو اُس کی اس عجیب و غریب سائیکل کو سب نے شوق سے دیکھا اور تعریف کی مگر یہ سائیکل فراز کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ یونیورسٹی سے واپسی پر فراز نے اپنی تیز رفتار کار سے دانش کی سائیکل کو ایسی ٹکر ماری کہ سائیکل تو تباہ ہو گئی مگر خود دانش بھی ہفتہ بھر بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ وہ تو شکر ہوا کہ بات خراشوں اور چند زخموں تک محدود رہی۔ خدانخواستہ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتا تو عمر بھر کی معذوری بھی تو ہو سکتی تھی۔ اس بات پر یونیورسٹی میں بہت واویلا مچا۔ مگر ہونا کیا تھا۔ کچھ دنوں تک یہ بات بھی پرانی ہو گئی۔ دانش اور اُس کے امی ابو صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور کچھ کرتے بھی تو کیا کرتے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کب کسی نے سُنی ہے۔

خدا خدا کر کے انجینئرنگ کے ۴ چار سال بھی ختم ہو ہی گئے۔ سالانہ امتحان دیتے ہوئے دانش کو دوہری خوشی ہو رہی تھی، ایک خوشی تو اس بات کی تھی کہ اس کی تیاری اچھی ہوئی ہے اور وہ یقیناً پہلی پوزیشن حاصل کر لے گا اور شائد اس سے بھی بڑی خوشی فراز کی دشمنی سے نجات حاصل کرنے کی تھی۔ سچ مچ یہ خوشی تو بہت بڑی تھی۔

امتحان ختم ہو گئے صرف وائیوا باقی تھا۔۔ وائیوا کالج اور یونیورسٹی میں ایسے امتحان کو کہتے ہیں جس میں سوال و جواب کا سلسلہ تحریری نہیں۔ زبانی ہوتا ہے۔ وائیوا میں ہر طالب علم کو انجینئرنگ کا ایک تجرباتی ماڈل اور اُس کے متعلق تحقیقی رپورٹ بھی جمع کروانا تھی مگر وائیوا سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل فراز کے والد ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔۔۔ یقیناً یہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ اس ناگہانی موت۔۔۔ نے فراز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دانش نے تعزیت کے لیے فراز کے گھر جانے سے پہلے سو بار سوچا مگر اُس کی ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر ماں کے سمجھانے پر دانش فراز کے ہاں چلا گیا۔

بہت سے لوگ فراز کو حوصلہ دے رہے تھے وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اُسے اپنے ابو کے یُوں بچھڑ جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اُس کی آہیں اور سسکیاں کم ہوئیں تو وہ اپنے امتحان کا ذکر لے بیٹھا۔ اُسے یہ بھی فکر تھی کہ وہ وائیوا نہ دے سکا تو فیل ہو جائے گا۔ اس بار تو فراز نے محنت بھی بہت کی تھی۔ اُس کے والد ایسے وقت جدا ہوئے جب اُس کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اپنے نامکمل ماڈل، ادھوری تحقیقی رپورٹ اور وائیوا نہ دے سکنے کا غم بھی اُسے کھائے جا رہا تھا۔

اگلے روز وائیوا کے متعلقہ اُستاد پروفیسر عرفان صاحب کو ایک خط موصول ہُوا، خط میں لکھا تھا۔۔۔ "والد کے انتقال نے مجھے ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اپنا ماڈل اور تحقیقی رپورٹ جمع کروا رہا ہوں۔ لیکن شاید وائیوا نہ دے سکوں۔ میرے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر مجھے پاس کر دیا جائے تو میرا مستقبل تاریک ہونے سے بچ جائے گا۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔۔۔فراز"۔

خط کے مضمون سے فراز کی مجبوری عیاں تھی۔ چند روز بعد بی۔ ای کے نتائج کا اعلان ہوا تو یونیورسٹی کا ہر لڑکا دم بخود رہ گیا۔ فراز نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس سے بھی زیادہ اہم خبر جو اخبارات کا موضوع بنی وہ یہ تھی "جامعہ انجینئرنگ کے طالب علم فراز نے اپنی بجلی آپ پیدا کرنے والا پنکھا ایجاد کر کے برقیات کی دُنیا میں پاکستان کا وقار بلند کر دیا"۔ اخبارات میں اس ایجاد کی تفصیلات آ رہی تھیں۔ اس ایجاد میں حیرت اور دلچسپی کے کئی اور پہلو بھی تھے۔ ملک بھر کے لوگ فراز کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ مبارک باد کے خطوط آ رہے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے۔۔۔ اسکالرشپ کی پیشکش ہونے لگی۔

چند روز بعد یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں فراز کو گولڈ میڈل دیا جانا تھا۔ اس تقریب میں صوبے کے گورنر یونیورسٹی کے چانسلر ہونے کے ناطے مہمانِ خصوصی تھے۔ تقریب کا آغاز ہوا تو فراز کو اس کی اہم ایجاد کے بارے میں اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ فراز نے مائیک پر آکر بولنا شروع کیا۔ تو ہر آنکھ اُسے رشک سے دیکھ رہی تھی۔

"محترم مہمانانِ گرامی، اساتذۂ کرام اور میرے عزیز دوستو۔

میں آپ کی محبتوں پر آپ کا ممنون ہوں مگر شاید آپ یہ بات نہیں جانتے کہ میں نے پہلی پوزیشن کس طرح حاصل کی؟ اپنے ابو کے انتقال کے بعد میری ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اپنا پروجیکٹ مکمل کر سکتا۔ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے اپنے پروجیکٹ کو میرے نام سے جمع کروا کر میرا مستقبل بچا لیا۔ یہ طالب علم وہی ہے جسے میں نے برسوں ذہنی اذیت دی اور اُسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہا"۔

پورے ہال کو جیسے سانپ سُونگھ گیا ہو۔ ہر شخص اُس طالب علم کا نام جاننے کے لیے بے چین تھا۔ "میرا وہ محسن۔۔۔ دانش ہے۔۔۔ دانش عظیم انسان ہے۔۔۔ دانش بڑا آدمی ہے۔۔۔ صدرِ محترم میں آپ سے گزارش کروں گا کہ جو گولڈ میڈل مجھے دیا جانے والا ہے وہ دانش کے گلے میں ڈالا جائے۔ اس کا اصل حق دار وہی ہے۔" پورا ہال تالیوں سے گُونج اُٹھا۔۔۔ چند لمحوں بعد ہزاروں آنکھوں نے دیکھا کہ فراز اور دانش بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ بغل گیر ہیں۔ بچھڑے ہوئے دوست برسوں بعد ایک بار پھر مل گئے۔

صبح کی نشریات

ثمینہ اختر سیمی

"جوجی، عارفہ، سہیل، گڈو... ارے بھئی، کہاں ہو تم سب؟" چھوٹے چچا کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے بولے: "ہائیں یہ کیا۔ سب بستر خالی... اچھا تو انھیں عقل آ ہی گئی۔ ضرور نماز پڑھ رہے ہوں گے۔ لیکن آج خلافِ معمول صبح سات بجے یہ لوگ اُٹھ کیسے گئے؟" چھوٹے چچا نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیرِ لب کہا اور کمرے کے اندر داخل ہو گئے سارے بستر چادریں اُلٹ پلٹ تھیں رضائیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ اچانک ایک رضائی میں حرکت ہوئی اور وہ اُوپر کو اُٹھی۔ چچا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے رضائی کی طرف دیکھا۔

"ارے باپ رے! یہ رضائی خود بخود بستر سے نیچے اُتر کر چل رہی ہے۔ یا اللہ خیر جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" چچا کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ رضائی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی، گرتی پڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ چھوٹے چچا عین دروازے میں کھڑے کانپنے لگے۔ اچانک رضائی میں سے آواز آئی "توبہ، آپا خود نہیں اُٹھ سکتی تھیں۔ مجھے کہہ دیا رضائی لانے کو۔ ہائے اللہ، اُٹھائی بھی نہیں جا رہی کیا کروں۔"

"ارے یہ تو جوجی کی آواز ہے۔" چھوٹے چچا کی جان میں جان آئی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر رضائی جوجی کے سر سے کھینچ لی۔ "اچھا تو یہ تم تھے، شیطان۔ مجھے ڈرا رہے تھے۔" چچا نے جوجی کے کان پکڑ لیے۔

"ارے میرے کان تو چھوڑیے، میں بتاتا ہوں۔" جوجی میاں تکلیف سے چلائے۔ "وہ جو

آپا ہیں ناں۔ بڑی آپا! جوجی نے معصومیت سے کہا: وہ اور سب بچے ٹی وی والے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ آپا نے کہا "مجھے سردی لگ رہی ہے جاؤ رضائی اُٹھالاؤ۔ بس میں رضائی اُٹھانے آگیا۔ آپ اُٹھوادیں، ناں بہت بھاری ہے۔"

"اُٹھواتو میں دُوں۔ لیکن یہ بتاؤ تم سب نے نماز پڑھی؟" چچانے پوچھا۔

"نہیں چاچو، وہ دراصل" جوجی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ٹھیک ہے چلو، میں ان سب کو بھی دیکھتا ہوں" چچانے رضائی کاندھے پر لادی اور چل پڑے۔

"چاچو کارٹون! چاچو کارٹون!" گڈو انھیں دیکھتے ہی چلّانے لگا۔

"واٹ... کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"گک... کوئی مطلب نہیں چاچو! وہ دراصل ٹی وی پر کارٹون آرہے ہیں۔ دیکھیں" گڈو نے ٹی وی طرف اشارہ کیا۔ جہاں مکی ماؤس چھلانگیں لگارہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ گڈو میاں بھی صوفے پر چھلانگیں لگانے میں مصروف تھے۔ آپی زمین پر دھرنا دیے ڈرامے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ عارفہ اور سہیل ہاتھ میں ٹوتھ پیسٹ پکڑے جھگڑ رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں پیسٹ نکل نکل کر قالین پر گر رہی تھی۔ چنداکی دونوں چوٹیاں کھلی ہوئی تھیں اور منہ پر انڈا لگا ہوا تھا۔ ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ وہ برابر ٹی وی کو تک رہی تھی۔ چچا اس منظر کو دیکھ کر بوکھلا گئے۔

"ارے کیا تم سب کا روز کا یہی معمول ہے کہ صبح اُٹھتے ہی بغیر منہ ہاتھ دھوئے، بغیر نماز پڑھے ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے ہو" چچانے عارفہ سے کہا عارفہ نے ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب بند کرتے ہوئے منہ بگاڑ کر کہا: "چاچو اب کیا کریں، ٹی وی پر اتنے اچھے پروگرام آرہے ہیں۔"

"تو یہ اچھے پروگرام تمھیں اسکول جانے کی تیاری سے روکتے ہیں..." ابھی چچانے جُملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ بڑے بھیا ورزش کرتے بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور چچا سے ٹکرا گئے۔ جس کے نتیجے میں قریب پڑی ہوئی چائے دانی چکنا چور ہوگئی اور چچا منہ کے بل چائے کے اُوپر جاگرے۔

"لاحول ولا قوۃ! تمھیں ورزش کمرے میں ہی کرنی ہے، باہر لان میں جاکر دو" چچا کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھے۔

"چاچو! سب لوگ تو ٹی وی کے سامنے کھڑے ہو کر ورزش کرتے ہیں۔ اگر یہ لان میں چلے گئے تو ٹی وی بھی لان میں لے جانا پڑے گا کیونکہ ورزش تو ٹی وی پر ہی سکھاتے ہیں، ناں" گڈو نے علمیت جتائی مگر بھیا کی گھورتی آنکھیں دیکھتے ہی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں امی جان کمرے

میں داخل ہوئیں۔

"عارفہ! تم لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے . . . تمھارے ڈیڈی کب کے دفتر جا چکے ہیں" امّی جان نے سب کو بے ترتیبی کی حالت میں دیکھا تو غصّے سے کہا۔

"امّی جان! بس ابھی تیار ہوئے' ایک منٹ میں" سہیل چلّایا۔ "ناشتا لگ گیا کیا؟"

"ہاں ناشتا لگ چکا ہے تم لوگ آجاؤ۔"

"اوکے امّی جان! ابھی آئے" گڈّو نے کہا اور غڑاپ سے صوفے کے نیچے گھس گیا۔

"ہائے چاچو! مجھے باہر نکالیں" دوسرے ہی لمحے اس کے چلّانے کی آواز آئی۔ بڑے بھیّا نے اُس کی باہر لہراتی ہوئی ٹانگ کھینچی تو گڈّو میاں ہاتھ میں جوگر لیے باہر گھسٹ آئے اور جلدی جلدی انھیں پہننے لگے۔ آپا نے پھُرتی سے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہُوا برش اُٹھا لیا... اور ابھی سر پر پھیرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ عارفہ نے جھٹ سے برش جھپٹا اور جلدی جلدی اپنے بوائے کٹ بالوں پر پھیرنے لگی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ برش مجھے دو" آپا چلّائیں۔ عارفہ نے برش اُنھیں تھمایا اور فوراً باہر بھاگی چند لمحے بعد وہ ٹرے میں ناشتہ لیے صوفے پر براجمان ڈرامہ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ ہنسنے سے چائے چھلک چھلک کر گر رہی تھی۔ چچا دیوار سے ٹیک لگائے سارا منظر دیکھتے رہے۔ سہیل صاحب نے الماری کھول کر زمین پر کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ہاتھ کپڑے ڈھونڈ رہے تھے، نظریں ٹی وی پر لگی ہوئی تھیں۔ چندا اپنی چوٹیوں میں ربن باندھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ بڑے بھیّا ورزش کرنے کے ساتھ ساتھ پاؤں سے قالین اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں سلائس تھا، جو ورزش کے دوران کھایا جا رہا تھا۔ چچا سب کا جائزہ لے کر کمرے سے نکل گئے۔ انھیں افسوس ہو رہا تھا کہ ان بچّوں نے تفریح کو اپنے لیے مصیبت بنا رکھا ہے اور یہ سب اگر اسی طرح تیار ہوتے رہے تو وقت پر اسکول بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟ چچا دل ہی دل میں سوچنے لگے اور پھر مسکرا کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ ڈرائنگ روم کافی بڑا تھا جس کے درمیان موتیوں والا پردہ لٹکا کر دوسری طرف ڈائننگ ٹیبل رکھی گئی تھی۔ چچا نے ڈائننگ ٹیبل والے حصّے کا جائزہ لیا اور باہر نکل گئے۔

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ٹرن ٹرن الارم بڑی زور سے چیخا۔

"اُف توبہ' یہ کیا مصیبت ہے۔ ارے بند کرو اِسے" عارفہ کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑائی' مگر الارم کیسے بند ہوتا' ٹائم پیس تو چچا کے ہاتھ میں تھا، جسے وہ بجائے جا رہے تھے۔ آخر کار انھوں نے

سب کو جگا کر ہی دم لیا۔

"چاچُو! آپ نے ہماری نیند خراب کر دی"۔ آپا ناراض ہو کر بولیں۔

"نیند تو آپ کی بہت ہو گئی۔ اب سب لوگ اُٹھیے وضو کیجئے، نماز پڑھیے"۔

"کیا اتنی صبح صبح وضو...! ہائے اللہ سردی لگے گی"۔ سہیل ایک دم سُکڑ کر رضائی میں گھُس گیا۔

"کوئی سردی وردی نہیں، اُٹھو، پانی گرم آرہا ہے"۔ چچا نے حکم دے دیا۔ آخر سب کو اُٹھنا ہی پڑا۔ باری باری وضو کر کے سب نے نماز پڑھی۔

"شاباش' اب جلدی سے اسکول کی تیاری کر لو۔

آرام سے' تسلی سے"۔ چچا نے گڈو کی بیٹھ تھپکی وہ منہ بناتا ہُوا جوتا ڈھونڈنے صوفے کے نیچے گھُس گیا۔ سہیل الماری کھولے کپڑے تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ مگر آج اس کی نظریں چونکہ کپڑوں پر تھیں، اس لیے یونیفارم جلد ہی مل گیا جلد ہی سب لوگ تیار ہو کر چچا کے پاس کھڑے تھے۔ صاف صاف نکھرے نکھرے سب کتنے اچھے لگ رہے تھے۔

"ارے سواسات ہو گئے"۔ اچانک گڈو گھڑی پر نظر ڈال کر چلایا اور ٹی وی کی طرف بھاگا۔

"ہائیں، ٹی وی کہاں ہے؟" اُس نے پریشانی سے کمرے سے نکل کر کہا۔

"کیا کہا۔ ٹی وی کمرے میں نہیں ہے"۔ آپا چِلّائیں۔

"چور لے گئے"۔ چچا مُسکرائے۔

"چاچُو! مذاق نہ کریں۔ بتائیں، ٹی وی کہاں ہے؟" سہیل چچا کے کندھے سے لٹک گیا۔

"آؤ، میں بتاؤں، ٹی وی کہاں ہے؟" ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ "بیٹھو یہاں اور ٹی وی دیکھو"۔ انھوں نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے چچا نے ٹی وی آن کر دیا۔

"چاچُو! کیا شام کو بھی ہم لوگ ڈائننگ روم میں ہی بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں گے؟ جوجی میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے نہیں، شام کے وقت ہم یہ موتیوں والا پردہ ہٹا دیں گے اور آرام سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں گے"۔

"چاچُو کارٹون!" گڈو چِلّایا۔

"کیا کہا" چچا بھی چلّائے۔

"ارے آپ کو نہیں، وہ ٹی وی پر کارٹون آرہا ہے، دیکھیں ناں"۔ گڈو ہنسا۔

"کارٹون تمھیں پسند ہیں؟" چچا نے پوچھا۔

"جی، بہت زیادہ"۔ گڈو نے چہک کر کہا۔

"ہر کسی کو اپنے جیسی ہی چیز پسند ہوتی ہے"۔ آپا بولیں اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے رشید ناشتہ لگانے میں مصروف تھا اور سب خوش تھے۔ کہ آج وہ بہت عرصے بعد وقت پر اسکول پہنچیں گے۔

ایڈگر ایلن پو

دُنیا کی مُختصر ترین کہانی

اندھیری رات میں دو اجنبی ٹرین پر سفر کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"بھائی، کیا تمہیں جنّوں اور بھُوتوں پر یقین ہے؟"

یہ سُنتے ہی دُوسرا دھواں بن کر غائب ہوگیا۔

تصویر کی حقیقت

شمارہ مارچ کے رنگین صفحات میں ہم نے ان صاحب کی ایک تصویر شائع کی تھی اور آپ سے پوچھا تھا کہ کیلی فورنیا کے رہنے والے یہ صاحب اپنی شکل کس طرح بگاڑتے ہیں؟ ہمارے اکثر ساتھی اس معمّے کو نہیں سمجھ سکے۔ لیجیے اب ہم ان صاحب کی تصاویر شائع کر رہے ہیں جنہیں دیکھ کر آپ سمجھ جائیں گے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے صرف دو چیزیں چاہییں ایک شیشہ اور دوسرا تھوڑی سی اداکاری۔

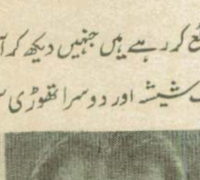

ایک ہی چہرے کے دو رُخ

ناگوار بھی - خوشگوار بھی

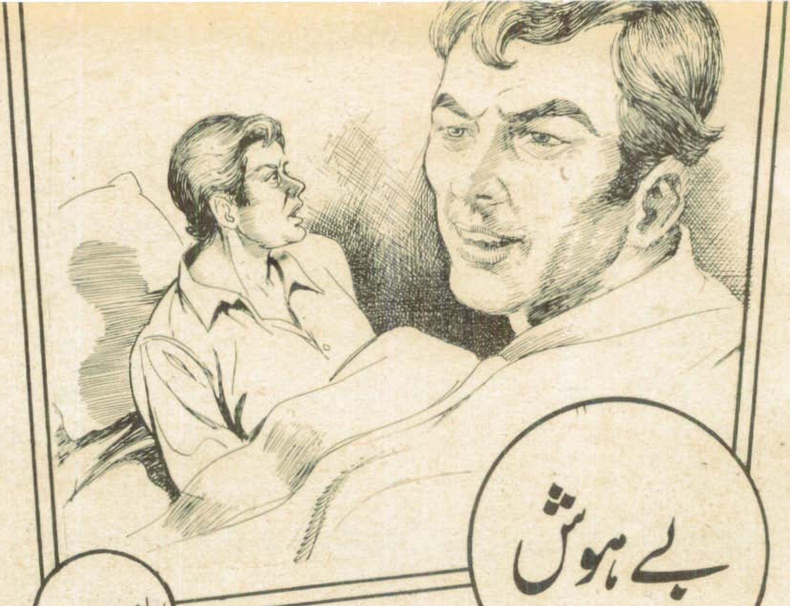

بے ہوش

ایاز محمود

کچھ دنوں کی دوڑ بھاگ کے بعد آخر رحمت کو ایک سرکاری ادارے میں نوکری مل ہی گئی۔ کلرک کی نوکری تھی، تنخواہ گو معمولی تھی، مگر اس کی ضروریات بھی محدود تھیں لہٰذا وہ اس طرف سے بہت مطمئن تھا۔

اُس نے اپنی ساری توجہ کام سیکھنے پر لگا دی اور چند ہی دنوں میں اپنے کام کو بخوبی سمجھنے لگا۔ ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اُس نے دفتر میں ہونے والی خلافِ قاعدہ باتوں کو محسوس کرنا شروع کیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے ساتھی وقت پر دفتر نہ آتے، جان بُوجھ کر کام کو خراب کر دیتے اور دنوں کے کام کو ہفتوں میں بھی نہ کرتے۔

اس کے دفتر میں روزانہ بہت سارے لوگ اپنے اپنے کاموں سے آتے تھے۔ رحمت نے محسوس کیا کہ اُن میں سے اکثر لوگوں کو معمولی کام کے لیے بار بار آنا پڑتا۔ سخت پریشانی اُٹھانا پڑتی اور ان کا کام پھر بھی نہ ہو پاتا۔ ان کی فائلیں افسر صاحب کی میز تک پہنچ ہی نہ پاتیں یا پھر کوئی نہ کوئی کاغذ ہی فائل سے گم ہو جاتا۔ وہ کچھ دنوں تک یہ سب چپ چاپ دیکھتا رہا۔ ایک دن اُس سے صبر نہ ہوا اور اُس نے اپنے ساتھی کلرک حسن سے ان سب باتوں کا سبب پوچھ

ہی لیا۔

حسن نے مسکراتے ہوئے کہا: "احمق کہیں کے اگر ہم وقت پر آئیں، دل لگا کر کام کریں اور ہم سے کوئی تنگ نہ ہو تو ہمارا کیا بنے"؟

"کیا مطلب؟" رحمت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ بھولے بادشاہ، لوگوں کا کام جب آسانی سے نہیں بنتا تب ہی تو وہ ہماری مٹھی گرم کرتے ہیں۔ قاعدے کے مطابق سب کا کام ہوجایا کرے تو ہمیں کون پوچھے۔ ہمارے چائے پانی کا کیا ہو"؟

"مگر... مگر ہمیں تنخواہ جو ملتی ہے کام کی"۔

"تنخواہ..."؟ حسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ہم بگڑی ہوئی عادتوں والوں کا تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ مجبوری ہے"۔

"یہ تو رشوت ہے سراسر" رحمت نے چیخ کر کہا: "یہ تو حرام کی کمائی ہے"۔

"آرام سے میرے بھائی" حسن نے ہنستے ہوئے کہا "کچھ دنوں بعد یہ باتیں تمہیں بری نہیں لگیں گی۔ بلکہ تم خود یہ سب کرنے لگو گے"۔

دن گزرتے گئے اور آہستہ آہستہ ماحول کے خراب اثرات نے رحمت پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ اب اُس نے اپنی ضروریات کو بھی پھیلا لیا تھا۔ جیسے ہی اُس کی جھجک دُور ہوئی تو اُس نے بھی حلال اور حرام کی تمیز چھوڑ دی۔ اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی اب وہ بھی لوگوں کو خوب تنگ کرتا اور جب وہ تھک ہار کر زچ ہوجاتے تو پھر اُنہیں دونوں ہاتھوں سے لُوٹتا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے ذرا رحم نہ آتا۔

روپے پیسے کی فراوانی نے رحمت کو مغرور اور تفکرات نے اُسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اُس دن دفتر میں کام معمول سے زیادہ ہی تھا۔ اُسے بیٹھے بیٹھے کچھ تھکن سی محسوس ہوئی۔ اُس نے کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے چھٹی لی اور گھر آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک اُس کا سر چکرانا شروع ہوگیا۔ اُسے اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا" ایک خوفناک صورت والا دیو نما آدمی اُس کے اوپر جُھکا ہوا ہنس رہا تھا: "تمہارا وقت اب ختم ہوچکا ہے۔ چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں"۔

"مگر... مگر تم کون ہو؟" رحمت نے بڑی مشکل سے کہا۔
"اب تمہیں سوال و جواب کی کوئی مہلت نہیں ملے گی" جلاد نما شخص نے کہا۔
"تمہیں بس میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ لو میرا ہاتھ پکڑ لو"
رحمت نے خود کو نہایت تیزی کے ساتھ ہوا میں اُڑتا ہوا محسوس کیا۔
آخر کار جب وہ دوبارہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا تو وہ ایک جھونپڑی کے اندر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی چارپائی پر ایک بچّی لیٹی ہوئی تھی اور اُس کے اِردگرد کھڑے ہوئے بہت سے مرد عورتیں اور بچّے زار و قطار رو رہے تھے۔
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ بچّی اب اس دنیا میں نہیں" اُسی خوفناک چہرے والے نے کہا۔ اور... اور اس بچّی کے قاتل تم ہو، تم نے اِسے قتل کیا ہے"
"میں...؟" رحمت کو ایک مرتبہ پھر چکر آ گئے "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تو اس بچّی کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں"
"تمہیں پتا ہے کہ اس بچّی کو علاج کے لیے گاؤں سے شہر کیوں نہیں لے جایا جاسکا؟" ڈراؤنے شخص نے کہا "وہ اس لیے کہ گاؤں سے شہر کے رستے میں کوئی سڑک ہی نہیں۔ سڑک بنتی بھی تو کیسے۔ سرکاری خزانے میں تم نے پیسے ہی نہیں پہنچنے دیے۔ وہ تو تم نے بیچ میں سے ہی اُڑا لیے۔ اب بتاؤ تمہیں قاتل نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے"
رحمت کو اپنا سر نہایت تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہوا، اُس نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں...!
آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولیں تو شروع میں اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ جب اُس کے اوسان بحال ہوئے تو اُس نے یکایک اُٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کے چاروں طرف گھر کے لوگ جمع تھے۔ ان کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔
"لیٹے رہیے بھائی جان" اُس کے چھوٹے بھائی نے اُسے پکڑ کر لٹاتے ہوئے کہا "آپ کی طبیعت سخت خراب ہوگئی تھی۔ آپ کو دل کا دورہ پڑا تھا اور آپ بے ہوش ہو گئے تھے"
رحمت نے کچھ کہنا چاہا مگر کمزوری کی وجہ سے زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ "جو لوگ مجھے بے ہوش سمجھ رہے تھے اُنہیں کیا معلوم کہ دراصل تو میرے ہوش میں آنے کا وقت تھا"

گفتگو

گیانا (افریقہ) کی کہانی

HAROLD COURLANDER

ترجمہ

سلمیٰ سلیم

کسی زمانے میں افریقی ملک گیانا میں ایک کسان رہتا تھا۔ ایک دن کسان اپنے کھیت سے اروی نام کی سبزی کھودنے گیا۔ تاکہ اُسے کھود کر بازار لے جاکر فروخت کر سکے، کھیت پر پہنچ کر کسان نے جیسے ہی ارویاں کھود کر نکالنی شروع کیں، ایک اروی نے اُس سے کہا۔

"اچھا! تو بالآخر تم آپہنچے، مگر اس سے پہلے تو تم کبھی میری دیکھ بھال کرنے نہیں آئے۔ پَر اب جبکہ تمہیں میری ضرورت ہے تم اپنا پھاوڑا اُٹھا کر چلے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

کسان نے چونک کر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اچانک کسان کی نظر کھیت میں ایک طرف کو کھڑی ہوئی اپنی گائے پر پڑی۔ گائے اُس وقت جگالی کر رہی تھی اور کسان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم نے ابھی مجھ سے کچھ کہا؟" کسان نے گائے سے پوچھا۔

گائے نے کسان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مزے سے جگالی کرتی رہی۔ تبھی کسان کے پاس کھڑا ہوا کسان کا کتا بول اُٹھا۔

"یہ گائے نہیں تھی بلکہ تمہاری اروی تھی۔ اس نے تم سے کہا ہے کہ تم اُسے اکیلا چھوڑ جاؤ۔"
کسان کو غصہ آگیا کیوں کہ آج سے پہلے اُس کے کتے نے اُس کے ساتھ بات نہیں کی تھی۔ کسان کو کتے کا لہجہ بھی بہت بُرا لگا۔ چنانچہ غصے میں بھرے کسان نے جیب سے چاقو نکال کر پاس کھڑے ہوئے ناریل کی شاخ کاٹ لی تاکہ کتے کو باندھ سکے۔ کسان نے جیسے ہی ناریل کی شاخ کاٹی ناریل کا درخت بولا۔

"میری شاخ کو نیچے رکھ دو۔"

اب تو کسان گھبرا گیا۔ اور اس نے ناریل کی شاخ کو زمین پر پٹخنا چاہا۔ اسی لمحے ناریل کے درخت سے آواز آئی۔

"انسان کے بچے مجھے آرام سے نیچے رکھو۔"

کسان نے نہایت آرام کے ساتھ جیسے ہی ناریل کی شاخ کو ایک پتھر پر رکھا پتھر بول پڑا۔

"ارے... ارے میرے اوپر سے ہٹاؤ اس کو۔"

اب تو حد ہوگئی تھی چنانچہ کسان خوفزدہ ہوکر اپنے گاؤں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ راستے میں اُسے ایک مچھیرا ملا جو جال سر پر رکھے ہوئے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ کسان کو دوڑتے دیکھ کر مچھیرے نے کسان سے پوچھا۔

"اتنی تیزی میں کہاں جا رہے ہو... خیریت تو ہے۔"

کسان ہانپتے ہوئے بولا۔

"میرے کھیت کی اروی نے مجھ سے کہا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پھر کتے نے کہا کہ اروی کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ۔ پھر جب میں نے اپنے کتے کو باندھنے کے لیے ناریل کے درخت کی شاخ کاٹی تو درخت نے کہا میری شاخ کو نیچے رکھ دو۔ اور جب میں نے ناریل کی شاخ کو پھینکنا چاہا تو اُس نے کہا۔ مجھے آرام سے رکھو۔ پھر جب میں نے اُسے آرام سے ایک پتھر پر رکھ دیا تو پتھر نے کہا میرے اوپر سے ہٹاؤ اس کو..."

"بس" مچھیرے نے کسان کی روداد سُن کر کہا۔ "تو کیا یہ اتنی ڈرا دینے والی باتیں ہیں کہ تم یوں بھاگ پڑو۔"

"اچھا" مچھیرے کے جال سے آواز آئی۔

"تو کیا اس آدمی نے پتھر پر سے شاخ کو ہٹا دیا تھا؟" جال سے دوبارہ آواز آئی۔

"ہیں...!" مچھیرا اچھلا اور اُس نے جال کو سر پر سے اُتار کر پھینک دیا اور کسان کے ساتھ مل کر

گاؤں کی جانب بھاگنے لگا۔ راستے میں اُنہیں ایک جولاہا ملا جو اپنے سر پہ کپڑوں کی گٹھری رکھے کہیں جارہا تھا۔ جولاہے نے دونوں کو بُری طرح بھاگتے دیکھا تو پوچھا۔

"یارو اتنی تیزی میں کہاں جارہے ہو؟"

دونوں بھاگتے بھاگتے رُک گئے۔ کسان نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ جولاہے کو سُنایا۔ اس کے بعد مچھیرے نے جولاہے کو اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بتایا۔

"مگر اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟" جولاہے نے دونوں کی کہانی سُننے کے بعد کہا۔

"کیوں اس میں پریشانی کی بات کیوں نہیں۔ اگر کوئی ایسا واقعہ تمہارے ساتھ پیش آتا تو تم بھی بھاگ کھڑے ہوتے۔" جولاہے کے سر پر رکھی ہوئی گٹھری سے آواز آئی۔

"میرے خدا!" جولاہا چلایا۔ اُس نے فوراً کپڑوں کی گٹھری کو زمین پر پھینک دیا اور اُن دونوں کے ساتھ مل کر بھاگ کھڑا ہوا۔

تینوں بھاگتے بھاگتے ایک ندی کے کنارے جا پہنچے۔ ندی میں ایک شخص نہارہا تھا۔ اُس نے جب تینوں کو بھاگتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا آپ لوگ کسی ہرن کا پیچھا کررہے ہیں؟"

وہ تینوں رُک گئے اور انہوں نے باری باری اپنے ساتھ پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات ندی میں نہانے والے شخص کو سُنائے۔

"تو کیا آپ صرف اسی وجہ سے بھاگ رہے ہیں؟" ندی میں نہانے والے نے تینوں کے قصے سُن کر پوچھا۔

"اگر تمہارا ایسی حالت سے واسطہ پڑتا تو کیا تم نہ بھاگ پڑتے؟" ندی کے پانی سے صدا آئی۔

یہ صدا سُنتے ہی ندی میں نہانے والے نے پانی سے باہر چھلانگ لگادی اور ان تینوں کے ساتھ مل کر گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ چاروں بھاگتے ہوئے گاؤں کے سردار کے پاس پہنچے۔ سردار کے ملازم نے سردار کے بیٹھنے کے لیے ایک مخصوص اسٹول لاکر بیٹھک میں رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد سردار اپنے گھر سے بیٹھک میں آگیا اور اسٹول پر بیٹھ کر ان چاروں سے اپنے مسائل بیان کرنے کو کہا۔

چاروں نے یکے بعد دیگرے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سردار کو سُنائے۔ سردار نے نہایت

اطمینان کے ساتھ اُن چاروں کے قصّے سُنے ۔ قصّے سُننے کے بعد اُس نے تیوری پر بل چڑھا کر قدرے غصّے کے ساتھ اُن سے کہا ۔

" دیکھیے صاحبان آپ کی کہانیاں انتہائی فضول اور احمقانہ ہیں ۔ چنانچہ قبل اس کے کہ میں آپ چاروں کو گاؤں کا امن خراب کرنے کے الزام میں سزا دوں بہتر ہو گا کہ آپ سب اپنے اپنے کاموں پر جائیں "

سردار کا جواب سُن کر وہ چاروں اپنے اپنے کاموں پر جانے کے لیے اُٹھ کر وہاں سے چلے گئے ۔ اُن چاروں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد سردار نے ناگواری کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے خود سے سرگوشی کی ۔

"اس قسم کی باتوں سے گاؤں کا امن تباہ ہو سکتا ہے "

"کتنے عجیب قصّے ہیں ۔ ہیں نا ۔ ذرا ایک بولتی ہوئی اروی کا تصوّر تو کیجیے " سردار کے اسٹول سے آواز آئی ۔

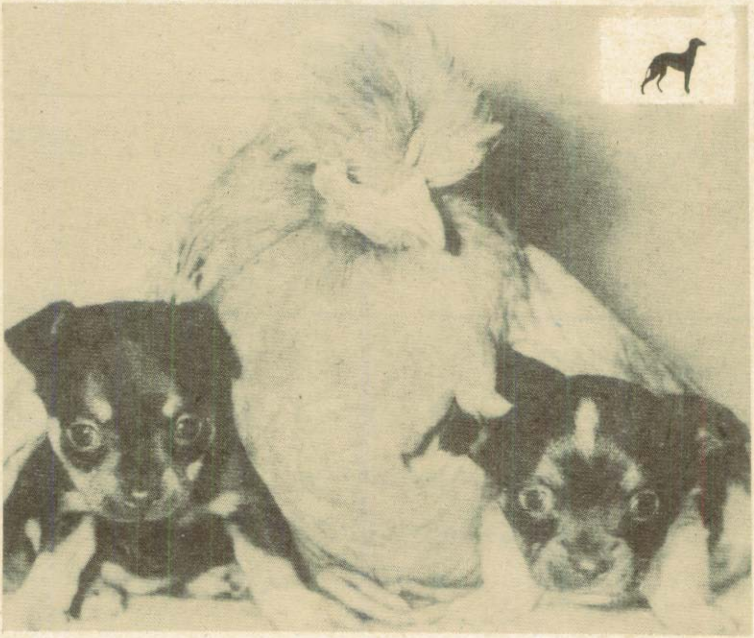

دو پلّے مُرغی کی امان میں ہے نا حیرت کی بات ...؟

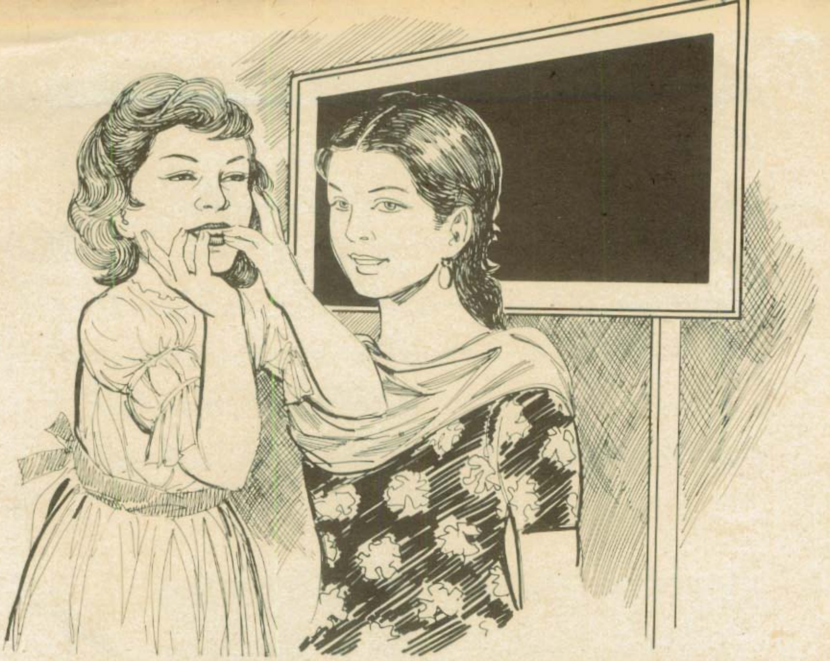

تجارتی کہانی

حجاب امتیاز علی

سائن بورڈ ایک چینی فوجی کا مسئلہ بن گیا

شہر شوں شوں کے بازار میں نُکڑ کے پاس ایک ننھا سا ریستوران تھا۔اس ریستوران کے دروازے کے اوپر ایک کالے تختے پر لکھا ہوتا تھا۔

"یہاں تازہ عُمدہ مچھلی ہر وقت ملتی ہے" اور یہ واقعہ تھا کہ یہاں کی تلی ہوئی مچھلی تمام شہر میں مشہور تھی۔ سُرخ سُرخ اور مزے دار اور اس پر آلو کے قتلے پڑے ہوئے۔

تین سال پہلے میں اور میری چینی سہیلی شین فون مچھلی کھانے کے لیے بلا ناغہ ہر شام وہاں جایا کرتی تھیں اور مچھلی کھانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ مچھلی جنت کی کسی نہر سے پکڑ کر فرشتوں نے جنت ہی کے کسی چُولھے پر تلی ہے۔

ان واقعات کو ایک عرصہ گزر گیا۔میں اور میری سہیلی شین فون دُنیا کی سیاحت کے لیے

نکل پڑیں۔

اب پچھلے دنوں اتفاق سے ہمارا جہاز شہر شوں شوں کے ساحل سے آ لگا تو شین فون نے اپنی ننھی ننھی آنکھیں بمشکل پھیر کر خوشی کے لہجہ میں مجھ سے کہا "روحی! روحی! چلو بازار جا کر اپنے پرانے ریستوران سے مچھلی کھا آئیں۔"

مجھے اُس کی رائے بہت پسند آئی۔ میں جہاز کی چوبی سیڑھیوں سے نیچے کُود پڑی اور ہم دونوں بازار کی طرف روانہ ہو گئیں۔

وہاں جا کر دیکھا۔ تو وہ سائن بورڈ نظر نہ آیا جس پر مچھلی کا اشتہار ہوتا تھا۔ ہم مایوس ہو کر لوٹنے ہی کو تھے کہ شین فون نے اپنی ناک پھُلا کر پہلے تو خُوشبُو سونگھی پھر ایک دکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "روحی! ہو نہ ہو مچھلی کی دُکان بس یہی ہے دیکھو کیسی لذیذ خوشبو آ رہی ہے۔"

میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو دکان پر ایک سادہ کالا تختہ لگا ہوا تھا مگر اُس پر نہ دکان کا نام تھا نہ مچھلی کا اشتہار تھا صرف سادہ تختہ لگا ہوا تھا لیکن مچھلی کی خوشبو سونگھ کر اُس دکان میں گھُسنا ہی پڑا۔

اندر جا کر دیکھا تو ہماری آنکھیں کھُل گئیں بیسیوں آدمی چھوٹی چھوٹی میزوں پر بیٹھے مزے سے تلی ہوئی مچھلی اور آلو کے قتلے اُڑا رہے تھے سب کے منہ مچھلی سے اور آنکھیں خوشی سے لبریز تھیں۔

وہ پُرانا بوڑھا دکاندار جس نے اپنی تمام زندگی مچھلی تلنے کے فن پر غور کرتے کرتے صرف کر دی تھی مسکراتا ہوا ہماری طرف آیا اور ادب سے جھُک کر بولا "لاؤں مچھلی؟"

میری چینی سہیلی شین فون اپنے چینی وضع کے تاریخی لباس میں بالکل گڑیا لگتی تھی اُس کی آنکھیں بھی گڑیا کی سی تھیں۔ اُس نے شوق سے کہا "ضرور لے آؤ دو پلیٹیں۔"

مگر میں نے دکاندار سے حیران ہو کر کہا "ہائیں! تم نے اپنی دکان کا نام اور اشتہار کیوں نکال دیا اور سادہ کالا تختہ کیوں لگا رکھا ہے اس میں ضرور کوئی بھید ہو گا"؟

وہ ایک بوڑھے جن کی طرح ہنس پڑا۔ بولا "حضور آپ دونوں گرم گرم مچھلی کی پلیٹوں کے آگے بیٹھ جائیں پھر میں اپنی کہانی سناؤں گا۔"

شین فون نے فوراً چٹورپن کے انداز میں اپنی چھُری اور کانٹا اُٹھا لیا۔ اور منہ میں مچھلی کا ایک ٹکڑا رکھ کر بولی "اب بتاؤ"۔ بوڑھا باورچی مزے لے لے کر قصّہ سنانے لگا۔

"ایک سال کا عرصہ ہوا ایک دفعہ یہاں ایک سُرخ مونچھوں والا لمبا تڑنگا فوجی کھانے کے لیے آیا اُسے میری مچھلی اتنی پسند آئی کہ اُس نے مجُھ سے دوستی کر لی۔ ایک دن اُس نے مجُھ سے دوستانہ لہجہ میں کہا۔ دُکان کی ترقی کا بھید اشتہار میں ہوتا ہے میں نے تمہارے سائن بورڈ کو بڑے غور سے پڑھا ہے اس پر لکھا ہے "یہاں تازہ عمدہ مچھلی ہر وقت ملتی ہے۔" میرا خیال ہے کہ اس سطر میں "یہاں" کا لفظ فضول ہے اسے نکال ڈالو۔

اس پر میں نے دوسرے دن بورڈ پر لکھ لگایا۔

"تازہ عمدہ مچھلی ہر وقت ملتی ہے۔" تیسرے دن وہی فوجی آیا اور کہنے لگا۔"میں کل تمام رات غور کرتا رہا اس سطر میں تازہ کا لفظ بھی فضول ہے اسے بھی نکال دو۔"

چنانچہ تیسرے دن میں نے تازہ کا لفظ بھی مٹا دیا۔ اور لکھ دیا" عُمدہ مچھلی ہر وقت ملتی ہے۔" چوتھے دن وہی فوجی آیا اور کہنے لگا"عمدہ کا لفظ بھی بے معنی ہے اس پر میں نے وہ لفظ بھی مٹا دیا اور لکھ دیا۔

"مچھلی ہر وقت ملتی ہے۔"

پانچویں دن فوجی بولا۔"میں رات بھر سوچتا رہا ہوں۔ ہر وقت کا لفظ بھی بہت برُا معلوم ہوتا ہے۔"

اس پر میں نے لکھ دیا" مچھلی ملتی ہے۔" چھٹے دن فوجی پھر آیا اور کہنے لگا " ملتی ہے " کے لفظ بھی مجھے رات بھر کھٹکتے رہے صرف " مچھلی" لکھنا کافی ہے۔"

"چنانچہ چھٹے دن بورڈ پر صرف " مچھلی" لکھا رہ گیا۔

ساتویں دن وہی فوجی دوست آیا اور کہنے لگا"میں رات بھر غور کرتا رہا ہوں یہ مچھلی کا لفظ بھی مجھے ناپسند ہے تم صرف سادہ بورڈ لگوا دو۔ تمہاری مچھلی کی خوشبُو سے تمام بازار مہکتا رہتا ہے۔ جس کی ناک ہوگی وہ خود خُوشبُو سونگھتا ہُوا تمہاری دکان پر پہنچ جایا کرے گا۔"

"مجھے بھی یہ بات معقول معلوم ہوئی چنانچہ میں نے بورڈ کے تمام حرف مٹا دیے اور سادہ کالا بورڈ لگا دیا۔ اب لوگ پہلے کی نسبت زیادہ آتے ہیں اور زیادہ شوق سے مچھلی کھاتے ہیں۔"

میں اور میری سہیلی بوڑھے دکاندار کی ذہانت پر زور سے ہنس پڑیں اور رومال سے اپنے ہونٹ پونچھتی ہوئی بندرگاہ کو روانہ ہوگئیں۔

سلسلے وار سائنسی ناول

عکس

شاھنواز فاروقی

قسط نمبر ۶

۲۰۰۴ء کا زمانہ ۔ سرمد ایک میوزیم میں منتظم کے عہدے پر فائز ہے ۔ سرمد کے بچپن کا دوست حارث پاکستان کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی ہے ۔ ایک دن سرمد حارث کے بلاوے پر کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم گیا۔ حارث نے اس میچ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ بائیں ہاتھ سے بولنگ کرکے انگلستان کی ٹیم کو دونوں اننگز میں انتہائی کم اسکور پر آؤٹ کر دیا ۔ حارث کی ناقابلِ یقین حیرت انگیز بولنگ پر ہر شخص حیران رہ گیا ۔ میچ کے اختتام کے بعد حارث ایک نامعلوم کار میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا ۔ ایک ہفتہ تک کسی کو پتا نہ چلا کہ حارث کہاں ہے ... پھر حارث کی طرف سے ایک اخبار کو اطلاع ملی کہ وہ جب تک خود منظرِ عام پر نہ آجائے اُسے تلاش نہ کیا جائے ۔ حارث کی اس پُراسرار گمشدگی نے پوری دُنیا کو حیران کر دیا تھا ۔ کچھ دنوں بعد حارث خود منظرِ عام پر آگیا ۔ ایک دن سرمد کو اپنے ایک اور بچپن کے دوست فراز کا ٹیلی فون موصول ہُوا ۔ فراز سرمد سے فوراً ملنا چاہتا تھا ۔ فراز نے فون پر سرمد کو بتایا کہ وہ اس سے حارث کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے ۔ سرمد نے فراز کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کر لیا اور پھر فراز کی آمد کا انتظار کرنے لگا ۔ فراز مقررہ وقت پر سرمد کے گھر پہنچ گیا ۔ سرمد کو فراز کچھ بدلا بدلا سا لگا ۔ کھانا کھانے کے بعد ایک عجیب بات ہوئی فراز نے سرمد کے بیٹے بہزاد کی کتاب پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ۔ سرمد کو فراز کے اس رویّے پر حیرت ہوئی مگر اُس نے اظہار نہ کیا۔ پھر وہ دونوں لائبریری میں آبیٹھے ۔ لائبریری میں گفتگو کے آغاز پر فراز نے سرمد کو مہاتما بدھ کی ایک مورتی دکھائی ۔ ایسی ہی ایک مورتی سرمد کے میوزیم میں بھی موجود تھی ۔ سرمد کو حیرت ہوئی کہ یہ مورتی فراز کے پاس کہاں سے آئی ؟ سرمد نے مورتی کا معائنہ کیا تو وہ اصلی نکلی ۔ فراز نے وہ مورتی سرمد کو تحفے میں دے دی ۔ گفتگو کے دوران دو اور حیرت انگیز انکشافات ہوئے ، بچپن میں فراز کے بائیں ہاتھ پر جو دھبّہ تھا ۔ وہ اس کے دائیں ہاتھ پر آگیا تھا اور اس کا دل بائیں کے بجائے دائیں جانب دھڑک رہا تھا ۔ سرمد کو شک ہوا کہ کہیں فراز گوشت پوست کا عکس تو نہیں ؟

اُس نے فراز کو آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو اُس کا شک درُست ثابت ہُوا ۔ گھر آنے کے بعد فراز نے سرمد سے مورتی چُرانے کے حوالے سے معذرت کی ۔ سرمد نے جب فراز سے پوچھا کہ حارث اُس کے قبضے میں کیسے آگیا تھا تو اُس نے بتایا کہ وہ اپنے آخری ٹیسٹ میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا ، سو میں نے اُسے بے ہوش کر کے عکس میں تبدیل کر دیا ۔ جس کے بعد حارث نے کرکٹ کے میدان میں حیرت بولنگ کا مظاہرہ کیا ۔ سرمد نے فراز کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس غیر معمولی تحقیقی کام کو چھپوادے تاکہ اُسے نوبل پرائز مل

سکے۔ مگر فراز نے اُس کا مشورہ ٹھکرادیا اور کہا کہ وہ قدیم نوعیت کی چیزوں کو عکس میں تبدیل کرکے اُن کا وسیع پیمانے پر کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ یہ سُن کر سرمد کو حیرت ہوئی۔ سرمد کو معلوم نہیں تھا کہ فراز کے اس بدلے ہوئے رویّے کے اسباب کیا ہیں؟ اسباب جاننے کے لیے اب فراز کے ساتھ پیش آنے والے واقعات ملاحظہ کیجیے۔

فراز نے سرمد کو اپنی کہانی سُنائی۔ اس کے والدین کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کا باپ ہیروئن کا نشہ کرتا تھا ماں سلائی کرکے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ ایک دن اس کے باپ کا حادثے میں انتقال ہوگیا۔ اس کے چھ ماہ بعد فراز کی ماں بھی چل بسی۔ فراز نے ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔ ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی۔ پھر اُس نے انکشاف کیا کہ اُس کی بہن عظمت جیل میں ہے۔ کیونکہ اُس نے بھاری جہیز کے مطالبے پر غصّے میں آکر اپنے منگیتر کے منہ پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ جبکہ اس کا چھوٹا بھائی ندیم پاگل خانے میں ہے۔ یہ سُن کر سرمد حیران رہ گیا۔ اب کہانی کے سنسنی خیز لمحات ملاحظہ کیجیے۔

"ندیم پاگل خانے میں ہے ...؟" میں تقریباً چیخ پڑا۔

"وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ حسّاس ہے، ابّو، امّی کی موت اور عظمت کے مرکزِ اصلاح چلے جانے کے پے درپے واقعات نے اس کا ذہنی توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔" فراز نے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُف میرے خدایا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اور تمہیں معلوم ہے یہ سب کچھ ... یہ سب کچھ جیب کے خالی ہونے کے باعث ہُوا۔ اگر ہماری جیب کچھ بھاری ہوتی تو شاید امّی کو بچا لیا جاتا۔ شاید عظمت کا جہیز بن جاتا... شائد..."

فراز کی آواز رندھ گئی۔ اور اُس کے ہونٹ شدّتِ جذبات سے لرزنے لگے۔

فراز کو پیش آنے والے واقعات مجھے کسی فارمولا فلم کی طرح محسوس ہورہے تھے۔ ایسی فلم کی طرح جس میں ہیرو بچپن سے جوانی تک ہر وقت کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ فارمولا فلم کے مثالی ہیرو اور فراز میں صرف ایک فرق تھا فلم کا ہیرو ہر مشکل سے سرخرو نکلتا ہے، جبکہ فراز کو پیش آنے والی تمام مشکلیں ابھی تک فراز کے دل ودماغ میں زہر گھول رہی تھیں۔ ہر مشکل، ہر حادثہ فراز کے ساتھ تھا، اُس کے سائے کی طرح، اُس کے ازلی وابدی دشمن کی طرح۔ مجھے حیرت تھی کہ فراز ان حالات کے باوجود اب تک کس طرح زندہ رہا؟

"تم یہی سوچ رہے ہو نا کہ میں اب تک کس طرح زندہ ہوں؟" فراز نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

مجھے فراز کے اس سوال پر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آدمی میں حسّاسیت جب ایک حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو اُس میں لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی صلاحیت عام طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھے" میں نے فراز کے سوال کے جواب میں کہا۔

"میں قوت حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس معاشرے کو اس کی اوقات بتا سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ... صرف ایک مرتبہ دُنیا کے منہ پر تھوک سکوں، اس طرح کہ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دنیا میرے لیے ایک فٹبال کی طرح ہے، ایسی فٹبال کی طرح جس کو ٹھوکر مارنے کے لیے لوہے کے پیروں کی ضرورت ہے، میں اپنے پیروں کو لوہے کا بنانا چاہتا ہوں۔ میں اسی لیے دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس اکیسویں صدی کے معاشرے میں بھی قوت صرف اور صرف دولت سے حاصل ہوتی ہے۔ بس اسی لیے میں اب تک زندہ ہوں۔ میری یہ خواہش پوری ہو جائے تو پھر میں مسکراتے ہوئے آسانی کے ساتھ مر سکوں گا، مجھے زندگی سے اس خواہش کی تکمیل کے سوا اور کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں فراز سے اسی قسم کی گفتگو کی امید کر رہا تھا، اس لیے مجھے اس کی باتیں بالکل بھی عجیب نہیں لگیں۔

"بولو...! کیا اب تم میرے منصوبے میں میرے شریک بننے کے لیے تیار ہو؟" فراز نے امید بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"یہ بتاؤ کہ آفس میں تمہاری کیا پوزیشن ہے... میرا مطلب ہے کہ تمہارے باس اور تمہارے ساتھ کام کرنے والے لوگ تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟"

میں نے فراز کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، میں دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ فراز کے اس مجموعی رویّے اور مزاج کے پیچھے اُس کے دفتری ماحول کا کتنا ہاتھ ہے۔

اپنے سوال کو نظر انداز ہوتا دیکھ کر فراز کے چہرے پر انتہائی ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے، لیکن اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا، وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ میں اپنے سوال کا جواب ملنے کا انتظار کرنے لگا...

"میرا دعویٰ ہے اور میں اسے سو طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ میں اپنے دفتر میں اپنے باس

سمیت سب سے زیادہ ذہین آدمی ہوں... لیکن میری حیثیت وہاں ایک عام ریسرچ آفیسر کی ہے۔ میرے بارے میں میرے ساتھیوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔ وہ مجھے "کھسکا" ہوا آدمی سمجھتے ہیں۔ ایسا کھسکا ہوا آدمی جسے کام کے علاوہ اور کوئی بات نہیں آتی۔ وہ اکثر میرے آفس ٹائم کے بعد تک کام کرنے پر میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ خاص طور پر ایک لڑکے نے جو میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے، میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ادارے کے اکثر تحقیقی منصوبے میں تیار کرتا ہوں، لیکن اُن کا سارا کریڈٹ باس لے جاتا ہے۔ اصولی طور پر مجھے اپنے باس کی جگہ ہونا چاہیے تھا۔ اور میرے باس کو میری جگہ، بلکہ شاید میری جگہ بھی نہیں۔ یہ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا ہوں۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں، لیکن تمھیں حق ہے کہ تم میری باتوں پر شک کرو، بلکہ تمھیں ایسا کرنے کا زیادہ حق ہے... آخر تم میرے دوست ہو... قریبی دوست۔"

آخری جملہ کہتے کہتے فراز کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

"نہیں مجھے تمہاری ایک ایک بات کا یقین ہے۔"

"تو پھر تم میرے ساتھ کام کرو گے؟" فراز نے پوچھا۔

"سوچنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"سوچنا دوچنا کچھ نہیں... ہاں یا نہ میں جواب دو، فوراً، ابھی... اسی وقت۔" فراز نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے... مجھے کچھ سوچنے کا موقعہ تو دو۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے ہر بوگس بات سے نفرت ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ بات بوگس ہوتی ہے۔ جو حقیقت جان لینے کے بعد بھی دو ٹوک ہو کر نہ کی جائے۔" فراز آہستہ آہستہ طیش میں آتا جا رہا تھا۔

"فراز یہ میرے اور میرے بیوی بچّوں کے مستقبل کا سوال ہے۔ تم جانتے ہو میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں نے زندگی میں کبھی اس طرح کی بے ایمانی نہیں کی۔"

"ہاں میں جانتا ہوں تم ایک شریف آدمی ہو۔ خوفناک حد تک شریف آدمی... دوسرے الفاظ میں ڈرپوک آدمی۔" فراز نے چوٹ کی۔

"دیکھو تم اس وقت غصّے میں ہو۔ اس لیے تمہیں میری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم کل آنا۔

یا مجھے اپنا پتہ دے دو۔ میں تمہارے گھر آجاؤں گا۔ اس دوران میں اس معاملے پر سوچ لوں گا۔ پھر جو فیصلہ ہوگا۔ اُس سے تمہیں آگاہ کر دُوں گا۔"

میں نے فراز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

فراز نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

"مجھے معلوم ہے کل بھی تمہارا جواب کیا ہوگا۔ تم کل پھر اصولوں کی پٹاری اٹھائے میرے گھر آؤ گے اور مجھے اچھائی اور بُرائی کا فرق سمجھاؤ گے۔ اس سے بہتر ہے کہ تم آج ہی صاف انکار کر دو... یہ زیادہ بہتر ہے سرمد۔" فراز جذباتی لہجے میں بولا۔

"اچھا تو یوں سمجھو کہ میں تمہارے اس کام میں تمہارا مددگار نہیں بن سکتا۔" گفتگو کی رو میں بہہ کر بے ساختہ یہ جملہ میرے منہ سے نکل گیا۔ جملہ کہتے ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوگیا، لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"یہ ہوئی نا بات امردوں والی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے بوگس گفتگو کو طویل نہیں کیا۔" فراز یہ کہہ کر گھر سے باہر جانے کے لیے مڑا۔

"کہاں جارہے ہو... ٹھہرو صبح ہوچکی ہے۔ ناشتہ کرکے جانا۔" میں نے آگے بڑھ کر اُسے روکا۔

"نہیں ڈیئر اب یہاں رُکنے کا کوئی فائدہ نہیں... اور پھر مجھے ذرا جلدی دفتر جانا ہے۔"

فراز کا لہجہ یکایک نرم ہوگیا تھا، لیکن اس کے چہرے پر مُردوں کی طرح کی سفیدی چھا گئی تھی، لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہوکر گر پڑے گا۔

"کچھ دیر تو ٹھہرو۔" میں نے درخواست کی۔

"نہیں میں اب واقعی چلوں گا۔ بس ایک درخواست ہے اگر ہوسکے تو، میرے اور میرے کام کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا مجھ پر... زندگی رہی تو انشاءاللہ پھر ملیں گے... خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر فراز دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی چال سے لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک ستر سال کا بوڑھا ہوگیا ہے۔ میں کئی منٹ تک دروازے پر بے حرکت کھڑا فراز کو جاتے دیکھتا رہا۔

فراز کے جانے کے کئی دن بعد تک میں فراز اور اُس کے کام کے بارے میں سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس صورتِ حال میں فراز کے بارے میں کیا رویّہ اختیار کروں۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ فراز کسی طرح اپنی زندگی کے تلخ تجربات کو فراموش کرکے اپنے کام کو منظرِ عام

بدلے آئے لیکن فراز سے موجودہ حالات میں اس موضوع پر مزید گفتگو مناسب نہ تھی، کیونکہ یہ فراز کے اندر مزید انتہا پسندی پیدا کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ میں واقعی فراز کے منصوبے میں شریک ہو کر اُس کی مدد کروں لیکن میرا یہ خیال زیادہ دیر تک میرے ذہن کو اپنی گرفت میں نہ رکھ پاتا، اور میں پھر فراز کی مدد کا کوئی اور طریقہ سوچنے لگ جاتا۔ کئی دن کے مسلسل غور و فکر کے بعد میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔

" اگر فراز کی بڑی بہن سے مل کر اُسے تمام حالات بتا دیے جائیں تو ممکن ہے وہ فراز سے بات کر کے اُسے راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو جائے "

مجھے فراز کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنی بہن سے بہت پیار کرتا ہے۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ شاید اُس کے کہنے سننے کا کچھ اثر ہو اور فراز غلط رستے پر چلنے سے خود کو باز رکھ سکے۔ میں مرکزِ اصلاح جانے کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہُوا۔

خواتین کا مرکزِ اصلاح میرے گھر سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے اپنی کار نکالی اور مرکزِ اصلاح جا پہنچا۔ اُس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے اور قیدیوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ عظمت سے ملاقات کے لیے مجھے مرکزِ اصلاح کے نگران کی خاصی خوشامد کرنی پڑی۔ وہ کسی بھی قیمت پر عظمت سے میری ملاقات کرانے پر تیار نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے اُسے اپنے ادارے کا شناختی کارڈ دکھایا تو اُس نے ہکلاتے ہوئے مجھے عظمت سے ملنے کی اجازت دے دی۔

عظمت مجھے دیکھتے ہی پہچان گئی اور دوپٹے سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

عظمت کو دیکھ کر مجھے شدید دُکھ ہُوا۔ اُس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ جسمانی طور پر وہ انتہائی کمزور نظر آ رہی تھی۔ میں نے اُسے دلاسہ دیا اور پھر اُسے فراز کے بارے میں مختصراً ساری باتیں بتا دیں۔ میں خاموش ہو کر اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

" ٹھیک ہے میں بھیا کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ آج منگل ہے۔ بھیا ہر جمعہ کو مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ اس جمعہ کو وہ آئیں گے تو میں اُن سے بات کروں گی۔ لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ وہ میری بات مان جائیں گے۔" عظمت نے نظریں جُھکاتے ہوئے کہا۔

"آپ کوشش کر دیکھیں... شاید وہ مان جائے " میں نے عظمت سے کہا اور اُس سے ہفتے کے روز آنے کا کہہ کر گھر واپس آگیا۔

اگلے روز میں صبح سات بجے دفتر جانے کے لیے اُٹھا۔ ناشتے کی میز پر بیٹھ کر میں اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یکایک میری نظر ایک خبر پر پڑی تو چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے چھُوٹ کر میز پر گر پڑی۔ اخبار کے صفحۂ اوّل پر دو کالم میں شائع ہونے والی خبر کی سُرخی تھی۔

"ڈیفنس لیبارٹری کے ریسرچ افسر کا اغوار۔"

خبر کی تفصیلات کے مطابق ڈیفنس لیبارٹری میں کام کرنے والے ایک ریسرچ آفیسر عابد نسیم کو چار مسلح نقاب پوش افراد نے اُس وقت اغوا کر لیا جب وہ شام گئے دفتر سے گھر لوٹ رہا تھا۔ خبر کے مطابق پولیس ابھی تک اُسے اور اغوار کرنے والوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ تاہم پولیس حسبِ عادت سرگرمی سے اغوار ہونے والے اور اغوا کرنے والے مجرموں کو تلاش کرنے میں مصروف تھی۔۔۔

خبر ختم ہوئی تو میرا پُورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور میرے ذہن میں صرف ایک نام بار بار گونج رہا تھا۔ فراز۔۔۔ فراز۔۔۔ فراز۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ حرکت یقیناً فراز نے کی ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اُسے اس لڑکے کو اغوار کرنے سے کیا حاصل ہو جائے گا۔ کیا یہ ایک انتقامی کاروائی ہے؟ لیکن ایسا کرنے سے تو فراز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ کہیں فراز اُس کو ہلاک ہی نہ کر دے۔ خدا کرے یہ کام فراز نے نہ کیا ہو۔ اگر کیا ہو تو وہ خود کسی نقصان سے محفوظ رہے۔ میرے دل میں رہ رہ کر عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے۔ میں تقریباً سکتے کے عالم میں تھا۔ میری بیوی نے مجھے اس حالت میں بیٹھے دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ میز پر گری ہوئی چائے دیکھ کر تو اُس کے ہوش ہی اُڑ گئے وہ سمجھی کہ مجھے دل کی تکلیف شروع ہو گئی ہے۔ میں ایک عرصے سے انجائنا کا مریض تھا۔ اُس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا تمہیں۔۔۔ سرمد؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"پھر اس طرح کیوں بیٹھے ہو۔"

"وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ ڈیفنس لیبارٹری کا ایک افسر اغوا کر لیا گیا ہے۔" میرے منہ سے یکایک نکلا۔

"تو۔۔۔؟"

"تو۔۔ تو۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔"

مجھے یکایک اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی میرے گھر کی کال بیل بج اُٹھی۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"فراز" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میری بیوی نے مجھے حیرانگی سے دیکھا۔ میں نے ایک لمحہ انتظار کیے بغیر دوڑ کر دروازہ کھولا۔ تو فراز کو اپنے سامنے کھڑا پایا وہ مُسکرا رہا تھا۔

"کیا میں اندر آجاؤں؟" فراز نے مجھے پریشانی کے عالم میں خاموش کھڑے دیکھ کر کہا۔

"آؤ... آؤ..."

میں فراز کو لے کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ اور بے چینی سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس طرح جیسے مجھے پہلے سے معلوم ہو کہ وہ مجھے اس خبر سے متعلق کوئی اہم بات بتانے آیا ہے۔

"لگتا ہے تم نے خبر پڑھ لی ہے" فراز نے میری بے چینی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اتفاقاً آج چائے پیتے وقت میں نے اخبار دیکھا تو..."

"اچھا ہُوا میں اب تمہیں تفصیلات بتانے کی زحمت سے بچ گیا" فراز نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی تم نے ہی اس لڑکے کو اغوا کیا ہے؟"

"ہاں..."

"مگر کیوں؟"

"بس یونہی۔ دِل چاہا"

"کیا بکواس ہے... دِل چاہا تو اغوا کر لیا"

"تمہیں کیا پریشانی ہے" فراز جُزبُز ہوتے ہوئے بولا۔

"مجھے... مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ وہ لڑکا ہے کہاں؟"

شہر کے باہر زیرِ تعمیر فلیٹوں کے پاس پڑا ہے بے ہوش... وہ مکمل طور پر اپنی یادداشت کھو چکا ہے"

"کیا؟" میں تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں بھئی میں اُسے دو گھنٹے تک ایٹمی سرچشمے میں نہلاتا رہا اور وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ فراز نے اتنے آرام سے کہا جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔

چیونٹی اور جھینگر

شکیل فاروقی

کہیں ایک جنگل میں ننھی چیونٹی
بہت دُور اندیش و دانا جو تھی

کبھی وقت ضائع نہ کرتی تھی وہ
مصیبت سے ہرگز نہ ڈرتی تھی وہ

پڑوسی کوئی اُس کا جھینگر بھی تھا
تھا جو گانا گانے کا رسیا بڑا

یونہی وقت گا کر گنواتا تھا وہ
سدا کام سے جی چراتا تھا وہ

وہ موسم میں گرما کے گاتا رہا
یونہی وقت اپنا گنواتا رہا

اسی طرح سردی کے دن آگئے
کہ بس برفباری کے دن آگئے

کسی شے کا بھی تھا نہ نام و نشاں
فقط برف ہی برف تھی یاں سے واں

ادھر جھینگر حضرت کا یہ حال تھا
کہ کھانے کا گھر میں پڑا کال تھا

بہت ہی زیادہ پریشاں تھا وہ
کہ مرنے کے ڈر سے ہراساں تھا وہ

سمجھ میں نہ جب کوئی حل آسکا
تو بی چیونٹی کے یہاں وہ گیا

کہا "رحم اے بہن کچھ کھلایئے
ہمیں کچھ تو کھانے کو دلوایئے

رہے گا یہ مجھ پر تمہارا اُدھار
بہت جلد دوں گا یہ قرضہ اُتار

اگر رحم مجھ پر نہ کھاؤ گی تم
تو بس مجھ کو مُردہ ہی پاؤ گی تم"

دیا چیونٹی نے یہ سن کر جواب
"میں اک بات کہتی ہوں سُن لیں جناب

پڑوسی بھی ہیں آپ اور دوست بھی
یہ ناچیز ہے خادمہ آپ کی

مگر چیونٹیوں کا یہ دستور ہے
کہ ہر چیونٹی جس سے مجبور ہے

کبھی بھول کر بھی نہ مانگیں گے ہم
کوئی ہم سے مانگے تو دیں گے نہ ہم

مگر اتنی زحمت تو فرمایئے
عزیزم ذرا یہ تو بتلایئے

وہ گرما کے دن آپ نے کیا کیے
جو کھانے کو جمع نہ کچھ کر سکے"

ندامت سے جھینگر نے اتنا کہا
"شب و روز گا کر بِتاتا رہا"

کہا چیونٹی نے کہ "گاتے رہے
مزے سے یوں ہی دن بِتاتے رہے

بس اب آپ تشریف لے جایئے
اور اپنے کیے کی سزا پایئے"

اگر وقت اپنا گنوائیں گے آپ
نتیجہ بُرا اُس کا پائیں گے آپ

(ماخوذ)

بے درد مسیحا جس نے اینٹی سیپٹک ایجاد کیا

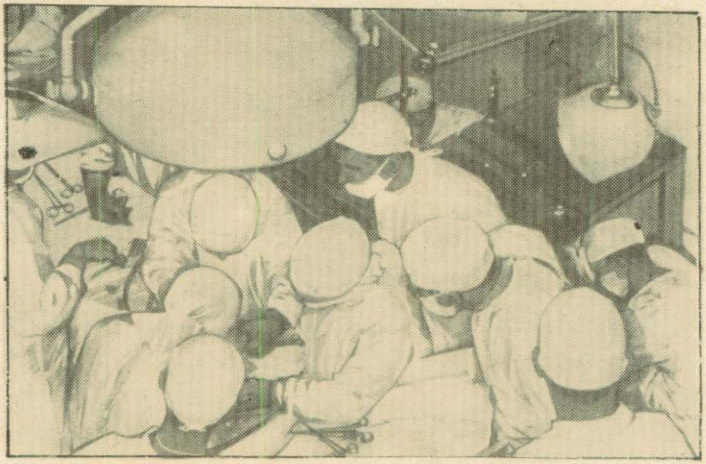

جب کبھی بچوں کو کھیل کُود کے دوران چوٹ لگ جاتی ہے اور خون نکل آتا ہے تو اُن کی امی کہتی ہیں "فوراً زخم پر اینٹی سیپٹک لگاؤ ورنہ یہ پک جائے گا" اور بچے جلدی سے دوا لگا لیتے ہیں جو کبھی لال رنگ کی ہوتی ہے اور کبھی پوڈر جیسی، کبھی آپ نے سوچا یہ اینٹی سیپٹک کیا بلا ہے۔ جو ہر وقت ہر گھر میں موجود رہتی ہے۔

آج ہم آپ کو اس دوا کی دریافت کی کہانی سُنا رہے ہیں۔ یہ سچی کہانی ایک ڈاکٹر جوزف لسٹر JOSEPH LISTER کی ہے۔ جو گلاسگو کے ایک اسپتال میں سرجن تھا۔ ۳۰ سالہ جوزف انتہائی نرم دل اور انسانوں سے محبت کرنے والا آدمی تھا۔ اس سے مریضوں کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسپتال آنے والے تمام مریض صحت مند ہو کر گھر جائیں۔

لیکن بدقسمتی سے آپریشن کے لیے آنے والے زیادہ تر مریض یا تو آپریشن کے دوران ہی مَر جاتے۔ یا پھر دو تین دن بعد مَر جاتے اور یوں آپریشن کے لیے آنے والے دس میں سے آٹھ مریض موت

کے منہ میں چلے جاتے تھے حتیٰ کہ جن کا چھوٹا سا زخم ہوتا تھا وہ بھی تین چار روز میں پک کر سارے جسم میں زہر پھیلا دیتا تھا۔

اس وقت یہ بات کوئی نہ جانتا تھا کہ یہ کیوں ہوتا ہے اور اس کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ جوزف نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرے گا۔ یہ ۱۸۶۵ء کی بات ہے کہ ایک روز اس کا دوست جوزف سے ملنے آیا۔ اور اُسے بتایا کہ جس مسئلے پر تم کام کر رہے ہو اس پر ایک سائنس دان لوئس پیسچر LOUIS PASTURE نے کچھ کام کیا ہے، تم اُس کے کاغذات وغیرہ دیکھو، شاید کچھ معلوم ہو جائے، جوزف نے وہ کاغذات پڑھے۔ اُن میں لکھا تھا کہ، ہماری اردگرد کی فضا میں ہر وقت ننھے ننھے جراثیم موجود ہوتے ہیں جو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ آنکھ سے نظر نہیں آتے اور یہ جراثیم گندگی میں پرورش پاتے ہیں، جب اُنہیں کوئی زخم کھُلا نظر آتا ہے یہ اس میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے زخم سڑ جاتا ہے اور زہر سارے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ یہ سب پڑھنے کے بعد جوزف کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہی جراثیم موت کی وجہ ہیں۔

یہ معلوم ہونے کے بعد جوزف ایک ایسی دوا کی تلاش میں لگ گیا جو ان جراثیم کو مار سکے، کئی ہفتوں کی تلاش کے بعد اُسے ایک طریقہ سمجھ میں آیا۔ شہر کے کوڑے دانوں کی صفائی اور جراثیم کو مارنے کے لیے کاربولک ایسڈ CARBOLIC ACID اور کریوسوٹ CREOSOTE استعمال ہوتا تھا۔

کریوسوٹ ایک محلول ہوتا ہے جو درختوں کی لکڑیوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور آج بھی اینٹی سیپٹک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

جوزف نے اس کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے ایک جگہ سے تھوڑا سا کریوسوٹ حاصل کیا اور اپنے ایک مریض پر استعمال کیا لیکن بدقسمتی سے مریض مر گیا۔

اس واقعے پر جوزف کو بہت افسوس ہوا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اس طریقہ کو پھر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

۵ ماہ کے بعد یعنی ۱۲ اگست کو اس کے اسپتال میں ایک بارہ سالہ لڑکے کو لایا گیا جس کی داہنی ٹانگ پر سے گاڑی کا پہیہ گزر گیا تھا۔ اور زخم ہو جانے کی وجہ سے خون بہہ رہا تھا۔ جوزف نے فوراً زخم کی صفائی وغیرہ کر کے اس پر کاربولک ایسڈ میں ڈوبی ہوئی پٹی لپیٹ دی۔

تین دن بعد جوزف نے ڈرتے ڈرتے پٹی کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ زخم بجائے خراب ہونے کے ٹھیک ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اب تو جوزف کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

اُس نے یہ بات دوسروں کو بھی بتائی، لیکن سب نے اس کا مذاق اُڑایا لیکن جوزف نے ہمت نہ ہاری اور اپنے نظریے پر قائم رہا۔

اب جوزف نے اپنے اسپتال میں استعمال ہونے والی تمام چیزوں کو صاف ستھرا کرانا شروع کر دیا۔ آپریشن سے پہلے وہ تمام اوزار وغیرہ اچھی طرح صاف کراتا، اس کے علاوہ وہ آپریشن کے دوران ہاتھ اچھی طرح دھوتا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اس کے وارڈ میں ہونے والے زیادہ تر آپریشن کامیاب ہوتے تھے۔

لیکن ننھے جراثیم کے خلاف یہ جنگ وہ اکیلا لڑ رہا تھا۔ اس کا ساتھی اُس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ بلکہ اُس کو پاگل اور بے وقوف کے نام سے پُکارتے تھے۔

ایک بار اس کو کنگ کالج لندن میں میڈیکل کے طلبہ کو لیکچر دینے کے لیے بلایا گیا۔ لیکچر میں اُس نے بتایا کہ ہماری ہوا میں بہت سے جراثیم ہر وقت موجود رہتے ہیں جو کھلے زخم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

یہ بات سُن کر سب لڑکے ہنسنے لگے اور شور مچانے لگے، کسی نے ہال کا دروازہ باہر جانے کے لیے کھولا تو ایک لڑکا چلّایا۔ "جلدی سے دروازہ بند کر دو ورنہ ڈاکٹر صاحب کے جراثیم اندر آجائیں۔" غرض کہ جوزف کا خوب ہی مذاق اُڑایا گیا۔ لیکن جوزف نے ہار نہ مانی۔ وہ جانتا تھا کہ ہر اچھی بات کہنے والے کو لوگ پاگل کہتے ہیں۔ کیوں کہ جو لوگ خود کچھ نہیں کر پاتے وہ دوسروں کو کچھ کرتے دیکھ کر اُس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

اخباروں میں اس کو پاگل لکھا جانے لگا۔ اور اس کے کامیاب آپریشنوں کو محض اتفاق کہا جانے لگا۔ اب تو اس کی نرسوں نے بھی اُس کا حُکم ماننے سے انکار کر دیا، لیکن جوزف لسٹر نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔

اُس کا سب سے بڑا مخالف ایک ڈاکٹر جان وڈ JOHN WOOD تھا جو اس کو سب جگہ پاگل اور خطرناک کہا کرتا تھا۔

یہ ۱۸۶۷ء کی بات ہے کہ ایک دن جان وڈ کے وارڈ میں ایک مریض آیا، مریض بہت زخمی تھا۔ جان اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس کا آپریشن کرنے سے انکار کر دیا۔

لیکن جوزف لسٹر نے اس کا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جان وڈ نے ہامی بھر لی اس خیال سے کہ یہ مریض تو مَر ہی جائے گا، اس طرح جوزف کی بے وقوفی ثابت ہو جائے گی۔

جوزف نے اس کا آپریشن کیا اور پٹی وغیرہ باندھ دی۔ پانچ دن بعد جب جوزف اُس کی پٹی کھول رہا تھا تو جان وڈ بھی وہاں آ گیا تاکہ وہ مَرتے ہوئے مریض کو دیکھ سکے۔

لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا مریض ٹھیک ٹھاک تھا اور پٹی کھلنے کے بعد تو وہ حیرت زدہ رہ گیا جب اُس نے دیکھا کہ زخم بجائے خراب ہونے کے ٹھیک ہو رہا ہے۔

اب تو جان وڈ بھی جوزف لسٹر کی بات مان گیا اور اُس سے کہا کہ اب جب بھی میں آپریشن کروں تم میرے ساتھ رہنا اور مجھے اپنا طریقۂ کار سکھاؤ۔

اور اس کے بعد تو دونوں نے مل کر خوب آپریشن کیے جو زیادہ تر کامیاب رہے تھے۔

جوزف لسٹر کو آج بھی جدید سرجری کا بانی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ نہ صرف اُس نے یہ دوا دریافت کی بلکہ لوگوں کے دلوں سے آپریشن کا خوف بھی دُور کیا۔

باقی زندگی جوزف نے اپنے آپریشن کے طریقۂ کار کو مزید ترقی دینے اور بہتر بنانے میں گزارے، اس نے برٹش انسٹی ٹیوٹ آف پری وینٹو میڈیسن BRITISH INSTITUTE OF MEDICINE بنانے میں بھی بہت کام کیا۔

اس طرح سے جوزف لسٹر نے لاکھوں زندگیوں کو بچانے کی دوا دریافت کی، صرف اور صرف اپنی محنت، لگن اور سچے جذبے کی مدد سے، کیونکہ جب محنت اور جذبہ مل جاتے ہیں تو کوئی چیز ناممکن نہیں رہ جاتی ہے۔

پرندوں میں کبوتر وہ واحد پرندہ ہے جو پانی کو اپنے سانس کے ساتھ کھینچ کر ایک ہی دفعہ میں پیٹ تک لے جاتا ہے جبکہ بقیہ پرندے پانی منہ میں بھرنے کے بعد منہ اُوپر اُٹھا کر پانی پیٹ تک لے جاتے ہیں۔

امتحان

صبا سلیم

جمال جسے پیار سے سب جمی کہتے تھے۔ بہت ذہین اور اچھا بچہ تھا۔ وہ اپنے والدین کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جس کا نام مریم تھا۔ جمی کے ابو ڈاکٹر تھے۔ اُس کے ابو کی خواہش تھی کہ جمی بھی بڑا ہو کر اُن کی طرح ڈاکٹر بنے۔ جمی تھا تو بہت ذہین، مگر اُس کا دِل سائنس پڑھنے میں ذرا بھی نہ لگتا تھا۔ جمی کو پیار تھا تو بس ڈرائنگ سے۔ وہ ہر وقت کاغذوں پر طرح طرح کی تصاویر بناتا رہتا۔ تصویروں سے اپنی اسی دلچسپی کے باعث وہ اپنے ہم جولیوں میں "مصور بھائی" کے نام سے مشہور تھا۔ جمی کے ابو اور امی جمی سے اکثر تصویریں بنانے پر ناراض رہتے۔ وہ ہر روز جمی کو اپنے نصاب پہ دھیان دینے کے لیے کہتے۔ پھر ایک دن جمی کے ابو دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح بہت سا روپیہ کمانے کی غرض سے سعودی عرب

میں ملازمت کے لیے چلے گئے۔ اب تو جمی اور بھی زیادہ تصاویر بنانے پر توجہ دینے لگا۔ جمی کی امی اور بھی پریشان رہنے لگیں۔ دن بیتتے گئے۔ اور یونہی دو برس گزر گئے۔ جمی کی ڈرائنگ اب اتنی شاندار ہوگئی تھی کہ اُس کے اساتذہ تک اُس کی تصاویر دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ "یہ بچہ ضرور بڑا مصور بنے گا!" اُس کے اُستاد اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہتے۔

اب جمی نے تصاویر کے مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، بلکہ حصہ لینا کیا اُس نے مقابلوں پر مقابلے جیتنے شروع کر دیے تھے۔ جمی کی امی اب تو اور بھی زیادہ پریشان رہنے لگی تھیں۔ کیونکہ جمی اب میٹرک کر کے انٹر کے پہلے سال میں داخل ہو چکا تھا۔ اُن کو ڈر تھا کہ جمی انٹر میں اتنے اچھے نمبر نہیں لا سکے گا کہ اُسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکے۔

"اے اللہ میرے جمی کو سمجھ دے... اے اللہ اس کے دل کو پڑھنے کی طرف مائل کر دے۔ اگر یہ ڈاکٹر نہ بنا تو اس کے ابو کو کتنا دُکھ ہوگا۔" جمی کی امی اکثر نماز پڑھ کر جمی کے لیے دعا مانگتیں۔ جمی کے ابو کو اب سعودی عرب گئے تین سال ہو چکے تھے۔ ان تین برسوں میں انہوں نے جمی کو درجنوں خط لکھے جن میں اُس کو نصیحت کی کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔ جمی، امی ابو کی باتوں پر توجہ دیتا تھا مگر وہ کیا کرتا اُس کا دل ہی پڑھائی میں نہ لگتا تھا۔ یوں ہی ایک برس اور بیت گیا۔

پھر ایک دن جمی کے گھر میں بہ یک وقت دو دھماکے ہوئے۔ اُس دن جمی کا انٹر کا رزلٹ بھی آیا اور اُسی دن ملک کے سب سے بڑے اخبار میں جمی کا ایک بڑا سا انٹرویو بھی شائع ہوا۔ جمی کے انٹر میں اتنے کم نمبر آئے تھے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ ناممکن تھا۔ امی نے رزلٹ دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب اُس کی بہن مریم پڑوسیوں کے گھر سے اُس روز کا وہ اخبار لے کر آئی، جس میں جمی کا طویل انٹرویو شائع ہوا تھا تو امی کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ اُن کا سولہ سال کا بیٹا اتنا اہم آدمی بن گیا ہے۔ اس وقت اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جمی کو ڈانٹیں یا پیار کریں۔ یا بہ یک وقت ڈانٹیں بھی اور پیار بھی کریں۔ جمی کا یہ انٹرویو دراصل جاپان میں منعقد ہونے والے تصویروں کے عالمی مقابلے کے سلسلے میں لیا گیا تھا۔ اس مقابلے میں جمی کی پینٹنگ کو پہلا انعام ملا تھا۔ جمی نے گھر کیا اپنے دوستوں کو بھی اس مقابلے میں شرکت کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بس اُس کے ایک

اُستاد کو یہ بات معلوم تھی ۔ جمی کی تصاویر کے بارے میں یہ بات بھی کسی کو معلوم نہ تھی کہ جمی کی تصاویر بازار میں فروخت ہونے لگی ہیں ۔اُس دن کے بعد جمی کے دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی دھڑادھڑ انٹرویو چھپنے لگے اور جمی مشہور ہوتا چلا گیا۔

اوپر بیان کیے گئے واقعہ کے چند روز بعد اچانک جمی کے ابّو سعودی عرب سے لوٹ آئے۔ اُس روز جمی خوش بھی تھا اور ڈرا ہوا بھی ۔ خوشی ابو کے لوٹ آنے کی تھی اور ڈر ابّو کی ڈانٹ کا تھا ۔ شام کو ابّو نے سب لوگوں کے تحفے نکال کر دینے شروع کیے ۔ جمی کے لیے ابو ایک پینٹنگ لائے تھے ۔ جو شاید انہوں نے کراچی ایئرپورٹ سے خریدی تھی ۔ جمی نے ڈرتے ڈرتے پینٹنگ لی ۔ وہیں کھڑے کھڑے جمی نے پینٹنگ کے اوپر چڑھا کاغذ ہٹایا تو چونک پڑا ۔ وہ پینٹنگ تو اُسی کی بنائی ہوئی تھی ۔ ابو نے جمی کو چونکتے دیکھا تو پوچھا ۔

"کیا ہوا جمی ... کیا پینٹنگ پسند نہیں آئی ؟"

"نہیں جی ... یہ بات نہیں ہے ... دراصل یہ میری اپنی بنائی پینٹنگ ہے ۔" جمی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ۔ ابو سمیت کمرے میں موجود سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے ۔ اسی دوران مریم نے اپنے بھائی جان کی فتوحات ابو کو سُنانا شروع کر دیں ۔ وہ جیسے موقع کی منتظر تھی ۔ ابو جیسے جیسے جمی کی کامیابیوں کے بارے میں سُنتے گئے ۔ ان کے چہرے کا رنگ ویسے ویسے بدلتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُنہیں لگا کہ اُن کے کانوں میں دو آوازیں گونج رہی ہیں ۔ مصور ... ڈاکٹر ... مصور ... ڈاکٹر، تھوڑی دیر بعد صرف ایک آواز باقی رہ گئی ۔مصور ... مصور، ابو کے چہرے پر اطمینان پھیلتا چلا گیا ۔ انہوں نے جمی کو پاس بٹھا کر پیار کیا، تبھی مریم نے ابّو کی لائی ہوئی پینٹنگ دیوار پر لگادی ۔ جمی کے تصور میں لال ،پیلے ،ہرے اور نہ جانے کیسے کیسے رنگ رقص کرنے لگے ۔

ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طوطا تحفے میں دیا اور کہا کہ اس کی دونوں ٹانگوں میں زنجیر بندھی ہے پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا کہ اگر تم دائیں ٹانگ کی زنجیر کھینچو گی تو یہ کہے گا "گڈ مارننگ میڈم" اور اگر تم بائیں ٹانگ کی زنجیر کھینچو گی تو یہ کہے گا "آپ کیسی ہیں میڈم" "اور اگر میں دونوں زنجیریں ایک ساتھ کھینچوں تو؟" بیوی نے پوچھا "میں گر جاؤں گا احمق" طوطے نے آواز لگائی ۔

سلیم احمد خان ۔ النور سوسائٹی ۔ کراچی

نئی زندگی

عمر نازل هنگورو

"ایک اور میت" فائرمین نادرخان نے شکایتی انداز میں کہا۔ "ہم اس مصنوعی واردات کی طرف جا رہے تھے کہ واقعی آگ لگ گئی۔ اس بار تو اس لڑکے نے کئی آدمیوں کو زندہ جلا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تم لوگ آخر اس بدمعاش کو پکڑ کیوں نہیں لیتے؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ ہم برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔" پولیس کانسٹیبل احمد شاہ نے جواب دیا۔ "مگر مجرم قابو میں ہی نہیں آتا۔ جھوٹی فون کالیں، فائر الارم کی چوری اور ٹیلی فون آلات کی توڑ پھوڑ۔ ہر بار لوگ یہی بتاتے ہیں کہ وہ ایک دراز قامت اور لمبے بالوں والا لڑکا تھا۔ آج کل سارے لڑکے ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں۔ ان ہزاروں لڑکوں میں آخر اسے کیسے پہچانا جا سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے، مگر میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں دوست! کہ اگر وہ کبھی ہم فائر اسٹیشن والوں میں سے کسی کے ہاتھ لگ گیا تو ہم اس کی وہ درگت بنائیں گے کہ آئندہ ہر قسم کی شرارت سے توبہ کر لے گا۔"

"میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔ اس بدمعاش کے لئے تو خاص طور پر میرا جی چاہتا ہے کہ ڈنڈے

سے اس کی ہڈی پسلی ایک کردوں اس نے میرا اور میرے ساتھیوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ لڑکا کیا ہے چھلاوہ ہے کم بخت۔"

حیات نے چوری کا مال دیا اور رقم جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا " مارفین بھی میرے پاس ہے کوئی خریدار ہو تو بتانا ....."

" مارفین کہاں سے اڑائی؟ ویسے یہ چیز تمہارے لئے نئی ہے، ہے نا؟"

" ہاں۔ چند روز پہلے میں بے ہوش بن کر ایک اسپتال کے سامنے گر گیا تو لوگ مجھے اٹھا کر اندر لے گئے۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ میرے سینے میں شدید تکلیف ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے مارفین دی اور دو روز تک اسپتال میں رکھا ان دورانوں میں میں نے اتنی دوا چرالی جو میرے لئے کئی روز تک کافی ہے"

" بہت خوب۔ آج رات کے لئے کیا پروگرام ہے۔؟ کیا پھر فون بکس توڑ کر ریزگاری اڑانے کا ارادہ ہے۔؟"

" نہیں پولیس ہر فون بکس کی نگرانی کر رہی ہے۔ ویسے بھی یہ کام بہت ہو چکا ہے۔ کیوں کہ انتظامیہ نے اب مضبوط قسم کے فون بکس نصب کر دیئے ہیں۔ آج رات میرا ارادہ کشن اولڈ پیپلز ہوم لوٹنے کا ہے وہاں مقیم بوڑھوں کے پاس جو تھوڑی بہت رقم ہوگی، وہ اڑالوں گا۔ ہر منزل پر میں آگ کی بوتلیں جلاؤں گا جن کی وجہ سے وہ بری طرح گھبرا جائیں گے۔ اور میرا کام آسان ہو جائے گا۔ اس عمارت کے فائر الارم میں نے تین ماہ پہلے ہی چرا کر کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے کونسل نے ان کی جگہ اب تک نئے فائر الارم نہیں لگائے۔ چنانچہ مجھے اب آگ بجھانے کے آلات پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ جو عمارت کی ہر منزل پر لگے ہوئے ہیں۔"

" اگر وہاں سچ مچ آگ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ آگ بجھانے کے آلے تو تم چرا چکے ہو؟"

" ہوگا کیا؟ وہاں چند بوڑھے اور فضول قسم کے آدمی ہی تو رہتے ہیں" حیات نے بے پروائی سے کندھے اچکا کے جواب دیا۔

" خطرناک معاملہ ہے۔ ایک ہفتے قبل ہی تم نے وہاں کے فون بکس توڑ کر رقم اڑائی تھی۔ میرے خیال میں تم نے بوڑھے کرم داد کا سر پھاڑ کر اسے سیڑھیوں سے پھینک دیا تھا؟ اس عمارت میں نہ تو فائر الارم ہیں، نہ آگ بجھانے کے آلات اور نہ ہی ٹیلی فون۔ اگر وہاں آگ لگ گئی تو عمارت بوڑھوں کے لئے موت کا پنجرہ ثابت ہوگی۔ وہ سب کے سب اتنے کمزور ہیں کہ بھاگ کر اپنی جانیں بھی نہیں بچا سکیں گے۔ دو چار تو یقیناً مر جائیں گے۔"

" مجھے بوڑھے کرم داد کی مرمت اس لئے کرنا پڑی تھی کہ میں نے ابھی فون بکس آدھا ہی کھولا تھا کہ وہ شور مچاتا ہوا آگیا۔ اچھا، اس مارفیا کو مت بھولنا..... اور ہاں! یہ بھی یاد رکھنا کہ ذرا مہنگی پڑے گی۔" ہاں یہ چیزیں مہنگی تھیں انہیں حاصل کرنے

کے لئے اسے بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ گزشتہ رات اسپتال کے دواؤں والے کمرے میں گھس گیا اور وہاں جتنی بھی بے ہوش کردینے والی دواؤں کی بوتلیں تھیں، انہیں آدھے سے زیادہ خالی کرکے ان بوتلوں کو دوبارہ پانی سے بھر دیا۔ ان دواؤں میں پانی کی ملاوٹ کا ان لوگوں کو اس وقت تک علم نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ انہیں کسی ایسے مریض پر استعمال نہ کرتے جسے آپریشن کے لئے بے ہوش کرنا ضروری ہو۔ حیات اس تصور ہی سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا کہ یہ دوائیں جب کسی مریض پر استعمال کی جائیں گی تو اس بے چارے کا کیا حشر ہوگا وہ لوگ شاید مریض کو آپریشن ٹیبل سے باندھ بھی لیتے ہیں پھر چاقو، سوئیوں اور آریوں سے اُسے کاٹنا، سینا اور زخم کو ٹٹولنا۔ اُف ...... ! بے ہوش ہونے کے بجائے جب مریض زیادہ ہی چلانے لگے گا تو وہ اسے ڈانٹیں گے، اس سے تنگ آجائیں گے۔ اور جلد کام ختم کرنے کے لئے تیزی سے چاقو چھری چلائیں گے۔ بڑا ہی بھیانک تصور تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پیروں کی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ مگر اس کا یہ کارنامہ بڑا ہی منفعت بخش تھا۔ ان دواؤں کے بدلے اُسے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی ملی تھی۔

اس نے یہ ترکیب اور بھی کئی اسپتالوں میں بڑی کامیابی سے آزمائی، بالکل اسی طرح، جیسے وہ وقفے وقفے سے بوڑھے لوگوں کے مسکن لوٹ لیا کرتا تھا۔

اسی رات جب وہ آگ بجھانے کا دوسرا آلہ چرا کر نیچے لے جارہا تھا تو اُس نے ایک دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ چونک کر دیکھا تو ایک عورت اُسے گھور رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ حیات کو اس عورت کے عقب میں ایک آدمی کا چہرہ نظر آیا۔ یہ آدمی بوڑھے کرم داد کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

"یہی ہے"۔۔ کرم داد اس کی طرف اشارہ کرکے چیخ پڑا۔ "اسی نے مجھے سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا۔"

حیات آگ بجھانے والا آلہ لہراتا ہوا اُن دونوں کو مارنے کے لئے بڑھا تو عورت کے ہاتھ میں کھولتا ہوا پیالہ، چھلک اٹھا اور حیات پر گرا۔ اس کے چہرے، گردن اور پیٹ پر آگ سی لگ گئی اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا تو گرم گرم رقیق سیال اس کے پیٹ سے ہوتا ہوا پیٹ میں اُتر گیا۔ حیات کو ایسا لگا جیسے اس کے پیٹ میں انگارے بھر گئے ہوں۔ چاروں طرف سے شور مچاتے اور بھاگتے ہوئے لوگ آئے اور حیات کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے جو شدّتِ درد سے پاگلوں کی طرح اپنی آنکھیں پونچھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی حالت بھی ایسی ہورہی تھی جیسے انہیں خوب بھُون دیا گیا ہو۔

" میں نے اپنے شوہر کے زخموں پر لگانے کے لئے اس پیالے میں تیل گرم کیا تھا"، بیگم کرم داد نے ایمبولینس آنے پر ان لوگوں کو بتایا "لیکن یہ لڑکا شکار ہوگیا"!

" اس کی سزا یہی ہونی چاہیئے تھی۔ کھولتا ہوا تیل بالکل ٹھیک سزا ملی ہے" کسی نے کہا۔

زخمی حیات اس کی صورت نہیں دیکھ سکا. کیوں کہ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا.

سرجنوں نے فوراً ہی آپریشن کی تیاری شروع کر دی مگر حیات کو یوں محسوس ہو رہا تھا. جیسے اس کرب ناک جہنم میں سلگتے ہوئے اسے صدیاں بیت گئی ہوں. سرجن آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے. حیات ان کی آوازیں سُن رہا تھا مگر الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے. جب وہ حیات کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اُسے آپریشن تھیٹر کے قریب لائے، تب بھی وہ درد اور خوف سے بری طرح چیخ رہا تھا.

"ہم اسے آپریشن تھیٹر میں لے جانے سے پہلے پیتھیڈین کا ایک انجکشن دیں گے." حیات نے قریب سے ایک آواز سنی پھر اندر لے جا کر اسے مارفین لگائیں گے. اسے مارفین کی ذرا بھاری ڈوز کی ضرورت ہوگی کیوں کہ یہ ایک میجر آپریشن ہے. علاوہ ازیں ہمیں اس کے جسم کی بہت سی کھال بھی اتارنا پڑے گی."

حیات کی چیخوں میں شدت آگئی وہ انہیں بتانا چاہتا تھا. کہ وہ جن دواؤں کے نام لے رہے ہیں، وہ ناکارہ ہو چکی ہیں مگر ہونٹ اور زبان بُری طرح جل جانے کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر رہا.

ہم اس کی رانوں سے کچھ گوشت بھی اتاریں گے تاکہ اس کی ناک اور گالوں کو درست کر سکیں مگر مجھے ڈر ہے کہ یہ ترکیب بھی کارآمد ثابت نہیں ہوگی. اس کی صورت بڑی بھیانک ہو جائے گی".

کسی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے تبصرہ کیا.

زخمی حیات جھرجھری لے کر رہ گیا. اس نے کہنے کے لئے ساری قوت صرف کر دی مگر محض بُڑبُڑا کر رہ گیا.

"بڑبڑایا ہے" کسی سرجن نے کہا "شاید دواؤں کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہا ہے. کیا یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم دوائیں استعمال کرنا نہیں جانتے شاید یہ بے ہوش کرنے والی دواؤں سے خوف زدہ ہے. کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں. اگر ہم اچھی طرح بے ہوش نہ کر سکے تو اس کے آئندہ تین گھنٹے انتہائی اذیت میں گزریں گے، اس کا چہرہ کسی بھوت کے چہرے کی طرح خوفناک نظر آئے گا. گرم گرم تیل نے اس کے معدے میں جا کر بڑی خرابی پیدا کر دی ہے. یہ پہلے جیسا نوجوان ہرگز نہیں رہے گا."

"ٹھیک کہتے ہو". دوسری آواز نے کہا." اس کا چہرہ عجیب وغریب ہو جائے گا. بڑی آسانی سے ہزاروں کے ہجوم میں بھی پہچان لیا جائے گا."

دفعتاً حیات نے اپنے جسم میں سوئی اترتی ہوئی محسوس کی مگر اس کے درد میں ذرا کمی نہیں آئی. آ بھی کیسے سکتی تھی خود اسی نے تو ان دواؤں میں پانی ملایا تھا جس کی وجہ سے ان کی تاثیر ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی. ماضی کا وہ کارنامہ جو پہلے بے حد شاندار نظر آتا تھا، اب کتنا اذیت ناک ہو گیا تھا. اس کی ٹرالی دھکیل کر اندر پہنچا دی گئی. حیات جانتا

تھا کہ اب قیامت کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

نہ جانے کتنا عرصہ گزر گیا تھا۔

حیات نے خود کو بستر پر دراز محسوس کیا اس کا سارا بدن کسی حنوط شدہ لاش کی طرح جکڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے چہرے اور آنکھوں کو چھونے کے لئے ہاتھوں کو حرکت دینی چاہی مگر یہ محسوس کر کے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ بھی پٹیوں میں بُری طرح لپٹے ہوئے تھے۔ مُعاً دو مضبوط ہاتھوں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ کمبل کے نیچے دبا دیئے۔

"سیدھے لیٹے رہو" کسی نے بھاری آواز میں حکم دیا۔" میں کانسٹیبل احمد شاہ ہوں۔ جب تک تم سپرنٹنڈنٹ کو بیان دینے کے قابل نہیں ہو جاتے، میری ڈیوٹی تمہارے بستر کے قریب ہی رہے گی۔ پرواہ مت کرو، تمہاری خوب دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ نرس بیگم کرم داد اس کام پر مامور ہے۔ اسے فاضل وقت میں اپنے شوہر کی بھی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے اگر وہ تھکی ہوئی ہو یا تمہارے کام میں بے پروائی برتے تو کچھ خیال مت کرنا۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے اگر پٹیاں جلدی کھولی جائیں تو وہ کھال بھی ساتھ اتار لاتی ہیں۔ اچھا اب میں چلا۔ میں لوگوں کی دردناک چیخیں نہیں سُن سکتا۔ نرس بیگم کرم داد آ رہی ہے اس سے جھگڑنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کے ساتھ ایک تگڑا سا کمپاؤنڈر بھی ہے جو انجکشن لئے آ رہا ہے۔ اوہ، اس انجکشن کی سوئی تو کسی تلوار کی طرح تیز اور لمبی دکھائی دے رہی ہے۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔ اب رونے سے کیا فائدہ؟ جیسی کرنی ویسی بھرنی"

کانسٹیبل احمد شاہ راہ داری میں آ گیا۔ جہاں سفید کوٹ پہنے ایک ڈاکٹر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ان پٹیوں کے نیچے اس کے جسم کی حالت کیسی ہے ڈاکٹر؟" شاہ نے دریافت کیا۔

"وہ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ کیس زیادہ خراب نہیں ہے تیل اتنا گرم نہیں تھا۔ ہم نے بے ہوش کرنے والی دواؤں کی خرابی پہلے ہی معلوم کر لی تھی اس لئے انہیں بدل دیا گیا تھا ان بوتلوں پر اس لڑکے کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ سپرنٹنڈنٹ وہ بوتلیں اپنے ساتھ لے گیا تھا لہٰذا ہم نے لڑکے کو اصل دواؤں کے انجکشن دیئے اور اس کا علاج بھی معمول کے مطابق کیا.... لیکن سارا کام اس کے اعصاب اور مجرم ضمیر نے سرانجام دیا ہے۔ ہماری گفتگو محض اسے سنانے کے لئے تھی۔ صرف دو تین چھوٹے چھوٹے نشانات رہ جائیں گے اور وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ مٹ جائیں گے.... مگر تم کیوں ہنس رہے رہو؟"

"مجھے فائرمین نادر خان کی بات یاد کر کے ہنسی آ رہی ہے وہ لڑکے کا حلیہ بگاڑنا چاہتا تھا مگر بیگم کرم داد نے اسے زحمت سے بچالیا!"

زندگی کے میلے

"آصف! آصف! کیا کل شام کو میلہ دیکھنے نہیں چلو گے؟" خالد نے سائیکل سے اُترتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ ہاف آستین کی شرٹ اور سفید نیکر پہنے ہوئے تھا۔ وہ ہاکی کھیل کر آرہا تھا کیوں کہ سائیکل کے اسٹینڈ کے پیچھے اس کی گرین ہاکی رکھی ہوئی تھی۔

"دوست! دل تو میرا بہت چاہ رہا ہے میلہ دیکھنے کو لیکن کیا کروں میرے پاس میلہ دیکھنے کے لئے پیسے بالکل نہیں ہیں۔" آصف اُداس لہجے میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں کاپی اور قلم تھا۔ اس وقت وہ ٹیوشن پڑھ کر آرہا تھا

"تو پھر تم میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے؟" خالد نے آصف کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ہاں دوست! مجھے افسوس ہے کہ کل شام میں تمہارے ساتھ میلہ دیکھنے نہیں جاسکوں گا۔ آصف نے سر جھکا کر بُجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تو دوست اس میں دِل چھوٹا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم اپنے گھر والوں سے پیسے لے لینا" خالد نے

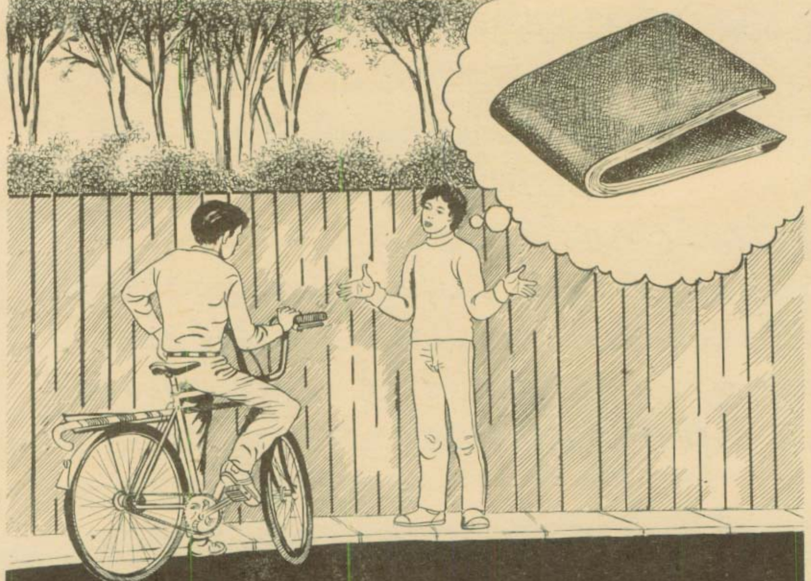

آصف کی ہمت بندھائی۔ "لیکن گھر والے پیسے نہیں دیں گے۔ آج کل میرا جیب خرچ بالکل بند ہے۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے، ششماہی امتحان میں کم نمبر لانے پر ابّا جان سخت خفا ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میری جیب خرچی اس وقت تک کے لیئے بند کر دی ہے۔ جب تک کہ میں سالانہ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل نہیں کر لیتا۔ اس وقت بھی میں آپا کے پاس سے ٹیوشن پڑھ کر آرہا ہوں۔"

"آصف نے افسردہ لہجے میں خالد کو بتایا۔"

"حیرت ہے اتنی سی بات پر تمہارے ابا جان نے تمہارا جیب خرچ بند کر دیا۔" خالد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر وہ آصف سے بولا: "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میلہ دیکھنے نہیں جا سکتے۔؟"

"ہاں دوست! مجبوری ہے!" آصف نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "ویسے تم ایک طریقے سے پیسے حاصل کر سکتے ہو!!" خالد نے آصف کو قریب منہ لے جاکر آہستگی سے کہا۔

"کون سا طریقہ؟" آصف نے حیرت سے پوچھا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ابا پیسوں والا بٹوا کہاں رکھتے ہیں؟" خالد نے بڑے رازدارانہ لہجے میں آصف سے کہا۔ "اپنی قمیض کی جیب میں"

آصف اتنا کہہ کر ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خالد سے پوچھا: "لیکن تم یہ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" "اس لئے کہ میں تمہیں میلے میں لے جانا چاہتا ہوں۔" خالد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن ابا کے بٹوے کا میلے سے کیا تعلق؟ آصف نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا "اماں یار تم بھی بڑے بھولے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم ابا جان کے بٹوے میں سے کچھ پیسے نکال لینا۔" خالد سرگوشی میں بولا۔ "نن..... نن..... نہیں! یہ تو چوری ہوئی میں یہ کام نہیں کر سکتا" آصف نے گھبرائے ہوئے لہجے میں گردن کو نفی کے انداز میں ادھر اُدھر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم یہ کام نہیں کر سکتے تو تمہاری مرضی۔ میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ تم اس طرح میلہ دیکھ سکو گے۔ ویسے اگر تم افریقہ کے سفید بندر، آسٹریلین طوطے اور ڈولفن مچھلی کے دلفریب کرتب نہیں دیکھنا چاہتے تو تمہاری مرضی۔ اچھا بھائی خدا حافظ! میں تو گھر چلا" خالد نے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آصف نے خالد کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خالد نے سائیکل چلا دی پھر اس نے گردن موڑتے ہوئے کہا: "میری بات اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو پھر میں کل شام کو تمہارا انتظار کروں گا۔" اتنا کہہ کر خالد سائیکل بھگاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آصف گھر آیا تو اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ دل کہتا تھا کہ خالد کی بات مان لو جبکہ دماغ کہتا ہے کہ نہیں یہ بُری عادت ہے اور چوری کرنا خود ایک بُرائی ہے۔ جو چوری کرتا ہے وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ ایک طرف میلے کی رنگ برنگ دلفریب چیزیں دیکھنے کا شوق یعنی دل کی یہ آواز کہ پیسے چوری کر کے میلہ دیکھا جائے

میلے کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوا جائے۔

رات بھر آصف کے دل و دماغ میں جنگ ہوتی رہی۔ بالآخر آصف کے اندر کی سچائی جیت گئی۔ اس نے اپنے امی ابا کے سامنے خالد کے ساتھ کی گئی ساری گفتگو دہرادی۔ جب وہ یہ باتیں بتا رہا تھا تو اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

"ابو! مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آئندہ خالد جیسے دوست نہیں بناؤں گا۔ اس نے مجھے بُری بات کی ترغیب دی۔ وہ میرا اچھا دوست نہیں ہے"

"ہے نا ابو!" آصف ابو کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے کہ خدا نے تمہاری آنکھیں کھول دیں۔ اور تم نے اچھے اور بُرے دوست کی پہچان کر لی" آصف کے ابو شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"ابو! آپ نے مجھے معاف کر دیا نا!"

"ہاں بیٹا! تم نے بہت سچائی سے ساری بات بتا کر مجھے خوش کر دیا ہے۔" اتنا کہہ کر ابو ایک لمحے کو خاموش ہوئے پھر دوسرے ہی لمحے وہ آصف کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

" دیکھو بیٹے! زندگی بھی ایک میلہ ہے۔ اس میلے میں نیکی اور بدی ایک دوسرے کے مقابل جنگ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کچھ لوگ نیکی کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ بدی کے ساتھ اس لئے جو ایک دفعہ اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے وہ اپنے خدا کو بھول جاتا ہے۔ دُنیا میں اپنے آنے کے مقصد کو فراموش کر دیتا ہے نتیجہ وہ بدی کا ساتھ دینے لگتا ہے۔ جب کہ نیکی کی راہ پر چلنے والے لوگوں کو بھی برائیوں سے بچاتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں ہر قسم کی مشکلات اور مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ خود بھی برائی سے بچا جائے اور دوسروں کو بھی برائی سے بچایا جائے۔

"ابو کے خاموش ہوتے ہی آصف مضبوط لہجے میں بولا۔

"ابو! میں نیکی کا ساتھ دوں گا۔ ابو! زندگی کے میلے میں سفر کرتے ہوئے میرا ہر قدم برائی سے بچتے اور دوسروں کو بچاتے ہوئے آگے بڑھے گا۔ میں حق کی روشنی اور سچائی کا اُجالا بنوں گا۔

"ابو... میں سب کو بُرے راستے پر چلنے سے بچاؤں گا ابو... خالد کو بھی..... اور..... سب کو ابو اور اپنے آپ کو بھی..... انشاءاللہ

نئے دن کا سورج چاروں طرف نئی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ ایسی ہی کرنیں آصف کے اندر سے بھی پھوٹ رہی تھیں۔ نئے جذبوں، نئی امنگوں، نئے حوصلوں اور ایک نئے عزم کے ساتھ۔

کھلاڑی کا دل

اسماء ہارون

وہ اپنے ملک کا مایہ ناز کپ اسٹار فٹ بالر تھا۔ لاکھوں شائقین محض اُس کا کھیل دیکھنے کے لئے گراں قیمت ٹکٹ خرید کر میچ دیکھتے۔ وُہ بلاشبہ ہزاروں لاکھوں کا محبوب کھلاڑی تھا۔ اُس کے مداحوں میں بچے بھی تھے اور جوان بھی۔ چھوٹے بڑے، سبھی اس کا شاندار کھیل دیکھنے کے لئے اسٹیڈیم پر ٹوٹ پڑتے تھے! ہفتوں پہلے ہی ٹکٹ بلیک میں فروخت ہونے لگتے۔

کھیل کے دوران جوں ہی گیند اُسے ملتی، تو۔ بس! ایسا معلوم ہوتا کہ فٹ بال جیسے اس کے پاؤں سے چمٹ سا گیا ہے! وہ مخالف ٹیم کے بڑے سے بڑے کھلاڑی کو خوب صورت "ڈاج" دے کر گیند کو لیۓ، برق رفتاری سے دوڑتا ہوا، مخالف ٹیم کی "ڈی" کے اندر پہنچ کر ہی دم لیتا، اور پھر۔ پلک جھپکتے ہیں، گول کیپر کو مخمصے میں ڈال کر، بڑی سُرعت سے، گیند کو گول میں پہنچا دیتا! لاکھوں تماش بین تالیاں بجاتے بجاتے نہ تھکتے! اُس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اُس کے کھیل کا صاف ستھرا، خوب صورت انداز تھا۔ اُس نے کبھی کسی مخالف کھلاڑی کو معمولی سا دھکا بھی نہیں دیا تھا!۔ حسد کے مارے، جیسا کہ اکثر کھلاڑی کر گزرتے ہیں، مخالف ٹیم کے کھلاڑی کو دانستہ جسمانی ایذا پہنچانے میں ذرا تامل نہیں کرتے..... موقع ملتے ہی کسی کے گھٹنے پر "کک" مار دی۔ یا گیند کو "ہیڈ" کرتے ہوئے کسی مخالف کو ٹکر مار کر اُسے زخمی کر دیا۔ یا "رَف" کھیل کر،..... اچھے بھلے کھیل کا ستیاناس کر دیا۔ یا طیش میں آکر، ریفری کو بُرا بھلا کہہ دیا۔

ان جیسے تمام حربوں سے پاؤلو کا کھیل بالکل پاک اور صاف ہوتا تھا۔ اور یہی ایک چیز اُسے فٹ بال کی دنیا میں ممتاز و منفرد رکھے ہوئے تھی۔ ہر ٹیم کی خواہش یہی ہوتی کہ کاش اسپین میچوں میں اس مرتبہ پاؤلو اُن کے کلب کی ٹیم کی جانب سے کھیلے واقعی پاؤلو بہت بڑا کھلاڑی تھا۔ بہت بڑا۔ "دی گریٹ"! اُسے ڈاک سے، روزانہ سینکڑوں خط وصول ہوتے، خطوں کے جواب دینے کے لیے، اس نے ایک پرسنل سیکرٹری رکھا ہوا تھا۔ جو ہر موصولہ خط کا، من موہنی عبارت سے مزین، دلچسپ انداز سے جواب لکھتا۔ اور پاؤلو، ہر خط کا جواب پڑھ کر اپنے دستخط ثبت کرتا۔ یہ پاؤلو کی "ہابی" تھی۔ صرف یہی ایک ہابی! جو اسے بہت عزیز تھی۔

پاؤلو کے خط بھیجنے والوں میں ایک تیرہ ۱۳ سالہ یوگوسلاوی لڑکا۔ میلوڈینکا زیٹ ویک۔ بڑی باقاعدگی سے خط لکھا کرتا تھا اسکا ہر خط پاؤلو کے کھیل کی تعریف و توصیف اور اس کی درازیٔ عمر کی دعاؤں سے بھرا ہوا ہوتا، خط کیا ہوتا تھا...... گویا معصوم جذبوں کا اُجلا اُجلا شفاف آئینہ ہوتا! پاؤلو بھی اس کے محبت بھرے خطوں کے جواب باقاعدگی سے دیتا۔ لیکن اچانک، اُدھر کچھ عرصے سے، ننھے معصوم مداح کے خط آنے بالکل بند ہو گئے! اِدھر پاؤلو بھی، کچھ فکرمند سا نظر آنے لگا تھا۔ گھر کے افراد، ماں، باپ، بھائی بہنیں۔ اور ملنے جلنے والے احباب، دوست، غرض سبھی اس کی فکرمندی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ ان کی باتوں کا کوئی تسلی بخش جواب دینے سے قاصر رہتا!

ایک دن، اُسے اپنے اندر خاص بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اور، اسی دن، شام کو پاؤلو نے میلوڈینکا کے رہائشی مقام کے قریب ایک مشہور فٹ بالر دوست کو فوراً تفصیلی ٹیلی گرام دیا جس میں میلوڈینکا سے متعلق مکمل تفصیلات جلد سے جلد بھیجنے کے لئے کہا گیا تھا!

تیسرے ہی دن، پاؤلو کو دوست کا ٹیلی گرام ملا، جس میں بتایا گیا تھا کہ میلوڈینکا دل کا مریض ہے اس کا ایک نازک آپریشن ہونا بہت ضروری ہے، جب کہ اس کے والدین، اس قابل نہیں ہیں کہ وہ آپریشن کے اخراجات برداشت کر سکیں۔

ٹیلی گرام پڑھتے ہی گویا پاؤلو کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔!

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانک لیا۔ اس کی خوب صورت نیل گول آنکھوں سے آنسو، رواں تھے! اچانک وہ تڑپ کر اٹھا..... یقیناً وہ کوئی اہم فیصلہ کر چکا تھا!

فضل خدا سے میلوڈینکا کا آپریشن کامیاب رہا، جس پر پچیس ۲۵ ہزار پونڈ اسٹرلنگ خرچ ہوئے۔ یہ تمام اخراجات پاؤلو نے برداشت کئے تھے۔

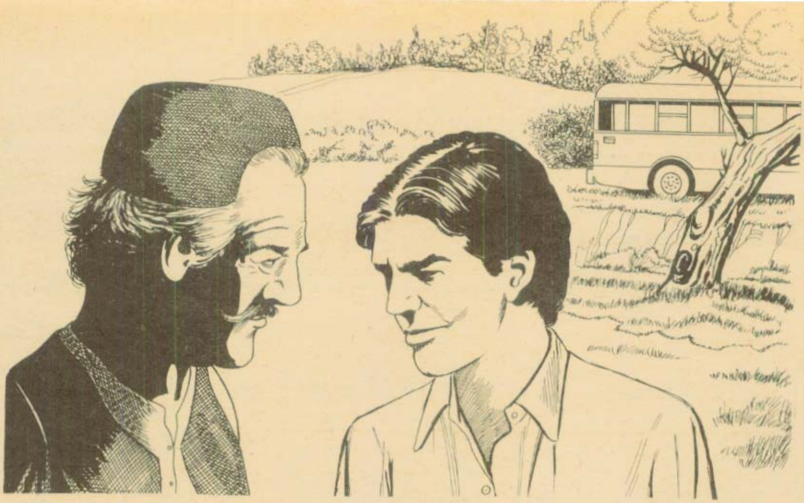

سبق آموز کہانی

انجامِ کار یہی ہونا تھا

شاہد علی سحر

"ڈبل ہے اُستاد، جانے دے۔ دیکھ پیچھے یارہ بیالیس آرہا ہے۔" میں نے بس کے آہنی دروازے کو زور زور سے پیٹتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایات جاری کیں۔ کنڈیکٹر کا اور کام ہی کیا ہے۔

"بھیا کیوں کان کے پردے پھاڑ رہے ہو۔" ایک دُبلے پتلے سے صاحب نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ "گاڑی کا شور ہی کیا کم ہے جو تم دروازہ بھی بجانے لگے۔"

"چُپ کر کے بیٹھو۔" میں نے گھور کر کہا۔ "بس میں بیٹھے ہو، کسی ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر رہے۔ ہاں اُستاد، کھینچ کر رکھ۔" میں بدستور دروازہ پیٹتا رہا۔ اور وہ صاحب خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

"ان سے کچھ کہنا تو بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر ہے۔" ایک ضعیف سے بزرگ نے تبصرہ کیا۔ "یہ کسی کی بات نہیں مانتے۔ ان کو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔"

میں نے گھور کر بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ "چُپ کر کے بیٹھے رہو۔ بڑے میاں، زیادہ لیکچر مت جھاڑو۔ میں تمھاری داڑھی کا لحاظ کر رہا ہوں... ورنہ..." میں نے دھمکی دی۔

"کیوں میاں، کیا اپنے باپ سے بھی اسی لہجے میں بات کرتے ہو۔" بڑے میاں نے میرے

تن بدن میں آگ لگا دی "ٹکٹ لے کے بیٹھے ہیں، کوئی مفت کا سفر نہیں کر رہے جو تم اتنی دھونس جما رہے ہو"

"بڑے میاں، ڈیڑھ روپے میں تم نے گاڑی نہیں خریدلی۔ اپنا ڈیڑھ روپیہ لو اور کسی دوسری بس میں بیٹھ جاؤ۔ لو چلو اپنا راستہ ناپو" میں نے ٹکٹ کے پیسے زبردستی اُن کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"میری ٹانگوں پر فالج کا اثر ہے" انہوں نے بڑے کرب سے کہا "اتنا بے درد نہ بن۔ تجھ پہ بھی کبھی بڑھاپا آئے گا"

اس کے بعد بڑے میاں کچھ نہ بولے۔ مجھے بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور میں اپنے ہی روٹ کی دوسری بس سے ریس لگانے کے لیے ڈرائیور کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔ دونوں بسوں کے درمیان آنکھ مچولی جاری تھی۔ دونوں ہی ڈرائیور بس کو اسٹاپ پر روکنے سے گریز کر رہے تھے۔ اور ہر اسٹاپ پر مسافر سخت احتجاج کے بعد اپنے اسٹاپ سے پچاس قدم دُور اُتارے جا رہے تھے۔ ڈرائیور ہر اسٹاپ کے قریب گاڑی کی رفتار کچھ کم کر دیتے اور مسافر چلتی گاڑی سے کُود کُود کر اپنی راہ لیتے تھے۔

"بیٹا، معذور آدمی ہوں" بفرزون کے اسٹاپ پر وہی بڑے میاں گڑگڑائے "دو منٹ کو گاڑی روک دینا"

"روک دے اُستاد، بُڈھا ہے" میں نے اپنا سارا غصہ بس کی چھت پر ہاتھ مار کر اُتارتے ہوئے کہا۔۔ "چلو بڑے میاں، جلدی سے اُتر جاؤ۔ بیٹھنے کے لیے تو بھاگ کر آتے ہو، اُترنے کے لیے ٹانگیں ٹوٹتی ہیں"

بڑے میاں آرام آرام سے اُتر رہے تھے اور اُن کی آہستگی دیکھ کر میں غصے سے آگ بگولہ ہُوا جا رہا تھا۔

"جانے دے اُستاد ڈبل ہے" بڑے میاں کے اُترتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی سارے مسافر مجھ پر لعن طعن کر رہے تھے مگر میں سب سے بے نیاز تھا۔

آج وہ بڑے میاں مجھے شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ شاید اس لیے کہ آج میں بھی ایک اپاہج بوڑھا ہوں اور بس اسٹاپ پر منہ کے بل پڑا ہوں۔

GEORG HERZOG
حارث شمیم

سوڈان کی کہانی

کلاسیکی کہانی

دُنیا کا طاقت ور ترین آدمی

کسی زمانے میں سوڈان میں کاسا نام کا ایک طاقت ور آدمی رہا کرتا تھا۔ "میں ایک طاقتور آدمی ہوں۔" وہ اکثر کہتا "اس دُنیا کا طاقتور ترین آدمی۔ میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔"

ایک دن کاسا اپنے دو دوستوں کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ ان دوستوں میں سے ایک کا نام اری تھا اور دوسرے کا کانگو۔ اری اور کانگو شکار کھیلنے کے لیے اپنے ساتھ بندوقیں لائے تھے مگر کاسا صرف ایک لوہے کے سریے کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ جنگل میں پہنچ کر اری اور کانگو بہت کوشش کے باوجود شکار نہ کر سکے۔ اس کے برعکس کاسا نے اپنے سریے کی مدد سے تھوڑی ہی دیر میں بیس ہرن شکار کر لیے اور اُن سب کو بیک وقت

اٹھا کر اُس جگہ آپہنچا جہاں اری اور کا نگو مایوسی کی حالت میں اُس کا انتظار کر رہے تھے۔
"یہ لو ہم سب کے کھانے کا بندوبست ہو گیا، مگر اب گوشت کو پکانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں کون لائے گا؟" کا سا نے ہرنوں کو اپنے دوستوں کے سامنے پٹخ کر کہا۔
اری اور کا نگو جنگل میں تنہا جانے سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ کا سا نے اری سے کہا۔
"تم یہاں رہ کر ہرنوں کی حفاظت کرو۔ میں اور کا نگو جنگل سے جا کر لکڑیاں لے کر آتے ہیں۔"
یہ کہہ کر کا سا اور کا نگو جنگل سے لکڑیاں لینے چلے گئے۔ اری مردہ ہرنوں کے پاس اکیلا رہ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ اری نے ایک بہت بڑے پرندے کو آسمان سے ہرنوں کے پاس اُترتے دیکھا۔ پرندے نے ہرنوں کے پاس بیٹھ کر اری سے کہا۔
"مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ بتاؤ کھانے کے لیے میں تمہیں لے جاؤں یا کسی ہرن کو؟"
اری پرندے کی بات سُن کر ڈر گیا اور بولا۔
"تم ہرن ہی کو لے جاؤ۔"
پرندہ اتنا سُنتے ہی ایک ہرن اُٹھا کر اُڑتا بنا۔ کا سا اور کا نگو جنگل سے لکڑیاں لے کر لوٹے تو اری نے اُن سے کہا۔
"جب تم لوگ جنگل گئے ہوئے تھے تو ایک بہت بڑا پرندہ آیا اور بولا میں بھوکا ہوں بتاؤ میں تمہیں لے جاؤں یا ہرن کو، میں نے کہا ہرن کو۔"
یہ سُنتے ہی کا سا غصّے سے بھر گیا اور بولا۔
"تمہیں کسی بھی صورت میں پرندے کو ہرن نہیں دینا چاہیے تھا۔ تم اُس سے کہتے کہ وہ تمہیں لے جائے۔"
اگلے روز کا سا نے کا نگو کو ہرنوں کے پاس چھوڑا اور اری کو ساتھ لے کر جنگل سے لکڑیاں لینے چلا گیا۔
اُن کے جاتے ہی وہی بڑا سا پرندہ پھر آیا اور آ کر کا نگو سے بولا۔
"مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ بتاؤ میں تمہیں لے جاؤں یا ہرن کو؟"
کا نگو ڈر گیا اور بولا "تم ہرن لے جاؤ۔"
پرندے نے اتنا سُنتے ہی ایک ہرن اُٹھایا اور اُڑ گیا۔
کا سا جنگل سے واپس آیا تو کا نگو نے اُس کی غیر موجودگی میں جو کچھ ہوا تھا بتایا۔ کا سا یہ سُنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور بولا۔

"تمہیں خود چلے جانا چاہیئے تھا... خیر اب کل میں یہاں ٹھہروں گا اور تم دونوں جنگل سے لکڑیاں لینے جاؤ گے"۔

چنانچہ اگلے روز کانگو اور اری جنگل سے لکڑیاں لینے گئے اور کاسا ہرنوں کے پاس ٹھہر گیا۔ اُن دونوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہی بڑا سا پرندہ اُڑتا ہوا آیا اور ہرنوں کے پاس بیٹھ کر کاسا سے بولا۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ بتاؤ میں تمہیں لے جاؤں یا ہرن کو؟" یہ سُنتے ہی کاسا کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"میں کاسا ہوں...! اس دنیا کا طاقتور ترین آدمی' نہ تو تم مجھے لے جاؤ گے اور نہ ہی ہرن کو"۔ اتنا کہہ کر کاسا نے اپنا لوہے کا سریا اُٹھایا اور پرندے کو مار دیا۔ پرندے نے کلّا کو سریا اُٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ اُڑا ہی تھا کہ کاسا کا سریا اُس کے جسم سے ٹکرایا۔ سریا لگتے ہی پرندہ زمین پر گر گیا اور فوراً ہی مر گیا۔

مگر اُس کے جسم سے ایک پر ٹوٹ کر ہوا میں ہچکولے کھاتا ہُوا کاسا کے کندھے پر آگرا۔ پر بہت بھاری تھا۔ چنانچہ کاسا پر کا وزن نہ اُٹھا سکا اور زمین پر گر گیا۔ کاسا منہ کے بل زمین پر گرا ہوا تھا۔ پر اتنا بھاری تھا کہ کاسا سے ہلا تک نہ جا رہا تھا۔

کاسا کو ایسی حالت میں لیٹے لیٹے خاصا وقت گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے ایک عورت کا گزر ہُوا۔ عورت کی پیٹھ پر اُس کی چھوٹی سی بچّی بھی سوار تھی۔ کاسا نے عورت کو دیکھا تو بولا۔

"برائے مہربانی میرے دوستوں کو جنگل سے بلا لاؤ تاکہ وہ مجھے اس پر کے نیچے سے نکال سکیں"۔

عورت یہ سُنتے ہی جنگل کی طرف روانہ ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد اری اور کانگو کو لے کر کاسا کے پاس پہنچ گئی۔ اری اور کانگو نے باری باری کاسا کے اُوپر پڑا ہو پر ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر اُن دونوں نے مل کر پر کو ہٹانا چاہا۔ مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

عورت یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگے بڑھی اور اُس نے جُھک کر اپنے منہ سے پر کو اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

پھر اُس نے مُردہ پرندے کو زمین پر سے اُٹھا کر اپنی چھوٹی سی بچّی کی پیٹھ پر لاد دیا۔ جیسے وہ کوئی کھلونا ہو، اور پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔

چراغِ علم

چراغِ علم سے روشن کرو زمانے کو
اسی چراغ سے اپنے غریب خانے کو

تم اپنے قول و عمل پر نظر ابھی سے رکھو
محبتوں کا بھی جاری سفر ابھی سے رکھو

صداقتوں کی سدا راہ اختیار کرو
بزرگ و برتر و کم تر سبھی سے پیار کرو

پڑھو تو دل سے جو کھیلو تو خوب محنت سے
کہ نام آئے زباں پر تمہارا عزت سے

خدا غرور و تکبّر سے دے نجات تمہیں
بُری لگے نہ کسی کی بھی تلخ بات تمہیں

ہر ایک دل میں محبت سے تم اُتر جاؤ
نہ کر سکا جو کوئی کام تم وہ کر جاؤ!

خدا سے کی تھی جو شاعر نے وہ دُعا تم ہو
ہمارے قائدِ اعظم کا مُدعا تم ہو

کسی کا دل نہ خدارا کبھی دکھا دینا
بجھا ہُوا جو دیا ہو اُسے جلا دینا

نئے علوم کی ہر آن جستجو رکھنا
رگوں میں اپنی اُبلتا ہُوا لہو رکھنا

دُعائے دلؔ ہے سدا کامیاب بن کے رہو
فلک پہ علم کے تم آفتاب بن کے رہو

محمدّامان خان دلؔ

عیاری کی کہانی

شکیل فاروقی

تاجر کی آنکھ جو گروی رکھ لی گئی

ایک تھا شہر۔ صاف ستھرا۔ چھوٹا، مگر بہت خوبصورت۔ اس میں رہتا تھا ہیروں کا سوداگر اس کے تھے دو دوست۔ بہت گہرے۔ بڑے پکے۔ ان میں ایک دوست تھا لنگڑا۔ وہ ریشمی کپڑے کی تجارت کے سلسلے میں ملک ملک در ملک جایا کرتا تھا۔ دوسرا دوست تھا کانا۔ ہیروں کا سوداگر اُسے پیار سے کانیا کہہ کر پکارتا تھا۔

تینوں دوستوں میں بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک بار لنگڑا تاجر تجارت کے سلسلے میں عرب ممالک کے دورے پر گیا۔ اس دوران میں ہیروں کے سوداگر کا انتقال ہو گیا۔

کچھ عرصے تک کانیا ہیروں کے سوداگر کے کاروبار کی نگرانی کرتا رہا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ کاروبار بہت ہی منافع بخش ہے تو اُس کے دل میں بے ایمانی آگئی۔ اُس نے ہیروں کے سوداگر کے بھولے بھالے لڑکے کو جال میں پھنسانے کی ترکیبیں شروع کر دیں۔

ایک صبح جب سوداگر کا لڑکا دکان کھول کر بیٹھا تو کانیا نے بڑے پیار سے اُس سے کہا۔

"دیکھو بیٹے! اب تمہارا کاروبار سنبھل گیا ہے۔ اب میں اپنی تجارت کے سلسلے میں نکلنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اب تم میری آنکھ مجھے واپس کر دو۔"

"کیسی آنکھ انکل؟" لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

"بیٹے ایک مرتبہ مجھے پانچ سو روپے کی بہت سخت ضرورت پڑ گئی تھی۔ تب میں نے اپنی نہایت قیمتی آنکھ تمہارے ابا کے پاس گروی رکھوا کر اُن سے پانچ سو روپے لے لیے تھے۔ تم وہ آنکھ تلاش کرو۔ کہیں نہ کہیں رکھی ہوئی ہوگی۔ بس جیسے ہی وہ مل جائے مجھے واپس کر دینا۔" کانیا نے کہا۔

بھولے بھالے لڑکے نے کانیا کی باتوں میں آکر ساری دکان اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دی اور سارا گھر چھان مارا لیکن آنکھ کہیں نہ ملی۔ بیچارہ رات بھر سوچتا رہا کہ پتا نہیں ابا نے کانیا انکل کی آنکھ کہاں رکھ چھوڑی۔ اگر آنکھ نہ ملی تو بے چارے انکل ایک آنکھ کے ہی رہیں گے۔ لڑکے کو اپنے ابا کی بھُول پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر اور زیادہ پریشان ہو رہا تھا کہ اگر ابا جی دوسرے لوگوں کی آنکھیں گروی رکھ کر اُسی طرح بھُول کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو پھر وہ اتنے سارے لوگوں سے کیسے نمٹے گا اور اپنی جان کیونکر چھُڑائے گا۔

دوسرے دن وہ پریشانی کی حالت میں دکان پر پہنچا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کانیا آدھمکا اور بولا "کیوں بیٹے میری آنکھ لے آئے"؟

"انکل آپ کی ہی نہیں کسی کی بھی آنکھ نہیں ملی۔ پتا نہیں ابا جی نے کہاں رکھ چھوڑی۔" لڑکے نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ چالاک کانیا نے اپنی دوسری آنکھ کو ملتے ہوئے کہا۔

"میری یہ آنکھ خراب ہو چلی ہے۔ میں تو اب کسی کام کا نہ رہوں گا۔ تم ہرجانہ کے طور پر مجھے دوہیرے دے دو۔"

"انکل بس ایک روز اور ٹھہر جائیے ذرا میں اپنی اماں سے بھی معلوم کر لوں۔ شاید ابا جی نے اُن کے پاس رکھوا چھوڑی ہو۔ اماں اپنے بھائی سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ بس واپس آنے ہی والی ہیں۔"

لڑکے نے کانیا سے ایک دن کی مزید مہلت طلب کی۔

"چلو ٹھیک ہے لیکن اگر کل بھی تم نے میری آنکھ واپس نہ لوٹائی تو پھر ہرجانہ کے طور پر دو ہیرے ضرور میرے لیے لیتے آنا۔" کانیا نے لڑکے کو پھُسلاتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔

سوداگر کا لڑکا پریشانی کے عالم میں دکان پر بیٹھا تھا کہ مرحوم سوداگر کا لنگڑا دوست اُدھر آنکلا۔

"بیٹا اُداس کیوں بیٹھے ہو؟"

لڑکا اس سوال پر اور بھی سہم گیا۔ وہ سمجھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ لنگڑے نے اپنی ایک ٹانگ بھی اُس کے باپ کے پاس گروی رکھوائی ہوئی ہو اور اب وہ اُسے واپس مانگنے کے لیے آیا ہو۔

" آپ ابا کے پاس گروی رکھوائی ہوئی اپنی ٹانگ واپس لینے آئے ہیں شاید" اس نے سہمے ہوئے انداز میں لنگڑے سے کہا۔

" کیا بک رہے ہو تم ۔ ٹانگ بھی کوئی گروی رکھوانے کی چیز ہے " لنگڑے نے سوداگر کے لڑکے کو گھورتے ہوئے کہا۔

اور پھر لڑکے نے کانیا والی بات لنگڑے چاچا کو بتا دی۔ لنگڑے کو کانیا کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا، پھر اُس نے لڑکے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

" بیٹا سنو! جب کانیا تمہارے پاس آئے تو اُس سے کہنا ابا کا آنکھوں والا ڈبہ مل گیا ہے۔ آپ اپنی آنکھ نکال کر دے دیجیے تاکہ اُس سے ملا کر آپ کی آنکھ تلاش کر لی جائے اور آپ کو لوٹا دی جائے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت سی آنکھوں میں سے کسی دوسرے کی آنکھ آپ کو دے ڈالوں " لڑکا لنگڑے چاچا کی عقلمندی کا قائل ہو گیا۔

اگلے دن جب وہ دکان پر پہنچا تو کانیا اس کے انتظار میں پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ لڑکے کو دیکھتے ہی بولا۔ " کہو بیٹا معلوم کیا میری آنکھ کے بارے میں اپنی اماں سے ؟"

لڑکے کو کانیا کی چالاکی پر دل ہی دل میں بہت ہنسی آئی لیکن اُس نے اپنے تاثرات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور نہایت معصومانہ انداز میں کانیا سے کہا۔

" انکل وہ آنکھوں والا ڈبہ تو مل گیا ہے، لیکن اُس میں دوسرے بہت سے لوگوں کی آنکھیں بھی اُس میں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ مہربانی کریں اور اپنی یہ آنکھ نکال کر مجھے دے جائیں تاکہ میں اس سے ملا کر آپ کی آنکھ آپ کو واپس لوٹا دوں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کسی دوسرے کی آنکھ آپ کے پاس آجائے۔ لائیے، جلدی کیجیے "

چالاک کانیا کو بھولے بھالے لڑکے سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ بُری طرح بوکھلا گیا اور بولا۔

" میں گھر جاتا ہوں اور یہ آنکھ نکال کر تھوڑی دیر بعد واپس تمہارے پاس آتا ہوں " یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا گیا۔

" انکل! آنکھ نکال کر ذرا جلدی واپس آئیے گا مجھے کہیں ضروری کام سے کہیں جانا ہے " لڑکے نے پیچھے سے آواز دی۔

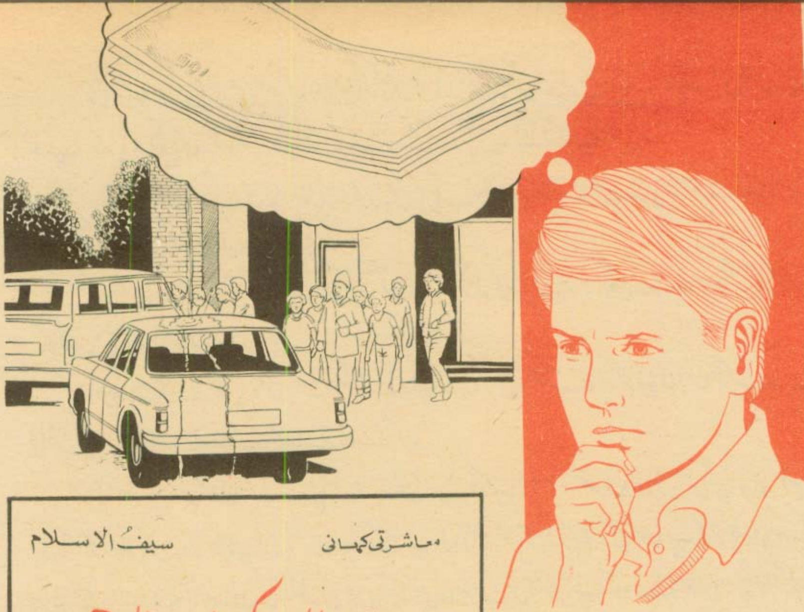

معاشرتی کہانی

سیفُ الاسلام

احمد ایسا کیوں بنا؟

احمد کے رنگ ڈھنگ تو بچپن ہی سے کچھ ٹھیک نہ تھے۔ اس پر امی جان کا بے جا لاڈ پیار۔ اُسے اچھے سے اچھا کھلاتیں، سب سے بہتر پہناتیں، ابا جان اور دوسرے گھر والوں سے چوری چھپے کھُلے ہاتھ سے اُسے جیب خرچ دیتیں۔ بس انھی باتوں نے صاحبزادے کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیے تھے۔ تھوڑا بہت ڈر تھا تو باپ کا ان کے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ جیب گرم رہنے کی وجہ سے اس کے گرد نام نہاد دوستوں کا حلقہ جمع ہو گیا

احمد کے والد صاحب ایک مدرسے میں استاد تھے، لوگ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے، اُن کا ایک شاگرد لیاقت، احمد کا بھی دوست تھا۔ لیکن اُسے احمد کے یہ رنگ ڈھنگ بالکل پسند نہ تھے۔ لیاقت اکثر احمد کو سمجھاتا کہ وہ برے لڑکوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا چھوڑ دے۔ یہ لڑکے دوست نہیں بلکہ تمہارے پیسے کے دوست ہیں جو تم اُن پر خرچ کرتے ہو۔

جوں جوں وقت کا پہیہ گھومتا رہا احمد اور لیاقت کی راہیں جُدا ہوتی گئیں۔ لیاقت نے وکالت کر لی اور احمد سات جماعتیں بھی نہ پڑھ سکا۔

احمد کے دوست اور اخراجات بڑھ چکے تھے۔ اُس نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے

لیے نئے حربے تلاش کر لیے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کئی مرتبہ لڑکوں کے ساتھ چوری کے الزام میں پکڑا بھی گیا لیکن والد صاحب کے اثر و رسوخ سے چھوٹ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ والد صاحب نے دھمکی دے دی کہ وہ آئندہ اس کی سفارش لے کر تھانے نہیں جائیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ ایسے دوستوں سے دوستی ختم کر دے اور بڑے بھائی کی پرچون کی دکان پر جایا کرے اور اس کے کام میں ہاتھ بٹائے۔

چند ہفتے وہ پرچون کی دکان پر گیا لیکن کام کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے دکان جانا مشکل لگنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے دوستوں میں مزے کرنے لگا۔ ایک دوست نے احمد کو ایک سیٹھ کے پاس ملازم رکھوا دیا۔ کام آسان اور پیسے زیادہ۔ پھر آزادی کی آزادی۔ احمد کو اور چاہیے بھی کیا تھا۔

احمد کے حالات دن بدن بدلتے گئے۔ محلے میں اس کی شکایتیں آنا بند ہو گئیں۔ چند ماہ بعد احمد نے اسکوٹر بھی خرید لیا۔ امی ابا اور گھر والے سب خوش تھے کہ احمد ٹھیک ہو گیا ہے۔ احمد سے یہ پوچھنے والا کوئی نہ تھا کہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آ رہے ہیں؟ سب اس کی خوشحالی سے خوش تھے۔ اس کی مثال پیش کی جاتی تھی کہ دیکھو احمد نے گھر میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

اب تو احمد کئی ہفتے گھر سے باہر رہنے لگا۔ گھر والوں کو یہی معلوم تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر جاتا ہے اور جب وہ باہر سے واپس آتا تو گھر والوں کی پسند کی چیزیں بھی ساتھ لاتا۔ گھر والے اور خاص طور پر امی جان تو صدقے واری ہو جاتیں۔ مگر وقت ایک سا نہیں رہتا۔

ایک روز ایسا ہی ہوا لیاقت بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر نے اُسے چونکا دیا۔ خبر یہ تھی "بدنام منشیات فروش احمد گرفتار"۔ یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ احمد کے گھر والوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ احمد کی ماں کسی طرح یقین نہ کرتی تھیں کہ احمد ایسا جرم کر سکتا ہے۔

احمد کے والد اپنے شاگرد لیاقت کے پاس آئے بولے "تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور وکیل بھی ہو، احمد کا مقدمہ تم ہی لڑو گے میرا احمد ایسا نہیں ہے تم اُسے بچالو"۔ لیاقت نے تسلی دی "دیکھیے اگر احمد واقعی بے قصور ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ باعزت بری ہو جائے گا۔ آپ بے فکر رہیں"۔

آج احمد کے مقدمے کے فیصلے کا دن تھا۔ عدالت میں سرکاری وکیل، گواہ اور دوسرے لوگوں کے علاوہ احمد کے دوست اور گھر والے بھی موجود تھے۔ احمد کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جج صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔ جج کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہر سمت خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں جج پر لگی ہوئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے جج نے خاموشی توڑتے ہوئے فیصلہ سُنا دیا۔ احمد پر منشیات کی اسمگلنگ کا الزام ثابت ہو چکا تھا اور اُسے سات سال قید بامشقّت کی سزا سنا دی گئی۔ احمد نے فیصلہ سُن کر گردن جھُکا لی۔

لیاقت نے جج کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "احمد قطعی طور پر اس سزا کا مستحق نہیں ہے۔ یہ سزا تو اُن والدین کو ملنی چاہیے جو اپنے بچّوں کی پرورش میں بے پرواہی برتتے ہیں اور جن کے بے جا لاڈ پیار سے بچّے بگڑتے ہیں، جو اپنے بچّوں کے دوستوں پر نظر نہیں رکھتے۔ سزا تو ایسے والدین کو ملنی چاہیئے۔
جج اپنی کُرسی سے اُٹھتا ہُوا بولا۔

"اس کے لیے آپ علیحدہ سے مقدمہ دائر کیجیے۔ عدالت خالی خولی تقریروں پر نہیں ٹھوس ثبوت کی روشنی میں فیصلہ دیتی ہے۔"

اسے ضرور پڑھ لیجیے!

بعض کُتب اور رسائل میں اکثر ایسی بہت سی معلومات یا معلومات پر مبنی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کا کوئی مُستند یا مُعتبر حوالہ نہیں ہوتا اور تحقیق پر پتا چلتا ہے کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معلومات یا واقعات کو محض کُتب یا رسائل میں شائع ہو جانے کی وجہ سے مستند سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ ایک سے دوسرے تک اس طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں کہ غلط ہونے کے باوجود ان کے علم کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ "آنکھ مچولی" نے معلومات کو اُن کی مکمّل صحت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ایسی معلومات کی اشاعت سے گریز کرے گا، جن کا کوئی مستند حوالہ نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہنا ہے کہ وہ جب بھی کوئی معلوماتی تحریر، معلوماتِ عامّہ یا تراشے کی شکل میں کوئی معلومات بھیجیں تو اُس کے ساتھ اُن کُتب یا رسائل کا حوالہ ضرور دیں، جہاں سے ان معلومات کو اخذ کیا گیا ہے۔ غیر مستند معلومات "آنکھ مچولی" میں شائع نہیں کی جا سکیں گی۔

انعام

پروین جمال

نام اس کا نازیہ تھا آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی چھٹیوں کا ہوم ورک ہو چکا تھا۔ نازیہ کا صرف ایک ہی مشغلہ تھا۔ کہانیاں پڑھنا ۔۔ اس کے چھوٹے بھائیوں سلمان، سعد جو چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے وہ بھی کہانیاں شوق سے پڑھتے تھے۔ وہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نازیہ آج بھی بہت بور ہو رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر ٹیبل پر پڑے ایک رسالے پر گئی۔ رسالے کی حالت اچھی تھی۔ نیا لگتا تھا اس نے رسالہ اٹھایا۔ اور ورق الٹنے لگی اس کی نظر ایک صفحے پر اٹک گئی۔ لکھا تھا "۵۰۰ روپے نقد انعام" پانچ سو روپے نقد انعام نازیہ نے دُھرایا اور پھر پڑھنے لگی "سب سے اچھی اور مختصر کہانی لکھنے پر پانچ سو روپے انعام" یہ پڑھ کر نازیہ پرجوش انداز میں اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر اس نے دوبارہ شروع کیا۔ کہانی بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ہے" نازیہ نے حساب لگایا تو ۱۳ دن باقی تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ کہانی لکھ سکتی ہے۔ اس نے بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں۔ اور کبھی کبھی کہانی لکھنے کو بھی دل چاہتا تھا نازیہ کہانی کے متعلق سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ذہن میں ایک ایسی کہانی کا خاکہ تھا۔ جسے یقیناً انعام مل سکتا تھا۔

اب اس نے کہانی کو ترتیب سے لکھنا شروع کیا تھوڑی دیر میں اس نے کہانی لکھ لی اور ایک صاف صفحہ پر اتار لی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی کہانی کو انعام مل جائے گا۔ نازیہ نے کہانی فوراً پوسٹ کر دی۔ وہ بہت خوش تھی۔

نازیہ نے گھر میں کسی کو بھی نہیں بتایا۔ نازیہ چاہتی تھی کہ جب اسے انعام مل جائے تو وہ سب کو حیران

کر دے ۔ رسالہ اب اس کے کمرے میں تھا۔ اور وہ یہی سوچتی کہ وہ انعام کی رقم سے کیا خریدے۔ اپنا سوٹ ابّو کے لئے وہی نیلے رنگ کی ٹائی جو اس نے پرسوں ایک دکان پر دیکھی تھی۔ جب وہ امی کے ساتھ بازار گئی تھی اور امی کے لئے ...... امی کے لئے کیا خریدے ..... چوڑیوں کا بکس اور ..... ہاں سعد سلمان کے لئے گیند بلا لائے گی جو پیسے باقی بچیں گے اس کے پرائز بانڈ خریدے گی ۔ ۔ ۔

کہانی بھیجے ہوئے اسے ۱۷ دن ہو گئے تھے۔ آج جب وہ رات کا کھانا کھا کر اپنے بستر پر آئی تو وہاں وہی رسالہ پڑا تھا۔ رسالے کو دیکھ کر پھر وہ سوچنے لگی۔ اپنا سوٹ ، ابو کی ٹائی ، سعد سلمان کے لئے گیند بلا وغیرہ اور ہاں ...... پھر پرائز بانڈ ...... شاید بانڈ سے اس کا کوئی بڑا انعام ہی نکل آئے۔ تو پھر وہ کیا کرے گی۔ نازیہ سوچنے لگی کہ وہ روپے وہ اپنے امی اور ابو کو دے دے گی اور ان سے کہے گی کہ ان پیسوں کو بنک کی کسی اسکیم میں لگوا دیں۔ کیونکہ کل جب ماموں آئے تھے تو وہ امی سے کہہ رہے تھے کہ بنک میں مختلف اسکیموں پر روپیہ لگانے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

نازیہ انہی سوچوں میں گم تھی اور اس کے ہاتھ میں وہی رسالہ تھا۔ اچانک اس کی نظر رسالے کی تاریخ پر پڑی تو رسالہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ بے شک رسالہ ستمبر کا تھا مگر اس پر سن ۱۹۸۵ء لکھا ہوا تھا یعنی رسالہ پچھلے سال کا تھا۔

راہ نُما
سچّی قرآنی کہانیوں کا
خوبصورت مجموعہ
قرآن کی سچی کہانیاں
بچوں کی تربیت میں
نہایت اہم کردار
ادا کر سکتی ہیں
راہ نُما کے حصول کے لیے
دس روپے کے
ڈاک ٹکٹ ارسال کیجیے ،

پاکستان بھر میں آنکھ مچولی کے نیوز ایجنٹ

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے
اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ
آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

محمد حسین برادرز۔ کراچی	فون:۔ ۷۲۳۹۵۵
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور	فون:۔ ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی	فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد	فون:۔ ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی۔ چوک یادگار۔ پشاور	فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس۔ ملتان	فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد	فون:۔ ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ	فون:۔ ۷۵۰۰۲
ملک اینڈ سنز۔ سیالکوٹ	فون:۔ ۸۷۹۸۹

سعید بک اسٹال۔ گجرات	فون:۔ ۰۴۳۳۱
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا	فون:۔ ۶۲۹۵۱
کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور	فون:۔ ۲۹۵۷
طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم	فون:۔ ۰۵۹۴۱
چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان	فون:۔ ۲۶۲۶
وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار۔ وہاڑی	
اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ	
اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ	
نیا مکتبہ اردو۔ جی ٹی روڈ۔ سرائے عالمگیر	

سلمان برادرز۔ نوابشاہ فون:۔ ۲۴۱۴

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیے!

سرکولیشن مینجر۔ ماہنامہ "آنکھ مچولی" ڈی۔ ۱۱۲۔ نورس روڈ۔ سائٹ۔ کراچی ۱۶

روم کی کہانی

انسانی کہانی

چند روز کی بادشاہت

نے راتوں کی نیند حرام کردی

JAMES BALDWIN

مہ وش شکیل

کسی زمانے میں یونان پر ڈائنوسس نام کا بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ نہایت ظالم اور جابر حکمران تھا۔ اسی وجہ سے اُس کے مُلک کے عوام اُس سے نفرت کرتے تھے، ڈائنوسس کو معلوم تھا کہ اُس کے عوام اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی باعث اُسے ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا

تھا کہ کوئی اُسے قتل نہ کر دے۔

دنیا کے سب بادشاہوں کی طرح ڈائنوسس بھی بہت امیر تھا۔ وہ ایک بڑے سے خوبصورت محل میں رہتا تھا۔ اُس کے خزانے میں طرح طرح کی قیمتی چیزیں موجود تھیں۔ ڈائنوسس کی خدمت کے لیے نوکروں کی ایک فوج محل میں موجود تھی۔

ایک روز ڈائنوسس کا ایک دوست جس کا نام ڈیموکلس تھا۔ ڈائنوسس کے پاس آیا اور بولا۔

"تم یقیناً بڑی عیش کی زندگی گزار رہے ہو کیونکہ تمہارے پاس دنیا کی ہر وہ چیز موجود ہے۔ جس کی خواہش کوئی آدمی کر سکتا ہے۔"

"اچھا تو پھر کیوں نہ ہم آپس میں اپنے گھر بدل لیں یعنی تم میرے محل میں میری جگہ آکر رہنے لگو اور میں تمہاری جگہ تمہارے گھر میں رہنے لگوں۔" بادشاہ نے اپنے دوست کی بات سن کر کہا۔

"بادشاہ سلامت بھلا میرے لیے اس سے بہتر کیا ہوگا کہ میں آپ کی جگہ آکر خوش و خرم زندگی گزارنے لگوں، میرے لیے تو آپ کی جگہ آکر ایک دن رہنا بھی اتنی بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔" ڈیموکلس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر آج ہی ہم اپنے گھر بدل لیتے ہیں۔" بادشاہ نے جواب دیا۔

چنانچہ اُسی روز ڈیموکلس بادشاہ کے محل میں منتقل ہوگیا اور بادشاہ ڈیموکلس کے گھر۔۔۔ بادشاہ نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ ڈیموکلس کی اُسی طرح خدمت کریں۔ جس طرح اُس کی کیا کرتے تھے۔

چنانچہ ڈیموکلس بادشاہ کے محل میں رہنے لگا۔ ڈیموکلس بادشاہ کے تخت پر بیٹھ جاتا اور پھر اُس کے آگے طرح طرح کے لذیز کھانے اور پھل فروٹ لا کر رکھ دیے جاتے۔ تخت کے چاروں طرف طرح طرح کے پھول گلدستوں میں سجے رہتے۔ ڈیموکلس شاندار موسیقی سنتے ہوئے کھا پی کر موج کرتا رہتا۔ ڈیموکلس کھا پی کر فارغ ہوتا تو آرام وہ بستر پر جا کر آرام کرنے لگتا۔ ڈیموکلس خیال کرتا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی ہے۔

ایک روز ڈیموکلس بادشاہ کے تخت پر بیٹھا تھا کہ اُس کی نظر چھت کی طرف اُٹھ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک تیز دھار اور نکیلی تلوار اُس کے سر پر لٹکی ہوئی ہے، تلوار اُس کے سر کے بے حد قریب تھی۔ ڈیموکلس نے غور کیا تو دیکھا کہ تلوار گھوڑے کے ایک بال سے بندھی لٹک رہی تھی۔

یہ دیکھتے ہی خوشی کے تمام آثار ڈیموکلس کے چہرے سے رفو چکر ہوگئے اور اُس کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ ہاتھ کانپنے لگے اور پیر تھر تھرانے لگے۔ اب اُسے نہ کسی کھانے کی خواہش تھی، نہ خوش کُن موسیقی کی، اور نہ ہی بھینی بھینی مہک والے پھولوں کی۔ اب تو وہ ہر قیمت پر فوراً محل چھوڑ کر کہیں بھی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ محل سے نکل کر بادشاہ کے پاس جا پہنچا۔

"کیا ہوا؟" بادشاہ نے ڈیموکلس کو گھبرایا ہُوا دیکھا تو پوچھا۔

"وہ تلوار... وہ تلوار..." ڈیموکلس خوف کے مارے بول نہیں پا رہا تھا۔

"ہاں! مجھے معلوم ہے کہ تمہارے سر پر ایک نوکیلی تلوار لٹکی ہوئی ہے اور یہ تلوار کسی بھی وقت تمہارے سر پر گِر سکتی ہے۔ مگر تم اُس کی پرواہ کیوں کر رہے ہو؟ یہ تلوار تو میرے سر پر بھی لٹکی رہتی تھی۔ مجھے بھی ہر وقت یہی خطرہ رہتا تھا کہ وہ تلوار کسی بھی لمحے میرے سر پر گِر سکتی ہے۔" بادشاہ نے کہا۔

"نہیں میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوگیا کہ دولت مند اور طاقتور لوگ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ میں اب اپنے عام گھر ہی میں رہنا پسند کروں گا۔" ڈیموکلس شرمندگی سے بولا۔

اور اس کے بعد وہ جب تک زندہ رہا، اُس نے کبھی بھی امیر بننے اور اپنا گھر چھوڑنے کی خواہش نہیں کی۔

شام کا وقت تھا، میں ٹی وی لگائے اسلامی تعلیمات کا پروگرام تفہیمِ دین دیکھ رہا تھا، یہ پروگرام مجھے بےحد پسند تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ابو کے موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ میں نے فوراً جاکر دروازہ کھولا۔ ابو بہت تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا کہ "ٹی وی کی آواز آہستہ کر دو۔" میں نے آواز آہستہ کر دی اور ابو کا سر دبانے لگا۔ تفہیمِ دین کے ختم ہونے کے کچھ ہی دیر بعد نغمہ آنے لگا۔ جب ابو کے کانوں میں نغمے کی دھیمی سی آواز پڑی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "جلدی سے آواز کھول دو۔" میں نے حکم کی تعمیل کی اور آواز کھول دی، مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا موسیقی اسلامی تعلیمات سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے؟ مگر میں یہ سوال ابو سے نہ پوچھ سکا۔ کیا آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے؟

(محمد جہانزیب مُغل۔ پُرانا شجاع آباد روڈ۔ ملتان)

جستجو شرط ہے

ذھانت اور معلومات کا منفرد ماہانہ مقابلہ

اسامہ بن سلیم

"جستجو شرط ہے" میں ساتھیوں کی دلچسپی کا اندازہ تو آپ کو گذشتہ ماہ کے شرکا کی ناموں کی طویل فہرست دیکھ کر ہی ہو گیا ہوگا، اس ماہ شرکا کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہم ان سب کے نام شائع کر دیتے تو ہمیں کہانی اسپیشل کی جگہ، جستجو شرط ہے، کا اسپیشل نمبر شائع کرنا پڑتا۔ اپنے نام نہ دیکھ کر آپ کو جو ذہنی کوفت ہوئی ہوگی، ہمیں اس کا اندازہ ہے۔۔ براہِ کرم ہماری معذرت قبول کیجیے۔

نئے ساتھی شرکت کا طریقہ ایک بار پھر جان لیں۔

ہر سوال کا جواب اس کے ساتھ دیے گئے الفاظ میں موجود ہے۔ تمام الفاظ سے ایک ایک حرف چُنیں اور اُن حروف کو ملا کر دیکھیں۔ جواب آپ کے سامنے ہوگا۔ ہر سوال کے ساتھ ایک شعری مصرع بھی ہے۔ اس مصرعے پر غور کیجیے آپ جواب تک بہ آسانی پہنچ جائیں گے۔

صحیح حل پر قرعہ اندازی کے ذریعے تین انعامات بھی بھجوائے جائیں گے۔ کامیاب ناموں کو شائع بھی کیا جائے گا۔ ضروری ہے کہ آپ کے جواب ماہ رواں کی ۱۵ تاریخ تک ہمیں مل جائیں۔

سوالات

۱ مچھلیوں کی بہت سی اقسام میں، ایک مخصوص مچھلی کا نام پوشیدہ ہے۔۔۔ تلاش کیجیے۔

۱ کاڈ ۲ وھیل ۳ پاپلیٹ ۴ اسٹارفش ۵ ٹونا

اشارہ: اُچھلے کُودے کھیل دکھائے۔۔۔ سب بچّوں کے دل کو بھائے

۲ کاروں میں ایک کار دنیا کی چند اچھی کاروں میں شمار ہوتی ہے۔ بتایئے تو اس کار کا نام کیا ہے؟
فی ایٹ ۲، مرسڈیز ۳، ڈاٹسن ۴، رینالٹ ۵، سوزوکی۔
اشارہ:۔ بھرتی ہے کیا فراٹے، چلتی ہے واہ واہ ری
۳ دنیا کے مشہور طیاروں میں ایک طیارے کا نام پوشیدہ ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں اس طیارے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے... غور کیجیے اس طیارے کا نام کیا ہے؟
۱، ڈی سی ۱۰ ۲، میراج ۳، ہرکولیس ۴، فوکر ۵، فینٹم ۶ جیگوار
اشارہ:۔ تجھ کو اعزاز میرے قائدِ اعظمؒ سے ملا۔
۴ سیاحت کے نقطۂ نظر سے دُنیا کی مشہور جگہوں میں ایسی ہی ایک مشہور جگہ کا نام چھپا ہُوا ہے دیکھیں آپ کی ذہانت اسے تلاش کر پاتی ہے یا نہیں؟
۱، ریڈ اسکوائر (روس) ۲، مجسمۂ آزادی (امریکہ) ۳، قطب مینار (بھارت) شاہی قلعہ (پاکستان)
۵، تاج محل (بھارت) ۶، ایفل ٹاور (فرانس) ۷، دیوارِ چین (چین) ۸، ورلڈ ٹریڈ سینٹر (امریکہ)
اشارہ:۔ اک بستیٔ امن و سکوں بچّوں کی جنّت بن گئی۔
۵ سکّوں میں ایک سکّہ (کرنسی) سکّے کے ساتھ اُس مُلک کا نام بھی بتانا ہوگا۔ جبکہ یہاں مختلف سکّوں میں صرف سکّے کا نام پوشیدہ ہے۔
۱، روبل ۲، افغانی ۳، فرانک ۴، ریال
اشارہ:۔ گڑیا سی بچّی بولی۔ "رے" سے رانی اور راجا
۶ اجرامِ فلکی کے نام تو آپ کو یاد ہی ہوں گے۔ پھر کیا مسئلہ ہے۔ انہی ناموں میں سے کوئی ایک نام ہے... تلاش کیجیے۔
۱ چاند ۲ قطب ستارہ ۳ عطارد ۴ کہکشان ۵ شہابِ ثاقب ۶ زہرہ
اشارہ:۔ قطب شمالی پہ اک ریچھ ہو کھڑا جیسے
۷ زمین کی گہرائی یا پہاڑوں کے اندر سے حاصل ہونے والی چیزوں کو ہم معدنیات کہتے ہیں۔ بہت سی معدنیات میں ایک معدن کا نام پوشیدہ ہے... غور کیجیے شاید پتا چل جائے۔
۱، جست ۲، پارہ ۳، فاسفورس ۴، نمک
اشارہ:۔ یہ جو استحکام ہے اِس سنگ ریزے ہی سے ہے

۸ حکمرانوں میں ایک حکمران ... اس نام سے آپ کو یقیناً واقف ہونا چاہیے ۔
۱۔ راجیو گاندھی (بھارت)، ۲۔ صدام حسین (عراق) ۳۔ حسنی مبارک (مصر) ۴۔ جگمے سنگھے وانگ چک (بھوٹان) ۵۔ گوربا چوف (روس) ۶۔ حسین محمد ارشاد (بنگلہ دیش)
اشارہ :- یوں تو "جھاڑی" بھی اس نام کے معنی پڑے

۹ سائنسدانوں کے پانچ ناموں میں ایک سائنس داں کا پانچ حرفی نام تلاش کیجیے ۔
۱۔ ڈارون ۲۔ ایڈیسن ۳۔ مارکونی ۴۔ آئن اسٹائن ۵۔ نیل آرمسٹرانگ
اشارہ :- کیا ہم نے وضع حرکت کے بنیادی اصولوں کو ۔

۱۰ اُردو ادب کے مشہور اور معرکۃ الآرا ناولوں میں سے ایک ناول ... ناول کا نام انہی ناولوں میں چھپا ہوا ہے ۔ ناول نگار کا نام آپ کو اضافی طور پر بتانا ہوگا ۔
۱۔ خدا کی بستی (شوکت صدیقی) ۲۔ توبۃ النصوح (ڈپٹی نذیر احمد) ۳۔ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ۴۔ صاعقہ (رضیہ بٹ) ۵ علی پور کا ایلی (ممتاز مفتی) ۶۔ آگ کا دریا (قراۃ العین حیدر) ۷۔ صورت خورشید جیتے ہیں (ابوالخطیب) ۸۔ فردوس بریں (عبدالحلیم شرر) ۹۔ آنگن (خدیجہ مستور) ۱۰۔
اشارہ :- یہ گرد میں اٹا ہوا لہولہان کون ہے ۔

جوابات :- جستجو شرط ہے، مقابلہ نمبر ۲ فروری ۸۹ء

---

۱ فریضہ بھی سعادت بھی ۔ "حج"
۲ جزائر میں موجود ملک "سری لنکا"
۳ بندرگاہوں پر موجود ہماری بحریہ کا جہاز "بابر"
۴ سفرناموں میں سیاح کا نام "مارکوپولو"
۵ دریاؤں میں آبشار کا نام "نیاگرا"
۶ ایجادات میں موجد کا نام "ایڈیسن"
۷ قدیم آثاروں میں قبرستان "مکلی"
۸ غذاؤں میں موجود قوت "پروٹین"
۹ دوسرے ملکوں میں ایک ملک "روس"
۱۰ بچوں کے رسائل میں بچوں ہی کے ایک رسالے کا نام "کھلونا"

انعام حاصل کرنے والے
تین خوش نصیب ساتھی

ابن غلام عیسیٰ ملتان روڈ لاہور
یاسمین حفیظ ۔ نارتھ ناظم آباد کراچی
حسین شہید خالد ۔ ریلوے اسٹیشن، حیدر آباد

چڑیا گھر

آج دیکھیں گے ہم بھی چڑیا گھر
یہ رہا شیر، وہ رہا بندر

اِک طرف خوشنما پرندے ہیں
اور دُوجی طرف درندے ہیں

اِس طرف تیتر اور طوطے ہیں
اُس طرف بھیڑیئے ہیں چیتے ہیں

یہ چنے کھائے گا تو وہ انگور
یہ ہے بن مانس اور وہ لنگور

یہ شُترمرغ ہے تو وہ اُلّو
بارہ سنگا ہے یہ تو وہ آہُو

یہ ہے سُرخاب اور وہ شکرا
یہ ہے لمڈھینگ اور وہ بگلا

ریچھ، گینڈے ہیں اور گیدڑ بھی
نیل گائے ہے اور لُومڑ بھی

"سانپ گھر" میں کرونڈیا بھی ہے
کوبرا بھی ہے اژدہا بھی ہے

ناچتا مور بھی مِلے گا یہاں
یہ ہے رنگوں بھرا حسین جہاں

زیبرا کتنا خوبصورت ہے
اور زرافے میں حُسنِ قدرت ہے

سارے بچّوں کا یار ہاتھی ہے
سب کا پیارا ہے سب کا ساتھی ہے

بندروں کے اُچھلنے پھرنے سے
ہر تماشائی خوش دکھائی دے

جانور کب ہیں چند پنجروں میں
ایک جنگل ہے بند پنجروں میں

پورا محلہ اُسے "رحمان بابا" کے نام سے پُکارتا تھا! وہ تھا بھی اپنے نام کی طرح رحمدل۔ بچّوں میں وہ کچھ زیادہ ہی مقبول تھا، عجیب سی کشش تھی اُس کی شخصیت میں، نورانی چہرہ اور اس پر سفید براق داڑھی بڑی ہی بھلی معلوم ہوتی۔ ساٹھ ستّر برس کی عمر ہو گی، لیکن جوانوں کی سی پھُرتی تھی، ہر کسی کے کام ہی آیا کرتا۔

وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اُس کے ماں باپ بیوی بچّے کہاں ہیں؟ ان سب باتوں کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

غالباً وہ اس بستی کا پہلا شخص تھا، تقریباً تمام گھر اُس کے سامنے ہی بنے تھے۔ ہر مکان میں اُس نے کام کیا تھا، جب ایک گھر بن جاتا تو کسی دوسرے گھر کا رُخ کرتا، رفتہ رفتہ تمام گھر بن گئے۔ خالی

رحمٰن بابا

علی مرتضیٰ

پلاٹ جہاں کبھی جنگلی گھاس اور کیکر کے درخت نظر آیا کرتے تھے ۔ اُن کی جگہ اب خوبصورت اور دلکش مکانات کھڑے تھے ، اُس علاقے میں ہمارا گھر سب سے آخر میں بنا ۔ وہ دن بھر ہمارے مکان میں ایک مزدور کی طرح کام کرتا اور رات کو چوکیداری ، جب مکان مکمل ہوگیا اور ہم اُس میں رہنے کے لیے آئے تو رحمان بابا نے میرے ابو سے درخواست کی کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے گھر میں چوکیدار رکھ لیں ۔ کیونکہ میرا دل اس علاقے کو چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا ! اس کے عوض مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے ۔"

ابو نے چند لمحے اُس کی درخواست پر غور کیا اور پھر اُسے رہنے کی اجازت دے دی ۔ میں جب سے نئے گھر میں آیا تھا میں نے کبھی اُسے نماز قضا کرتے نہیں دیکھا ، وہ بڑی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا اور صبح فجر کی نماز کے بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کرنا اُس کا معمول تھا ۔ چونکہ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے اس لیے ہر وقت کسی نہ کسی کہانی کی تلاش میں رہتا ہوں ۔ مجھے ایسے لوگوں سے بھی بہت دلچسپی ہے جو دوسروں سے مختلف نظر آتے ہیں ۔ رحمان بابا بھی مجھے کسی کہانی کا کردار لگتے تھے ۔ اُن کی ذات میں تجسس کا پہلو اس لیے بھی تھا کہ لوگ اُن کے متعلق طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے ۔ کسی کا خیال تھا کہ انہوں نے جوانی میں اپنے علاقے میں کسی کو قتل کیا تھا ۔ اور پھر بھاگ کر یہاں آ گئے تھے ۔ کسی کا کہنا تھا کہ کسی حادثے میں ان کے بیوی بچے ہلاک ہو گئے تھے ۔ جس کے بعد ان کا دل اُچاٹ ہوگیا اور اب وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن گزارنے یہاں آ گئے ۔ غرضیکہ جتنے منہ اُتنی باتیں ، لیکن یہ باتیں سُن سُن کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کسی روز رحمان بابا سے اصل حقائق ضرور اگلواؤں گا اور یہ موقع بہت جلد آ گیا ۔

اُس روز میں صبح سویرے ورزش کر کے لوٹا تو حسبِ معمول رحمان بابا چوکی پر بیٹھے قرآن کی تلاوت میں مشغول تھے ۔ میں اُن کے قریب جا کر اُکڑوں فرش پر بیٹھ گیا ۔ ۔ ۔ ان کی آواز میں بلا کا سوز تھا ۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے رہے اور میں محویت سے سُنتا رہا ۔ تلاوت ختم کرنے کے بعد اُنہوں نے شفقت سے میری طرف دیکھا ۔

" رحمان بابا ! میں نے کہا " آج مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے ۔"

" پوچھو بیٹا ۔ کیا پوچھنا ہے ؟"

" بابا ۔ آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیں ۔ آپ کے متعلق کوئی بھی کچھ نہیں جانتا ، لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں ۔"

" مجھے معلوم ہے ۔" رحمان بابا نے نرمی سے کہا " لیکن تم میری زندگی کے متعلق جان کر کیا کرو گے ؟"

"نہیں بابا۔۔۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیے۔ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔؟ ایک ایک بات جو آج تک سب سے چھپی رہی": میرے بہت اصرار پر رحمان بابا نے اپنی جو کہانی سُنائی وہ کچھ یوں تھی۔

"میرا تعلق ملک کے شمالی حصّے سے ہے۔ جہاں گرمیوں میں بَلا کی گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ چونکہ یہ پہاڑی علاقہ ہے اس لیے مہذّب لوگ اُدھر کا رُخ کم ہی کرتے ہیں۔ وہاں ہر قبیلے کا اپنا قانون ہوتا ہے۔ مُلکی قانون اُس میں مداخلت نہیں کرتا"۔ اتنا کہہ کر وہ ٹھہر گئے۔ کچھ دیر کسی سوچ میں گُم رہے پھر چونک کر بولے "اس طرح تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا میں شروع سے اپنی داستان سُناتا ہوں! میری داستان کا آغاز تقریباً آج سے پچاس برس قبل ہوا۔

ہم لوگ صحیح معنوں میں کشمیری خاندان سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ابھی پاکستان نہیں بنا تھا۔ اور پورے پاک و ہند پر برطانوی حکومت قابض تھی، ہمارے علاقے میں اکثر ہندو مسلم جلسے ہوتے رہتے تھے۔ چونکہ میرے والد ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور اس کے علاوہ وہ دینی علوم میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے علاقے کے مسجد کے پیش امام کے علاوہ ایک لیڈر بھی تھے۔ اُن دنوں مُسلم لیگ کافی زور پکڑ چکی تھی۔ آئے دن ہنگامے اور فسادات ہُوا کرتے اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا۔ چونکہ ہمارے علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کافی تھی اس لیے یہاں امن و امان کی فضا قائم تھی۔ چند ایک ہندو گھرانے بھی تھے لیکن میرے والد ہمیشہ لوگوں کو یہی تلقین کرتے کہ "آپس میں لڑنے سے کیا حاصل، پھر بلا وجہ کسی کا خُون بہانا، ہمارے مذہب میں منع ہے"، لوگ میرے والد کا کہا مان لیا کرتے تھے۔ کیوں اُس پورے علاقے میں اُن جیسا پڑھا لکھا اور دینی علوم میں ماہر کوئی اور شخص نہ تھا، میرے والد نے تو ہندو گھرانے کو بچایا ہوا تھا۔ لیکن اُنہیں معلوم نہیں کیوں، ہمارے والد سے دشمنی ہوگئی۔ اُن میں سے چند ایک نے برطانوی سرکار میں یہ شکایت پہنچا دی کہ ہمارے علاقے میں مولوی قدیرالدین لوگوں کو بغاوت کی تلقین کرتا ہے اور اُنہیں حکومت سے لڑنے کی بات کہتا ہے۔ اگر جلد از جلد اس بات کا نوٹس نہ لیا گیا تو یہ کشمیری عوام آپ کے خلاف ہو جائے گی۔

برٹش حکومت پہلے ہی ان ہنگاموں اور فسادات سے پریشان تھی کہ ان کا کیا سدِ باب کیا جائے۔ اُوپر سے یہ شکایت اُن تک پہنچی تو اُس نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ بس اُنھوں نے فوراً میرے والد کو گرفتار کر لیا اور تین ماہ تک اُن پر مختلف ظُلم ڈھاتے رہے اور جب اُن سے کچھ معلوم نہ کر سکے تو بغاوت کا الزام لگا کر مُلک بدر کر دیا۔

اُس وقت میری عمر کوئی دس، گیارہ برس کی ہوگی، مجھے اتنی عقل نہیں تھی لیکن ایک جملہ جو اکثر وہ مجھ سے کہتے تھے آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے کہ "جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے اور باطل کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ ایک وقت آئے گا جب حق کو فتح حاصل ہوگی۔ مجھے اُسی وقت کا انتظار ہے!"

آخر فتح حق کی ہوئی اور پاکستان بن گیا۔

سزا کا حکم سُننے کے بعد میرے والد وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان کے شمالی حصّے میں آگئے۔ وہاں مختلف قبائل آباد تھے۔ اور یہ علاقہ "علاقہ غیر" کہلاتا تھا! یہاں ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا جو کہ "خان بابا" کہلاتا اور زیادہ تر جھگڑے کا تصفیہ خان بابا ہی کرتا۔ ان قبیلوں کا عجیب دستور تھا۔ اِس علاقے میں آنا تو ہر کسی کے اختیار میں تھا لیکن جانا نہیں، یہاں وہی سب سے زیادہ عزّت دار تھا جو سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ جو کمزور ہوتا اُسے تمام لوگ پریشان کرتے اور مذاق اُڑایا کرتے۔

چونکہ میرے والد طاقتور نہیں تھے اس لیے ہر کوئی اُن کا مذاق اُڑایا کرتا، لیکن اُن میں بَلا کا صبر و تحمّل تھا۔ بڑی سے بڑی بات کا جواب نہ دیتے۔ شاید یہ اسلامی تعلیمات کا اثر تھا جو لوگوں سے نرمی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کرنے کو کہتے۔ چونکہ میرے والد کو پڑھانے کے علاوہ اور کوئی کام آتا نہیں تھا۔ اس لیے اُنہیں اپنی روزی کمانے کے لیے کافی جدّوجہد کرنی پڑی۔ آخر کار انہوں نے جانوروں کے ریوڑ کی دیکھ بھال کا ذمّہ لے لیا۔ چند سال سکون سے گزر گئے۔ لوگ اب میرے والد کی عزّت کرنے لگے تھے۔ کیونکہ اُنہیں آج تک میرے والد سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کبھی انھوں نے کسی کا حق مارا تھا۔ میرے والد، میری تربیت بھی اپنی طرح ہی کر رہے تھے۔ وہ روزانہ مجھے اسلام کے اصول بتاتے اور ساتھ یہ بھی بتاتے کہ ہمارے بزرگوں نے دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے کیا کیا قربانیاں دیں۔

قبیلے کا خان ایک ظالم اور لالچی شخص تھا۔ ہر کسی پر کسی نہ کسی بہانے ظُلم کرنا اور اُس سے رقم بٹورنا اُس کی عادت تھی۔ میرے والد سے بھی اُس کا سلوک نہایت بُرا تھا۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح علم تھا۔ اس لیے ایک مرتبہ میں نے اُس کے بیٹے سے یہ بات کہہ دی کہ تمہارا باپ ایک ظالم شخص ہے۔ اُس نے اُس وقت تو مجھے کچھ نہیں کہا بس گھورتا ہُوا مجھے چلا گیا۔

اس واقعے کو کوئی ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ اچانک میرے والد کے ریوڑ کی بکریاں غائب ہونے لگیں۔ دو تین دن تک تو لوگ یہ خیال کرتے رہے کہ شاید جانور کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جب یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آیا تو وہ پریشان ہو گئے۔ والد صاحب پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ دوسرے قبیلے والوں کو بکریاں

فروخت کر دیتے ہیں یہ الزام لگانے میں خان بابا کا بیٹا سب سے آگے تھا۔ آخر یہ مسئلہ خان بابا کے سامنے پیش ہُوا۔ اُنہوں نے چند لمحے اس پر غور کیا پھر اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولے۔

"چونکہ یہ الزام ثابت نہیں ہوسکا کہ قدیرالدین واقعی بکریاں دوسرے قبیلوں والوں کو فروخت کرتا ہے۔ اس لیے یا تو وہ ان بکریوں کو واپس لائے یا ان کی قیمت اُن کے مالکوں کو ادا کرے، اگر وہ اس کا اہل نہیں ہے تو وہ آج ہی اس قبیلے سے نکل جائے اور اُس وقت تک واپس نہ آئے جب تک وہ بکریاں واپس نہ لے آئے یا اُن کی قیمتیں، اتنے عرصے تک اس کا بیٹا بطور یرغمال ہمارے پاس رہے گا۔"

مجھے وہ منظر ابھی تک یاد ہے جب میرے والد کس طرح مجھ سے لپٹ کر روئے تھے۔ مگر انہوں نے صبر کا دامن نہ چھوڑا، نہ انہوں نے خان بابا سے رحم کی بھیک مانگی۔ بس انہوں نے مجھے خاموشی سے اُن کے حوالے کر دیا۔ میں بہت تڑپا، چلّایا مگر میری کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

پھر مجھے خان بابا اپنے شاندار گھر میں لے آیا۔ یہاں آکر ہی مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو خان بابا کے بیٹے کی سازش تھی کیونکہ میں نے اُس کے باپ کو ظالم اور لالچی کہہ دیا تھا۔ وہاں مجھے نوکروں کی طرح رکھا گیا۔ ہر مشکل کام مجھ سے کرایا جاتا۔ خان بابا نے پہاڑوں کے نشیب میں ایک باغ بنا رکھا تھا۔ جس میں سیب انگور اور خوبانی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں کام پر لگا دیا گیا۔ سارا دن میں کنویں سے پانی نکال نکال کر پودوں میں ڈالتا رہتا۔ اس طرح مجھے کام کرتے ایک برس بیت گیا کہ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ میرا باپ ایک پہاڑی سے گر کر ختم ہوگیا۔ آہ! اُس رات میں اپنے کمرے میں بلک بلک کر رویا۔ میرا دل خان بابا اور اُس کے ملازموں سے پہلے ہی متنفر ہو چکا تھا۔ جب والد کے آنے کی اُمید ہی ختم ہوگئی تو یہاں رہنے کا کیا فائدہ تھا۔ میں موقعے کی تلاش میں رہنے لگا کہ کسی طرح مجھے موقع ملے اور میں یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ بالآخر ایک رات مجھے موقع مل گیا۔ خان بابا دوسرے قبیلے کی دعوت میں گیا ہوا تھا میں وہاں سے فرار ہو کر چھپتا چھپاتا اِس شہر میں پہنچ گیا۔ باقی آگے کی زندگی تو سب ہی کو معلوم ہے۔"

"رحمان بابا... ظالم کو ظالم کہنے کی اتنی کڑی سزا!" میں نے کہا۔

"ہاں بیٹے! لیکن حق بات کہنے والے ایسی سزاؤں کی پرواہ ہی کب کرتے ہیں۔"

رحمان بابا نے کہا۔ ان کی آنکھوں میں یقین کی چمک تھی۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

ترغیب کی کہانی

عمران مشتاق

~~~~ نیم پلیٹ

ایسا ہی نیم پلیٹ وہ اپنے دروازے پر آویزاں کرنا چاہتا تھا

کامران کی نظریں ڈاکٹر نواز اختر کی نیم پلیٹ پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں، وہ پلکیں تک نہیں جھپکا رہا تھا۔ سنہری پلیٹ پر لکھے ڈاکٹر صاحب کے نام اور اُن کی ڈگریوں نے جیسے اُس کی نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے نیم پلیٹ ہی کو دیکھے جا رہا تھا "کامران بیٹے" ابّو کی آواز نے اُسے چونکا دیا "تم اتنی غور سے کیا دیکھ رہے ہو" ابّو نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"وہ ابّو میں ... میں اس سنہری پلیٹ کو دیکھ رہا تھا" کامران گڑبڑا گیا۔

"اس سنہری پلیٹ میں کیا خاص بات ہے" ابّو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کچھ نہیں، ابّو میں بس سوچ رہا تھا کہ کیا ایسی ہی سنہری پلیٹ آپ مجھے بھی لے دیں گے؟" کامران نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" ابّو دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ "بیٹا ویسے تو اس سنہری نیم پلیٹ میں کوئی خاص بات نہیں لیکن انسان سخت محنت اور جدّ و جہد سے جب زندگی میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو اُس کا نام اور اُس کی ڈگریاں سنہری حروف بن کر نیم پلیٹ پر جگمگانے لگتی ہیں۔ ذرا دیکھو تو ڈاکٹر صاحب کی یہ نیم پلیٹ کیسی جگمگا رہی ہے۔"

ساتویں جماعت کا کامران صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

"دونوں باپ بیٹے اس وقت شہر کے معروف چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹر نواز اختر کے مطب پر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا طریقۂ علاج نفسیاتی تھا۔ وہ پہلے بچّے سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے۔ پھر بعد میں بچے کے والدین سے مل کر ضروری ہدایت دیتے تھے۔ باری آنے پر کامران اندر چلا گیا۔ اور ویٹنگ روم میں انتظار کرنے لگے۔

کامران بڑا ضدی لڑکا تھا۔ اُسے پڑھائی سے ذرّہ بھر دلچسپی نہ تھی۔ دن بھر شرارتیں کرنا، اور لوگوں کو ستانا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ پچھلے دو سال سے امتحان میں مسلسل فیل ہو رہا تھا۔ اُس کے ابّو اسے کئی نفسیاتی ماہروں کو دکھا چکے تھے۔ لیکن ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہُوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ چند ضروری ہدایات دیں اور ایک مہینے کے بعد پھر آنے کے لیے کہا۔ واپسی پر انہوں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے بعد کامران کافی خاموش اور کھویا کھویا سا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے کافی متاثر لگ رہا تھا۔ آج سے پہلے وہ ہر ڈاکٹر سے ملنے کے بعد ڈھیر ساری باتیں کرتا تھا اور ہنس ہنس کر ڈاکٹر کی نقلیں اُتارتا تھا۔ لیکن آج وہ بالکل چُپ تھا۔ ابّو نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے جیسے کامران کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ پڑھائی کی طرف پوری توجہ دینے لگا۔ اب وہ اسکول وقت پر جاتا۔ گھر آنے کے بعد شام تک پڑھائی کرتا رہتا، شرارت تو دُور کی بات اب تو وہ جیسے کھیلنا کودنا ہی بھول گیا تھا۔ گھر والے اس خوشگوار تبدیلی پر حیران تھے۔ امی تو ڈاکٹر نواز اختر کو دُعائیں دیتی نہ تھکتیں تھیں۔ جس نے اُن کے بچّے کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔

ابّو کا بھی یہی خیال تھا کہ نفسیاتی ماہر کے پاس لے جانا بالآخر سودمند ثابت ہوا۔ کامران نے پڑھائی کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی۔ اور ساتویں کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اب وہ سب کی آنکھوں کا تارہ تھا۔

کامران کے گھر ایک چھوٹی سی تقریب تھی۔ اُس نے وظیفہ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اور اپنے اسکول میں اوّل رہا تھا۔ امی نے اُس کی کامیابی کی خوشی میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا تھا۔ قرآن خوانی اور کھانے کے بعد سب لوگوں نے کامران کو تحائف دیے۔ کامران کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ لوگوں کے جانے کے بعد اُس نے تحائف کھولنا شروع کیے۔ ابّو نے خوبصورت گھڑی دی تھی۔ امی نے اچھی اچھی کتابوں کا سیٹ، باجی نے پارکر قلم خالہ نے سیلوں سے چلنے والا ہیلی کاپٹر، ماموں نے کیرم بورڈ، پھوپھی نے شلوار قمیض کا کپڑا۔ اس کے علاوہ بھی کئی تحائف تھے۔ وہ پیکٹ کھول کھول کر دیکھتا اور انہیں ایک طرف رکھ دیتا۔

ایک پیکٹ اُس نے کھولا تو اُس کی نظر جَم کر رہ گئی۔ وہ اُس کے بہترین دوست اسد کا تحفہ تھا۔ اُس میں ایک خوبصورت کتاب تھی ایک گتّے کے ٹکڑے پر سنہرے پینٹ سے کامران کا نام لکھا تھا۔ اور نیچے اُسے اس کامیابی پر مبارک باد دی گئی تھی۔ وہ بڑی دیر تک گتّے کے ٹکڑے پر لکھے اپنے نام کو دیکھتا رہا۔ پھر ابّو سے بولا۔

"ابّو اگر میرا نام اس گتّے کے بجائے سنہری پلیٹ پر لکھا ہوتا تو کتنا خوبصورت لگتا۔"

ابّو حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ کامران نے پوچھا۔

"ابّو اگر میں اسی طرح محنت کرتا رہا تو میں ڈاکٹر بن جاؤں گا نا؟"

"ہاں بیٹا! آپ ضرور ڈاکٹر بن جائیں گے۔" ابّو محبت سے بولے۔

"ابّو ڈاکٹر بننے کے بعد میرا بھی خوبصورت کلینک ہوگا نا، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ اور دروازے کے باہر ویسی ہی خوبصورت چمکدار سنہری پلیٹ لگی ہوگی، جس پہ میرا نام لکھا ہوگا۔" نیم پلیٹ کا ذکر کرتے ہوئے وہ جیسے کسی اور ہی دُنیا میں کھو گیا۔

ابّو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی یکسر تبدیلی کی اصل وجہ اب ان کی سمجھ میں آئی تھی۔ اس کا باعث ڈاکٹر صاحب ہی تھے، لیکن اُن کا علاج نہیں، بلکہ وہ سنہری نیم پلیٹ جو کہ ان کے دروازے کے باہر لگی تھی۔

سنسنی خیز کہانی

ماجد سعید

وہ پُرانا صندوق

تین روز سے ہم بُری طرح سے پھنسے ہوئے تھے۔ مجھے پکا یقین تھا کہ ہم بچ کر نکل نہیں سکتے۔ سمندر کی لہریں ہر لمحے ہمارے قوی ہیکل جہاز کو نگلنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ ساٹھ گھنٹے تک ہم موت و زندگی کی کش مکش میں مُبتلا رہے۔ خدا خدا کر کے طوفان ختم ہوا' اور ہم نقصانات کا جائزہ لینے جمع ہوئے۔ عین اُسی وقت میرے ایک ماتحت نے کچھ دُور پانی میں دو ڈبکیاں لگاتے ہوئے دو مستول والے ایک جہاز کی طرف اشارہ کیا۔ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں دائیں بائیں بیسیوں شکستہ اور ٹوٹے حصّے پانی میں تیر رہے تھے۔ میرا ایک ماتحت جو دُوربین میں سے تباہ

ہونے والے جہاز کا جائزہ لے رہا تھا۔ بولا "معلوم ہوتا ہے مسافر اور عملے کے لوگ جہاز چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" میں نے دُور بین اُس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی تک کچھ لوگ جہاز پر موجود ہوں اور اُنہیں ہماری مدد کی ضرورت پڑے۔ میں نے دو کشتیوں میں ملاّحوں کو بھیج دیا ہے"۔

"ارے وہ دیکھیئے ہَوا کے ایک جھونکے سے جھنڈا ذرا کھُلا ہے، یہ برازیل کا ہے، لیکن یہ اُلٹا کیوں ہے۔ جناب یہ ایک معروف بحری اشارہ ہے۔ اس سے یہ اطلاع دینی مقصود ہوتی ہے کہ ہم خطرے میں ہیں"۔ کوئی سات بجے کا وقت ہوگا ہم نے لنگر گرا دیے تھے اور ملاّحوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں خود بھی اس جہاز میں جاؤں۔ میں نے ایک رسّے کی مدد سے کشتی میں چھلانگ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم تباہ شدہ جہاز کے پہلو میں پہنچ گئے۔ میرے ساتھ میرا ایک ساتھی گوٹرنگ اور دوسرا ہمارے جہاز کا مستری تھا۔ جو نہایت تجربہ کار تھا۔ "تم جہاز کا جائزہ لے کر آؤ"۔ میں نے مستری سے کہا۔ جائزہ لینے کے بعد وہ آیا اور کہا۔

"کپتان صاحب" وہ بولا۔ "اُس جہاز کے نچلے حصے میں پانی بھر چکا ہے۔ لیکن اس پر ایک بڑی مقدار میں خالی ڈبے، پہیے اور ڈرم ہیں جو خالی ہونے کی وجہ سے ان میں ہوا بھری ہے۔ اس ہوا کے سبب جہاز پانی میں تیر رہا ہے۔ آپ لوگ بلا خوف و خطر عرشے پر گھوم سکتے ہیں۔ جہاز کے عرشے پر بیشتر چیزیں ٹوٹ چکی تھیں۔ میں ابھی جہاز کا معائنہ ہی کر رہا تھا کہ گوٹرنگ اندر داخل ہوا۔ خوف و ہراس کی وجہ سے اُس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ "جناب ایک شخص کی لاش ملی ہے"۔ "کیا اس شخص کی موت طوفان سے ہوئی ہے"۔ "کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہتر ہے آپ خود چل کر دیکھ لیں"۔ گوٹرنگ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں چار کونوں والا ایک بڑا صندوق پڑا تھا۔ میرے خیال میں یہ صندوق پانچ فٹ لمبا ایک فٹ دو انچ اونچا اور تین فٹ چوڑا تھا۔

صندوق کے کچھ فاصلے پر اُونی کپڑے کے ڈھیر کے پاس ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ لاش پر کوئی زخم نہ آیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لاش کو اوندھا کیا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سر کے پچھلے حصے پر ایک بڑے کلہاڑے کا زخم دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے فوراً حکم دیا کہ تم اپنے جہاز والوں سے کہو کہ وہ ایک کشتی ادھر بھیج دیں تاکہ ہم یہ صندوق

لے جاسکیں"۔

وہ باہر چلا گیا۔ میں صندوق کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے ڈھکنے پر پُرتگالی زبان میں لکھا تھا کہ" آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ کسی بھی قیمت پر صندوق کھولنے کی کوشش نہ کریں"۔ یہی ہدایت ہسپانوی زبان میں درج تھی۔ اتنی دیر میں میرا ایک نائب آرمسٹرانگ کشتی لے کر پہنچ گیا۔ ہم نے جہاز کی خاص خاص چیزیں اور خاص طور پر صندوق کشتی میں ڈالا اور اپنے جہاز میں پہنچ گئے۔ آرمسٹرانگ لمبے قد کا دُبلا پتلا انسان تھا اور بہترین ملّاح ہونے کے باوجود اپنی بددیانتی کی وجہ سے خاصا بدنام تھا۔ تباہ شدہ جہاز کے آنے والے صندوق نے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی تھی۔

کپتان صاحب" ہمیں جلدی سے سامان کھول کر دیکھنا چاہیے کہ اس کی کتنی مالیت ہے"۔

" صندوق کھولنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ تم نے وہ عبارت نہیں پڑھی جو صندوق میں درج ہے۔ بہرکیف میں تمہیں صندوق کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا"۔ آرمسٹرانگ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اب آپ کو رات کا واقعہ سُناتا ہوں جس نے تھوڑی دیر کے لیے میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم کر دیں۔ طوفان کے پیشِ نظر میں نے اُس رات تین آدمیوں کی پہرے کی ڈیوٹی لگا دی آرمسٹرانگ کی باری دوسرے نمبر پر تھی۔ اس کی ڈیوٹی چار بجے شروع ہو گئی تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک ایک چیخ نے میرے سارے بدن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں فوراً اُٹھا اور اُس کیبن کی طرف دوڑا جہاں صندوق رکھا تھا۔ کیبن میں ہر چیز بوؤں کی توں پڑی تھی۔ اچانک میری نظر ایک لاش پر پڑی جو آرمسٹرانگ کی تھی۔ ارے یہ کیا یہ بالکل اُسی طرح مرا ہے جس طرح وہ برازیلی ملّاح مرا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیچ کس ہے جسے گزشتہ رات وہ تالا کھولنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

" آخر اس صندوق میں ہے کیا؟"

"یقیناً اس میں کوئی خونی آدمی چھپا ہُوا ہو گا۔ جو پُوری طرح مسلح ہو گا اور اس وقت تک لڑتا رہے گا جب تک خود ختم نہیں ہو جاتا اور جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو اس جہاز کا کوئی مسافر اس کو کھانا پہنچاتا ہو گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔ گوئرنگ نے کہا تم ایسا کرو کہ مستری کو بلا کے لے آؤ۔ ہم تینوں مل کر کھولیں گے"۔

تھوڑی دیر بعد گوئرنگ اور مستری کمرے میں داخل ہوئے۔ مستری کے ہاتھ میں ایک بڑا

سا ہتھوڑا تھا۔ گوٹرنگ، بولا، میں پیچ کس سے یہ تالا فوراً کھول دوں گا۔ آپ دونوں میرے پیچھے کھڑے رہیں اگر کوئی شخص باہر نکلنے کی کوشش کرے تو آپ فوراً فائر کر دیجیے گا۔ یہ کہہ کر گوٹرنگ صندوق کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے پیچ کس کو تالے میں گھمایا۔ ایک مدھم سی آواز کے ساتھ ہی تالا کھل گیا۔ ہم دونوں تیار کھڑے تھے کہ صندوق سے کوئی چیز نکلے اور ہم وار کریں، لیکن ہم مایوس ہوئے۔ اندر جھانکا تو صندوق بالکل خالی تھا اس کے ایک کونے میں پرانی طرز کی ایک موم بتی رکھنے والی ایک چھڑی دکھائی دی۔ جس پر نہایت خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور صندوق کو کھولنے کے لیے اس میں بھاری اسپرنگ لگے ہوئے تھے۔ اُس اسپرنگ کا مقصد کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ ذرا مجھے کونے سے وہ لکڑی تو اُٹھا دو۔ اس نے اس لکڑی سے موم بتی رکھنے والی چھڑی کو دبایا ہی تھا کہ اچانک چمکتے ہوئے فولادی کانٹے صندوق میں سے ایک جھٹکے کے ساتھ باہر نکلے اور یہ دھاری دار صندوق ہم پر اس طرح جھپٹا جیسے خونی درندہ اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ہم ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ صندوق کا بھاری ڈھکنا مہیب آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ اور زمین پر گرتے ہی تالا خود بخود لگ گیا

"دراصل یہ صندوق اس لیے بنایا گیا ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی مکار کیوں نہ ہو اس میں چھپی ہوئی دولت نہ چھڑا سکے۔ چنانچہ تم دیکھ سکتے ہو کہ موم بتیاں سجانے والی چھڑی صندوق کے بالائی حصے میں پڑی ہے۔ ہو بہو سونے کی نظر آتی ہے۔ دولت کے لالچ میں صندوق کھولنے والا شخص یقیناً جھک کر اس چھڑی کو اُٹھائے گا اور ایسا کرتے ہی وہ بھاری اسپرنگ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ جو ہمیں صندوق میں داہنی طرف نظر آرہا ہے۔ اسپرنگ کے ہٹتے ہی صندوق میں سے فولادی کانٹے نکلیں گے اور جھکے ہوئے آدمی کے سر کے پچھلے حصے پر حملہ کر دیں گے۔ وہ بدنصیب ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے گرے گا اور اس کے گرتے ہی صندوق کا ڈھکنا دوبارہ بند ہو جائے گا"۔

"اب کیا کرنا ہے اس صندوق کا"؟

"ہم اسی وقت اس کو سمندر میں پھینک دیں گے۔ تاکہ آئندہ یہ صندوق کسی کی جان لینے کا سبب نہ بنے"۔

ہم نے وہ صندوق پانی میں پھینک دیا۔ اس کے گرتے ہی پانی کے چھینٹے اُڑے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ دُور دُور تک پانی کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔

"علی! الا جلدی سے اپنا پیالہ بھی دے دے دھو دوں گی ورنہ بعد میں پھر مجھے برتن مانجھنے پڑیں گے۔" باورچی خانے سے ماں کی آواز سُنائی دی تو علی کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ رات کی روٹی کے نوالے وہ چائے کے ساتھ جلدی جلدی حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔ "لایا ماں"

"ارے جلدی کر، سکینہ کہاں ہے؟" ماں نے آواز لگائی۔

قُربانی

فیروزہ عبدالستار

آغا خان گرلز اسکول کھارادر

"سکینہ صحن میں ہے کھیل رہی ہے۔" علی نے چائے کے بڑے بڑے گھونٹ پیتے ہوئے پیالہ خالی کر دیا۔

علی بارہ سال کا تھا اور سکینہ اُس سے تین سال چھوٹی تھی۔ شوہر کی شہادت کے بعد نورالنسأ بیگم نے دونوں بچّوں کو باپ بھی بن کر پالا تھا۔ شوہر کی لاش پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی "سرتاج۔ تم نے اپنی جان جس مقصد کے لیے دی ہے۔ میں تمہارے ہی خون کی سُرخی سے علی کو بھی رنگوں گی۔ اسے بھی آزادی کے پروانوں میں شامل کر دوں گی اور تمہارے مقصد کو آگے بڑھاؤں گی۔" یہ وہ دن تھے جب انگریز اور ہندو کے ظلم سہتے مسلمانوں کے دن گزر رہے تھے۔ تحریکِ پاکستان اپنی عروج پر تھی اور عنقریب قیامِ پاکستان کا اعلان ہونے والا تھا۔

گلی میں ہر طرف شور سُنائی دے رہا تھا۔ اور پھر یہ شور ہر لمحہ بڑھتا گیا۔ عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں کی چیخوں اور نوجوانوں کے نعروں سے پوری گلی گونج رہی تھی۔

"ماں۔ ماں۔" علی خوفزدہ ہو کر واپس پلٹا نورالنسأ بھی چونک اٹھیں اور علی کو سینے سے لگا لیا۔ وہ کانپ رہا تھا دونوں بچے ماں سے پلٹے ہوئے تھے۔

"ڈرو مت۔ یہ بزدل ہیں۔ تم مسلمان ہو۔ بہادر ہو۔ اگر ڈرو گے تو یہ تمہیں مار ڈالیں گے" ماں کے سائے میں دونوں بچّوں کو سکون محسوس ہوا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور زور زور سے دروازہ بجنا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے نورالنسأ آگے بڑھتی۔ یک لخت دروازہ ٹوٹ کر اندر آ گرا ایک سپاہی نے تلوار کی نوک سے سکینہ کو اُٹھا لیا۔ اُس کی چیخیں اور اُس کا خون بوند بوند ٹپک رہا تھا۔

کہہ گئے اہلِ دانش

- ....خاموشی گفتگو کا حُسن ہے۔ (بو علی سینا)
- ....بُرا نہ ہونا بھی ایک نیکی ہے۔ (ابن جوزی)
- ....کسی کو نصیحت نہ کرو، کیوں کہ بے وقوف سنتا نہیں اور عقلمند کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (برنارڈ شا)

مبشّر علی زیدی ـــــ ایف بی ایریا، کراچی

نورالنساء بیگم نے یہ دیکھا تو مُسکرائیں اور کہا "بیٹی آزادی مبارک ہو" انہوں نے سکینہ کے مُردہ جسم کو دیکھتے ہوئے شان سے کہا۔ علی نے یہ دیکھا تو ماں کو لے کر بھاگنا چاہا لیکن اُس کی ماں اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔ ایک دوسرے بلوائی نے اس کی ماں پر تلوار سے بھرپور وار کیا۔ وہ خون میں نہائی فرش پر گر پڑی۔ اُسی لمحے بھالے کی نوک علی کی پیٹھ میں لگی وہ بدحواس ہو کر بھاگا۔ کھُلا دروازہ دیکھ کر گلی کی طرف دوڑا وہ گلی میں بھاگتا چلا گیا۔

ریلوے اسٹیشن پر لُٹے پٹے مسلمان اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ پاکستان جانے والی ریل کے انتظار میں تھے۔ علی بھی اُن میں موجود تھا۔ ہر چہرہ اُس کے لیے نیا تھا۔ "ماں" وہ سسک اُٹھا۔ بہن کا چہرہ اس کی آنکھوں میں آگیا" ماں۔۔۔ سکینہ۔۔۔ کہاں ہو تم؟ وہ رو اُٹھا۔

اچانک ریل چلنے کی وسل بج اُٹھی ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ علی بھی ریل کی طرف دوڑا۔ جب ریل آہستہ آہستہ چلنے لگی تو علی بھاگ کر ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ علی نے جب اپنے حواس پر قابو پایا تو اُس کو ایک طرف سے آواز آئی "ادھر آؤ بیٹا۔ یہاں آؤ" آواز کو سُن کر علی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک بزرگ جن کے چہرے پر مُسکراہٹ تھی۔ اسے بلا رہے تھے۔ علی بے اختیار اُن کی طرف بڑھا اُنھوں نے اُسے گلے سے لگالیا۔

"اکیلے ہو؟ بزرگ نے پوچھا" جی ہاں" علی نے گردن ہلائی اور پھر اُس نے بوڑھے کو اپنی تمام دُکھ بھری کہانی سُنا دی۔ راستے میں علی نے دیکھا کہ کتنے علی یتیم ہو رہے تھے۔ لاکھوں سکینہ اور کئی مائیں نیزوں کی نوک پر آزادی مانگ رہی تھیں۔ علی یہ سب دیکھتا رہا۔ خاموش رہا۔ پھر رات ہو گئی۔

علی بزرگ کی گود میں سو گیا۔ پھر دیر بعد اچانک پانی کے قطرے ٹپا ٹپ علی کے چہرے پر پڑے تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ بزرگ کی آنکھیں اُس کے چہرے پر تھیں۔

"کیا ہوا بابا؟" علی نے گھبرا کر پوچھا" اُٹھو بیٹا پاکستان آگیا۔ اب جاؤ، مبارک ہو، تمہیں یہ آزاد وطن" بزرگ کی آواز میں لرزش تھی" مگر بابا ماں، سکینہ، ابا کہاں ہیں" ؟ "ان کا خون اس دھرتی میں ہے بیٹا" سفید پوش بزرگ نے علی کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ علی اُٹھ بیٹھا۔ ریل گاڑی رُک چکی تھی۔

علی نے مشرق کی طرف سے طلوع ہوتے سورج کو دیکھا۔ اُسے لگا جیسے یہ سورج اُسے آزادی کی نوید دے رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ اس آزادی کی حفاظت کرنا اب تم جیسے جوانوں ہی کا کام ہے۔ کیونکہ یہ آزادی بہت سی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔

میری ڈائری

آپ کی ڈائری کے خوبصورت گوشوں سے انتخاب

۱۴ اگست ۱۹۸۸ء

میں نے یہ بات سب سے کہی مگر کوئی میری بات پر متوجہ نہ ہوا۔ آخر کار زچ ہو کر یہ بات ڈائری میں لکھ رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمیں صرف اپنے زورِ بازو اور خدا پر اعتماد تھا، لیکن آج کے مادہ پرست دور

۵ جنوری ۱۹۸۹ء

میں دکان سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ بارش خوب برسی تھی۔ سڑک پر پانی ہی پانی جمع تھا۔ اُسی وقت میری نظر ایک بوڑھے فقیر پر پڑی۔ جو اپنی لاٹھی کی مدد سے راستہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس فقیر کی مدد کرنی چاہیے۔ لہٰذا میں نے ہمدردی کے جذبے کے تحت فقیر سے پوچھا۔ بابا جی آپ کو کہاں جانا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ بیٹا مجھے اگلی گلی تک جانا ہے تو میں نے اُس بوڑھے فقیر کو وہاں پہنچایا۔ اگر دُنیا میں ایک دوسرے سے ہمدردی کا احساس نہ ہو تو دُنیا جہنم بن جائے۔

؎ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

لیاقت علی۔ ہزارہ۔ کوئٹہ

میں ہم نے خود کو اپنے مرکز سے دُور ہٹا کر تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے، ہم پریشانی کی دلدل میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں؟ اس لیے کہ ہماری آنکھیں بے حیا، دل خائن اور زبان جھوٹی ہو چکی ہے ہم نے مادہ پرست تہذیب کے کھوکھلے پن میں اپنا وقار کھو دیا ہے۔ اگر آج ملّتِ اسلامیہ کی بقا، کا کوئی کلیہ ہے تو وہ اسوۂ حسنہ پر پیروی ہے۔ جس زندگی میں اسوۂ حسنہ کی جھلک ہے وہ زندگی پُر رفعت و پُرعظمت ہے ورنہ موت ہے۔ رجعت ہے۔ بربادی ہے۔ اگر ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں تو کوئی دیر نہیں، جب ہم ترقی یافتہ قوموں کی شاہراہ پر گامزن ہوں گے۔

محمد جہانزیب مغل۔ ملتان

۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء

آج شام کے سوا چھ بج رہے تھے میں اور میری امی ٹی۔وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک ٹی وی پر ایک نعت شروع ہوئی۔ نعت میں پتا نہیں ایسی کون سی بات تھی کہ مجھے رونا آگیا۔ اس نعت کا ایک شعر مجھے

یاد رہ گیا۔ وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے وہ شعر اپنی ڈائری میں لکھ لیا۔ وہ شعر کچھ یوں تھا۔

پہنچنا در پر تو کہنا آقا   سلام لیجیے غلام آیا
جھکاؤ نظریں بچھاؤ پلکیں   ادب کا اعلیٰ مقام آیا

علی احمد۔ پیراں غائب ملتان

۱۲؍اپریل ۱۹۸۷ء

آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ آج میں پاس ہو گئی ہوں۔ نمبر ۲ پر۔ اور یہ بات یاد آگئی۔ محنت وہ سنہری سکہ ہے جس کے ذریعے ہم ہر شے جو ہمارے لیے ضروری ہے حاصل ہو سکتی ہے۔

آمنہ سعید

۸؍اگست ۱۹۸۸ء

آج بڑی دلچسپ بات ہوئی! میں نے اپنی دوست سے کہا۔ میری بہن کا "بی اے" کا رزلٹ آنے والا ہے... میری دوست نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھا! ان کے پاس سائنس ہے یا آرٹس !!؟
؎ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

فرجین تبارک میٹلائٹ کالونی نارتھ ناظم آباد، کراچی ۳۳

۱۸؍جنوری ۱۹۸۹ء

آج جب میں کالج گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری پی ٹی سی کی کلاسیں تاحکمِ ثانی ملتوی کر دی گئی ہیں تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ بوجھل دل کے ساتھ دوست کے پاس گیا اُس کی ڈائری لایا اُس میں لکھا تھا "خوشیوں کا حصول اپنے لیے ہمارے بس میں نہیں، دوسروں کو مسرتیں دینا تو ہمارے اختیار میں ہوتا ہے، پھر زیست کی اُونچی اُونچی راہوں پر مُسکرا کر چل دینا ہی مقصدِ حیات نہیں ہوتا بلکہ کسی کی راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو گلاب کے لالہ زاروں میں بدل دینا ہی زندگی ہے۔ آنسوؤں کو مُسکرا کر پی جائیں اور دوسرے کی اندھیری راتوں کو ضوفشاں کر دیں بالکل چمکتے ستاروں کی مانند۔"

محمد ارشد صابر۔ قادر پور۔ راں۔ ملتان

۲۴؍جنوری ۱۹۸۹ء

ایک رسالے کے مطالعے سے یہ بات میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کی۔
"علم ایک ایسا سمندر ہے جس کے کناروں کا کوئی پتہ نہیں اور اس سے فیض یاب ہونا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔" علم کیا ہے؟ خاطرِ ہستی کا ایسا فیض جام   جس سے ہو جائے گوارا زندگی کا تلخ جام

(سہیل شفیق، سنت نگر، لاہور)

سالگرہ کے ساتھی

ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ گرین گائیڈ ایڈیشن

۔۱۱۳ ڈی ۔ نورس روڈ سائٹ کراچی نمبر ۲۸

ماہِ رواں میں پیدا ہونے والے ساتھی اور ان کا تعارف

خیال رہے اس ماہ سے ہم قلمی دوستی کا سلسلہ ایک نئے انداز سے شروع کر رہے ہیں۔ ہر مہینے ہم اسی ماہ میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف شائع کیا کریں گے۔ امید ہے یہ نیا انداز آپ کو پسند آئے گا۔ ساتھیوں سے یہی کہنا ہے کہ اب وہ اپنا تعارف اس انداز سے بھجوائیں کہ ان کا ماہِ ولادت تعارف میں ضرور موجود ہو۔ یاد رہے کہ تصویر کے ساتھ کوپن کا آنا بہت ضروری ہے۔ وہ بہت سے ساتھی جو پہلے سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن سے بھی گزارش ہے کہ وہ بھی اب اس نئے طریقے کے مطابق شمولیت اختیار کریں۔

محمد اجود حقانی، ہفتم
۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء
کرکٹ مطالعہ، معاشرتی علوم
ڈاکٹر بنیں گے۔
اسعد تموز ایجنٹ ۔ علی پور ۔ ضلع مظفر گڑھ

آصف علی راجہ، ہشتم
۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء
فٹبال کھیلنا، مطالعہ
انگریزی، انجینئر بنیں گے
معرفت نعمت اللہ ولد حاجی غلام رسول کان دار ۔ گوادر ۔ مکران

شیخ حامد علی، دہم
۱۲ اپریل ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی، اردو
فلمی ہیرو بنیں گے۔
ینگ رائٹرز کلب ۔ علی پور ۔ ضلع مظفر گڑھ

محمد یونس خٹک، دہم ۔ یکم اپریل
۱۹۷۳ء ۔ قلمی دوستی
مطالعہ کرنا ۔ بیالوجی
ڈاکٹر بنیں گے۔
گاؤں وڈاکخانہ ستمبر ۔ تحصیل وضلع کرک

وحید اللہ، ششم
۱۴ اپریل ۱۹۷۶ء کرکٹ
کھیلنا ۔ مطالعہ، اسلامیات
ڈاکٹر بنیں گے۔
ڈھکی ڈاگراں ۔ فلیٹ نمبر ۴ ۔ حافظ چیمبرز ۔ پشاور

محمد ارشد، دہم
اپریل
آنکھ مچولی پڑھنا، بیالوجی
انجینئر بنیں گے۔
چک ۱۴/۱۳ کسوال ۔ تحصیل چیچہ وطنی ۔ ضلع ساہیوال

معراج الدین ۔ نہم
۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء
مطالعہ کرنا، مطالعۂ
پاکستان ۔ انجینئر بننے کا ارادہ ہے۔
۹۰ ۔ بی ۔ گلی نمبر ۳ غازی نگر ۔ صدیق وہاب روڈ ۔ کراچی

شیر بہادر درانی ۔ نہم
یکم اپریل ۱۹۷۳ء
کتابوں پر تبصرہ، بائیالوجی
انگریزی ۔ ڈاکٹر بننے کی خواہش ہے۔
خاموش کالونی نزد دلکشا مسجد ۔ میوہ شاہ روڈ بکرا پیڑی کراچی

ایم فاروق اعوان، نہم
۶ اپریل ۱۹۷۳ء
آنکھ مچولی پڑھنا
مطالعۂ پاکستان صحافی بنیں گے۔
نزد دلکشا مسجد ۔ بکرا پیڑی ۔ میوہ شاہ ۔ کراچی

شفیع اللہ۔ ششم
۱۷؍اپریل ۱۹۷۸ء ،
فٹ بال کھیلنا۔ اُردو
ڈاکٹر بنیں گے۔
ڈاکنی ڈگاڈں نصرت خیل۔ تحصیل وضلع کوہاٹ

بتّو بھائی ، ہفتم
۹؍اپریل ۱۹۷۵ء
آنکھ مچولی پڑھنا، اردو
ڈاکٹر بنیں گے۔
الشتاق بک سیلرز۔ تلہ گنگ۔ ضلع چکوال

زین صدیقی۔ ہفتم
۲۱؍اپریل ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، انگریزی
فوجی بننا پسند کریں گے
گورنمنٹ ہائی اسکول۔ شجاع آباد۔ ضلع ملتان

عمران شہزاد ، دہم
۱۲؍اپریل ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، فزکس
انجینیئر بنیں گے۔
میمن بازار شاہ کوٹ۔ شیخوپورہ

فہیم عنایت ، ہفتم
۲۵؍اپریل ۱۹۷۵ء
کہانیاں پڑھنا، حساب
انجینئر بنیں گے۔ بی ۱۸؍ نعمان کمپلیکس
حسن اسکوائر۔ گلشن اقبال۔ کراچی

محمد مبین عرفی ، دھم
۱۰؍اپریل ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی، اسلامیات
انگریزی۔ فوجی افسر بنیں گے۔
۲۸/۱۹۷ عماریاسر سوسائٹی۔ فیز ۲۔ ملیر کالونی۔ کراچی

نواز خورشید۔ دوئم۔
۱۲؍اپریل ۱۹۸۲ء، کھیلنا
پڑھنا۔ اردو۔ انگریزی
ڈاکٹر بننے کا ارادہ ہے۔
۳/۴۶ شیٹ نمبر۱۔ ماڈل کالونی۔ کراچی

غفار حمید ، ہشتم
۱۲؍اپریل ۱۹۷۴ء
کرکٹ، قلمی دوستی، انگریزی
حساب، فوجی بنیں گے۔
۱۵۷؍الفضل ٹاؤن۔ پھلیلی پار۔ حیدرآباد

دین محمد عباسی ، دہم
یکم اپریل ۱۹۷۰ء
قلمی دوستی، اسلامیات
استاد بنیں گے۔
گلی نمبر ۴۔ اورنگ آباد۔ میرپور خاص

اظہر محمود رضا ، ہشتم
۴؍اپریل ۱۹۷۷ء، ٹکٹیں
جمع کرنا۔ مطالعہ۔ عربی
اردو۔ سائنسدان بنیں گے۔
جھیورانوالی۔ براستہ کنجاہ۔ ضلع گجرات

محمد فراز حسین ، نہم
۱۶؍اپریل ۱۹۷۶ء
مطالعہ کرنا۔ حساب
بینک افسر بنیں گے۔ ایف ۱۲/۸ ڈالیا
نیوی کالونی۔ ایس آر ای۔ کارساز۔ کراچی

محمد ارشد رضا عابد ، دہم
۶؍اپریل ۱۹۷۱ء
کرکٹ، قلمی دوستی
اُردو، انجینئر بنیں گے۔
۱۲/۴۔ اے ۵۔ چاندنی چوک۔ پاپوش نگر۔ کراچی

نام   جماعت

تاریخ و سن پیدائش   مشاغل

پسندیدہ مضمون   بڑے ہوکر کیا بننا چاہتے ہیں

پتہ

اُمِّ رمیصاؒ

امّی ابّو کا صفحہ

اکثر ماں باپ اپنے بچّوں کو اس لیے کوستے اور ڈانٹتے نظر آتے ہیں کہ وہ ہر وقت کہانیاں اور رسائل پڑھتے رہتے ہیں... عین ممکن ہے کبھی کبھار آپ بھی اپنے بچّوں کو اسی لیے ڈانٹتے ہوں، لیکن ایک لمحے کو ٹھہریے ہمیں ایک بات بتایے... کیا آپ انہیں رسائل اور کہانیاں پڑھنے پر ڈانٹتے ہیں یا محض اس لیے کہ وہ ہر وقت کہانیاں پڑھتے ہیں اور نصابی کتابوں کے بجائے صرف کہانیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ تب بھی اُنہیں ڈانٹیے نہیں بلکہ اس انداز سے سمجھائیے کہ اُن پر تعلیم کی افادیت و اہمیت ظاہر ہو اور وہ شوق سے پڑھنے لگیں۔

لیکن اگر آپ کا بچّہ نصابی کُتُب اور قصّوں کہانیوں کا مطالعہ ایک اعتدال کے ساتھ کر رہا ہے تو براہِ کرم اُسے ایسا کرنے دیجیے۔ اُس کے ہاتھ سے کہانیوں کی کتاب محض اس لیے نہ چھینیے کہ وہ اسکول کی کتاب نہیں ہے۔

بچّوں کی نفسیات اور ان کی تعلیم و تربیت پر تحقیق کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ کہانی تو بچّے کی بنیادی ضرورت ہے... یہاں تک کہ اگر آپ کا بچّہ ابھی پڑھنے کے قابل نہیں ہوا تو بھی اُسے کہانیاں سنائیے... یہ کہانیاں اُس کی قوّتِ متخیّلہ Imagination کو وسعت عطا کرتی ہیں۔ بچّہ کہانی سُنتا یا پڑھتا ہے تو کہانی کے مناظر فلم کی صورت، اُس کے ذہن کے پردے پر چلنے لگتے ہیں۔ بچّہ کرداروں اور واقعات کی خیالی تصاویر بنانے لگتا ہے اور پھر آہستہ اُسے سوچنا سمجھنا اور چیزوں کا تصوّر کرنا آجاتا ہے... یہ تصوّرات آگے چل کر بڑے تصوّرات کو جنم دیتے ہیں۔ بچپن میں کہانیاں پڑھنے والا بچّہ آگے چل کر شعر و ادب، فلسفہ اور نظریات تخلیق کرتا ہے جس کی بنیاد قوّتِ مُتخیّلہ ہے... دنیا کے جدید ممالک میں تو بچّوں کے لیے بڑے پیمانے پر ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اور اس میں بڑے بڑے ماہرینِ نفسیات، ادارے اور حکومتیں سبھی شامل ہیں، آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اربوں کھربوں ڈالر کے بجٹ محض بچّوں کی کہانیوں کے لیے مختص کیے جاتے ہیں، مگر یہ وہی لوگ کرتے ہیں جو اس کی اہمیت سے واقف ہیں، پھر یہی نہیں بلکہ آپ کا بچّہ، اظہار کے طریقے، الفاظ کا استعمال، جُملوں کی بناوٹ اور لفظوں کے ذخیرے یہ سب کچھ کہانیوں سے بھی سیکھ سکتا ہے۔

اپنے بچّے کو کہانیاں پڑھنے سے نہ روکیے ہاں یہ ضرور دیکھیے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ کہانیوں کے نام پر کوئی خرافات تحریر تو اس کے زیرِ مطالعہ نہیں۔ اس کے لیے اچھے ادب، معیاری رسائل اور بامقصد کہانیوں کا انتخاب تو آپ کا کام ہے...

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذّت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

REGD. NO. M—266 APRIL 1989
MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI